# طالبان کا اصل چہرہ

شخصی استبداد، نسلی استحصال، وسائل کی لوٹ مار،
کرپشن کی بھرمار، عالمی دہشت گردی شعار



سیف اللہ خالد

نام کتاب۔۔۔۔طالبان کا اصل چہرہ

مصنف۔۔۔سیف اللہ خالد

مطبوعہ۔۔۔جون2026

قیمت۔۔۔۔

جملہ حقوق محفوظ ہیں

پاکستان کے ان بیٹوں بیٹیوں کے نام
جو طالبان کی دہشت گردی کا نشانہ بنے

# حسن ترتیب

1۔۔طالبان ملاعمر سے ہیبت اللہ تک ۔۔۔صفحہ 13

مقاصد سے بغاوت

امریکی سی آئی سے تعلقات

بھارت سے یارانہ

2۔۔۔داخلی تقسیم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔صفحہ 65

گروپوں میں اقتدار اختیار کی جنگ

لوٹ مار، کرپشن،

وسائل کی چھینا جھپٹی

بغاوت کی تیاریاں

3۔۔۔مطلق العنان بادشاہت ۔۔۔۔صفحہ 115

آمریت کا سفر قدم بقدم

شریعت کا ذاتی تسلسط کے لئے استعمال

نسلی تعصب، مسلکی استحصال

4۔۔۔۔عالمی دہشت گردی کی آماجگاہ۔۔۔۔صفحہ 149

امت واحدہ پالیسی

القاعدہ کا اقتدار

خطے کے تمام ممالک کے لئے خطرات

ہیبت اللہ کے ای ٹی آئی ایم سے تعلقات

داعش اور جی ڈی آئی کے ابطے

5۔۔۔۔طالبان رااتحاد۔۔۔۔۔۔۔۔صفحہ 173

میر علی معاہدہ، درندوں اتحاد

ٹی ٹی پی طالبان ایک سکے کے دو رخ

قندھار میں را کے اڈے

نیمروز میں بلوچ دہشت اور ایران دشمن اتحاد کی موجودگی

وسط ایشیا کے لئے خطرے کی گھنٹی

6۔۔۔۔طالبان دنیا کی نظر میں۔۔۔۔صفحہ 197

عالمی اداروں کی رپورٹس

طالبان کا اصل چہرہ

---

# بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خون جگر ہونے تک

افغانستان سے میرا تعلق، لڑکپن کے پہلے عشق جیسا ہے۔

کابل وقندھار کی اس مقدس سرزمین پر ہمارے خوابوں کی کرچیاں بکھری پڑی ہیں

ہمجولیوں کے قہقہے اب بھی فضا میں گونجتے ہیں، دلداروں کی وفا اور ان کی قبریں ایک ساتھ کھڑی ہیں

جو یہاں سے ہمارے ساتھ گئے تھے مگر کبھی لوٹ کر نہ آئے.....

آج بھی کبھی خلوت کی شب میسر اجائے تو وقت کا پہیہ تھم سا جاتا ہے، زمانہ پلٹ جاتا ہے، یادوں کا اک جہاں آباد ہو جاتا ہے۔ کچھ اداسیاں، کچھ قہقہے، گولیوں کی تڑتڑاہٹ، اور بچھڑنے والوں کی یاد میں برستی آنکھیں... .....وہ ایک ایک پتھر، وہ پگڈنڈیاں، وہ سنگلاخ چٹانیں، پھولوں سے لدی وادیاں، روح تک اتر جانے والی جھرنوں کی گنگناہٹ۔۔۔۔

مورچوں کی اداس تنہائی، دشمن کے اچانک حملوں پر پھیلتی افراتفری میں بھی ایک دوسرے کی جان بچانے کی فکر ..... گولیوں کے باڑ کے مقابل سینہ تان کر کھڑے ہو جانے والے گھبرو..... کیا کچھ نہیں یاد آتا!

زندگی میں نامعلوم کتنی بار میں اس سرزمین پر گیا، وہ میرے لیے محض ایک ملک نہیں، میرا رومانس ہے میری روح کا حصہ ہے۔

ہم نے اس کے لیے جنگیں لڑیں، لہو بہایا، جانیں قربان کیں۔۔۔۔

سولہ برس کی عمر، گلی ڈنڈا اور کنچے کھیلنے کی عمر میں بندوق اٹھائی۔۔۔اپنے لیے نہیں، افغان سرزمین کی خاطر۔۔۔۔۔

پاک سرزمین پر لٹے پٹے چاند سے چہرے دیکھے تو انتقام لینے گھر سے نکل پڑے۔

پرعزم پیشانیوں والے سفید ریش بہادر نظر آئے۔ جلال الدین حقانی جیسے بلند حوصلہ و بلند قامت شیر، مولوی یونس خالص جیسے شب زندہ دار، نبی محمدی جیسے اکل کھرے انسان، گلبدین جیسے حکمت کار، اور احمد شاہ مسعود جیسے بے مثل منصوبہ ساز۔

مگر افسوس، یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا۔

ہم پھر بے کل ہوئے، بھاگے، دوڑے۔۔۔۔داڑھیوں کو چوما، گھٹنوں کو چھوا۔۔۔۔سماجت کی۔۔ واسطے دیئے، شہیدوں کی یاد دلائی۔۔امن کی بھیک مانگی۔۔۔۔مگر وائے یاس، وائے حسرتا!

لہو کے بدلے خریدی گئی فتح کو مٹی میں ملانے سے باز نہ آئے۔ دل کا خون ہوا، خوابوں کی کرچیاں بکھر گئیں۔ میرے وطن کی مائیں جن کے جگر گوشے ہمارے ساتھ نکلے تھے پر واپس نہ لوٹ سکے، وہ دل گرفتہ ہو کر پوچھتیں: ''میرا لعل اس مقصد کے لیے مٹی میں ملا دیا؟''

تو انکھیں جھک جاتیں، دل دھڑکنا بھول جاتے..... یہ تو خسارہ ہے، نرا خسارہ۔

پھر قندھار سے ایک نعرہ گونجا۔۔۔امن، آزادی اور شریعت کا نعرہ

ماتھے پر محراب، زبان پر اللہ کا کلام..... اعتبار کی کرن پھوٹی، دل کو قرار ملا، روتی ماؤں کو دلاسا دیا خوابوں کی کرچیاں سمیٹیں اور کہا کہ نہیں، ہم ناکام نہیں ہوئے..... ہماری جدوجہد رائیگاں نہیں گئی۔

یہ ہیں نہ اگلے وقتوں کے مسلمانوں جیسے

حضرت عمر بن خطابؓ کے سچے پیروکار.....

وہ وقت بھی گزر گیا۔امن کا مختصر سا عرصہ..... اک خواب جیسا..... جیسے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا۔۔۔تپتی دھوپ میں سایہ.....

میدان پھر سجا، گولی چلی، مورچے آباد ہوئے، کراچی سے پشاور تک کئی ماؤں کی گود اجڑی

جوانوں کے نئے لشکر اسی راہ پر پھر چل پڑے جہاں سے کبھی ہم بھی گزرے تھے۔

ہم جو جوانی کی دہلیز پار کر کے بڑھاپے کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔۔۔۔

پھر سے مستعد ہو گئے۔ بندوق نہ سہی لیکن قلم تو تھا..... اسی کو ہتھیار بنایا۔ پہاڑوں کے دامن میں مورچے نہ سہی، اخبار کے صفحات تو تھے.....

یہ ہماری جنگ تھی سو ہم نے لڑنی ہی تھی!

بہادروں کے لئے داد و تحسین کے نغمے لکھے، دشمن کے لشکروں کو بے نقاب کیا۔۔۔۔

ستائش کی تمنا تھی نہ سراہے جانے کی خواہش۔

یہ بھی جہاد کا میدان تھا سو ہم لڑے نقصان اٹھایا..... کبھی روزگار سے ہاتھ دھونا پڑے، الزامات سہے، طعنے برداشت کئے، ترقی کے راستے روکے گئے، ساتھی آگے بڑھ گئے، ہم وہیں رہ گئے بلکہ شائد پیچھے سرک گئے، لیکن ملال نہیں ہوا کہ ہم نے جہاد کیا تھا.....

کسی نے بیوقوف کہا، کوئی منہ پھیر کر نکل گیا، لیکن ہم ڈٹے رہے۔۔۔

اپنے بچوں کو وہ سب نہ دے سکے جو ان کا جائز حق تھا۔ بچوں کی جانیں تک خطرے میں ڈالیں۔۔۔۔

مگر دل میں اطمینان تھا کہ ہم جہاد کر رہے ہیں، اللہ کے حکم کی تعمیل۔

جب جب موقع ملا قلم کے ساتھ، عمل کے جہاد میں بھی کردار ادا کیا۔

پھر کچھ درندے، مومنوں کا روپ دھارے پہاڑوں سے اترے۔

دہشت گردی کی آگ میرے دامن کو جھلسانے لگی۔ گھروں میں بیٹھے معصوم بچے، مکتب میں پڑھتے طلبہ، مساجد و مدارس میں اللہ کا پیغام سناتے علماء، ڈیوٹی پر ڈٹے فوجی جوان اور پولیس اہلکار نشانہ بنے

.....

کوئی بھی محفوظ نہ رہا۔

ماؤں نے پھر سوال اٹھایا: ہمارے بچے ان درندوں کے لیے جان ہار گئے؟

تسلی دی، نہیں یہ وہ نہیں۔ وہ تو پارسا ہیں، عمر ثالث کے سچے وارث ۔ یہ ان کے دشمن ہیں، ان کے بہروپ میں ہیں، لیکن بھیس بدل کر شیطان کے چیلے.....

جنگ کے بادل چھٹے تو یقین کا چراغ بجھ گیا۔ معلوم ہوا جو دیکھا تھا، وہ خواب نہیں سراب تھا، حقیقت نہیں دھوکہ تھا، گمان غلط اور امیدیں باطل ثابت ہوئیں۔ اتنا بڑا دھوکہ؟؟؟؟؟

یہ کون ہیں؟ یہ تو اپنے تھے، درندوں کے ہم نوا کیسے ہو گئے؟ شائد کوئی غلط فہمی ہوئی شائد کوئی کج فہمی ہے،

حقیقت کی تلاش میں پھر رخت سفر باندھا۔ کابل وقندھار کی گلیاں، میرے بچپن کا رومانس، یاروں کی قبریں، یادوں کے مزار۔۔ایک بار پھر کھوج میں نکل پڑا۔ مایوسی، شرمندگی اور گہرا پچھتاوا۔ ہمارا اعتماد لٹ گیا، اعتبار خاک میں مل گیا۔ وہ جو گزشتہ زمانوں کے مسلمانوں جیسے لگتے تھے، وہ کہیں نہ ملے۔ اکثریت تو اپنے رب سے کیا گیا عہد پورا کر کے اس دار فانی سے کوچ کر چکی۔۔۔جو پیچھے رہے، وہ کچرا نکال.... دھوکہ، خالص دھوکہ قابوں کے نشیمن پر زاغوں کا تصرف..... دل بجھ گیا، عقل دنگ رہ گئی۔ اتنا بڑا دھوکہ! ہمارا سب کچھ لٹ گیا۔ نصف صدی قبل کے وہ خواب، امیدیں۔۔۔کچھ بھی تو نہ بچا۔ ایک پوری عمر کی کمائی لٹ گئی..... پوری ایک نسل اس سراب کے تعاقب میں کھیت رہی.....

اب کیا کریں؟

بیٹھ کر سیاپا کریں؟ نوحہ لکھیں؟ بین ڈالیں؟ یا سر پر راکھ ڈال لیں؟.....

نہیں، ان میں سے کوئی بھی راستہ ہمارا نہیں۔

سولہ برس کی عمر میں خواب دیکھے تھے، بندوق اٹھائی تھی، جان ہتھیلی پہ لے کر نکلے تھے، جہاد کی صدا پر لبیک کہا تھا۔ رب سے کیا گیا یہ عہد کیسے چھوڑ دیں؟ کیسے بھول جائیں؟

ہماری شناخت مجاہد کی تھی، اب موت پچھتاوے اور بزدلی کی؟ کیسے مان لیں۔۔نہیں، کسی قیمت پر

قبول نہیں۔

اب پھر... نئے عزم سے، نئے میدان میں اسی جہاد کا نعرہ بلند کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، پھر سے لڑیں گے،

پہلی بار ان سے لڑے جو ہمارے خوابوں کی سرزمین پر قبضہ کرنے آئے تھے، اپنی تہذیب اور لادینیت کے زور پر۔

پھر قلم کو بندوق بنا کر ان کے خالف لڑے جو شریعت کے قانون کو روندنے آئے تھے، آزادی پر شب خون مارنے آئے تھے..... اور اب عمر کے اخری حصے میں ایک نئی جنگ درپیش ہے۔

ان کے خلاف جو ہمارے خوابوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں، جو شریعت کا نام لے کر شریعت کے باغی ہیں، جو امن کو چھیننے نکلے ہیں، جو میرے بچوں کو مارنا چاہتے ہیں۔

وسائل اس وقت تھے نہ اب ہیں..... بے بس نہ اس وقت تھے، نہ اب ہیں۔

زندگی اگر ایک جنگ ہے تو پھر پسپائی کیسی؟ نصف صدی قبل ایک عفریت کے خلاف سینہ تان کر کھڑے ہوئے تھے، آج ایک اور عفریت کا سامنا ہے تو ڈر کیسا؟

ہم کل بھی امن کے لیے لڑے تھے، آج بھی صرف امن ترجیح ہے۔ کل بھی رب کا حکم مانا تھا، آج بھی اسی کے حکم کی پیروی کر رہے ہیں۔

نہتے ہم نہیں، بندوقیں بھی بہت ہیں اور سینے بھی بہت ۔۔۔ مگر بندوق ان کے ہاتھ میں بھلی جو میرے وطن کے رکھوالے ہیں، قلم میرا ہتھیار ہے۔۔۔۔۔۔ میرے رب کی عطا۔

معاش کی فکر نہ اس وقت تھی، نہ اب ہے۔ جہاد شروع کیا تھا، جہاد کر رہے ہیں۔

ہاں، تسلیم ہے کہ کابل و قندھار کی سرزمین میرا رومانس ہے، میری سانسوں میں بسی ہوئی ہے،

جنرل ضیاء الحق شہید نے راجیو گاندھی سے فرمایا تھا: ''کلکتہ اور دہلی سے ہمیں محبت ہے، ہمارے بزرگوں کی ہڈیاں وہاں دفن ہیں، ہماری تہذیب وہاں سانس لیتی ہے، لیکن اگر میرے اسلام آباد اور لاہور کو خطرہ ہوا، پاکستان پر آنچ آنے کا اندیشہ بھی ہوا تو کلکتہ و دہلی کو راکھ بنا دوں گا۔''

تسلیم کہ کابل وقندھار عشق ہے، رومانس ہے، مگر جان تو نہیں؛

نصف صدی کی گواہی میرے سینے میں ہے۔ اب گواہی کا وقت ایا ہے تو انشاءاللہ ڈنکے کی چوٹ پر گواہی دی جائے گی۔

سچ کو جھوٹ سے، کھرے کو کھوٹے سے الگ کرنے کا جہاد

میرے رب نے مقدر کیا ہے تو یقینا پوری قوت سے لڑیں گے۔

نفع ونقصان پہلے سوچا تھا، نہ اب اس کا خیال ہے۔ انشااللہ

واللہ المستعان علی ما تصفون

سیف اللہ خالد

# باب اول

## ملا عمر سے ہیبت اللہ تک

افغانستان کی جدید تاریخ میں طالبان کا ظہور ایک ایسا لمحہ تھا جس نے نہ صرف اس ملک بلکہ پورے خطے کی سیاست کو بدل کر رکھ دیا۔ یہ تحریک کسی لمبی چوڑی پلاننگ یا سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وجود میں نہیں آئی بلکہ اسے وقت کی ضرروت نے وجود عطا کیا، جسے افغان قوم اور پڑوسیوں خصوصاً پاکستان کے لئے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ طالبان دراصل افغان جہاد کے نتیجے میں سوویت یونین کے افغانستان سے انخلاء کے بعد شروع ہونے والی خانہ جنگی، لوٹ مار، انارکی اور مایوسی کا ایک قدرتی ردعمل تھا، جو مقامی قبائل اور مدارس کے اساتذہ اور طلباء کی جانب سے سامنے آیا۔ اس تحریک نے ابتدائی طور پر امن اور امان کے قیام کو ترجیح دی جس نے لوگوں کے دل جیتے انہیں ان نوجوانوں کی شکل میں ایک پرامن اور باوقار معاشرے کی امید نظر آئی، اسی عوامی پذیرائی کے سبب یہ تحریک دیکھتے ہی دیکھتے افغانستان کی طاقتور سیاسی وعسکری قوت بن گئی۔ معاملہ صرف افغانستان تک ہی محدود نہیں تھا، بلکہ اپنی سرحدوں پر بدامنی اور انتشار کو

پاکستان بھی اپنے مفادات کے لئے بھی ایک بڑا خطرہ سمجھتا تھا، جو براہ راست داخلی سلامتی کے لئے چیلنج تھا، اس کی وجہ سے خطے میں پاکستان کی پوزیشن متاثر ہورہی تھی، مہاجرین کے نئے قافلے پاکستان میں داخل ہورہے تھے۔ وسط ایشیاء کے ساتھ رابطے متاثر ہورہے تھے۔ پاکستان نے بھی افغان معاشرے کے اس ردعمل کو قبول کیا، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ معاشرے کا اپنا ردعمل تھا، پس منظر میں کوئی عالمی طاقت اور کسی کے مفادات نہیں تھے۔ دوسری وجہ یہ رہی کہ ان لوگوں نے پاکستان کے لئے نرم گوشہ دکھایا ،لہٰذا پاکستان کے لئے بھی انہیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا، پاکستان نے بھی اپنے مفادات کو دیکھتے ہوئے، اس گروپ سے امن اور استحکام کی امیدیں وابستہ کیں، جو اس دور کی زمینی حقیقت تھی۔ طالبان کے نام سے اٹھنے والے اس گروپ کا اپنا رویہ بھی پاکستان کے حوالہ سے معاندانہ نہیں بلکہ دوستانہ تھا، پہلا رابطہ اس طرح سے قائم ہوا کہ پاکستان کا ایک امدادی قافلہ چمن کے راستے وسط ایشیا کی جانب روانہ ہوا، جسے سپین بولدک کے علاقے میں ایک مقامی وار لارڈ نے روک لیا۔ قافلے کے ساتھ موجود ایک افسر جو جہادِ افغانستان میں کردار ادا کر چکا تھا، مدد کے لیے قریبی گاؤں کے ایک مدرسے میں چلا گیا۔ اس مدرسے کے طلبہ اپنے استاد ملا محمد عمر مجاہد کی قیادت میں سامنے آئے، وار لارڈ کو بھگا کر راستہ کلیئر کر دیا۔ اس واقعہ نے ایک جانب علاقے میں ان لوگوں کی دھاک بٹھا دی، دوسری جانب انہیں ایک سوچ دے دی کہ سوویت یونین کے خلاف جہاد کے ثمرات کو ضائع ہونے سے بچانے کی خاطر کردار ادا کرنا چاہئے۔

اس دور میں سابق مجاہدین اور وار لارڈز جس قسم کے گھناؤنے کام کر رہے تھے، افغان شہریوں کو جس طرح سے ظلم و جور کا نشانہ بنا رہے تھے، وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والے حقائق تھے۔ کسی کی عزت محفوظ تھی، نہ مال و دولت، گھروں سے لوگوں کو اٹھا لینا، سڑکوں کی ناکہ بندی کرنا، باپ، بھائی اور شوہر کے سامنے خواتین کا اغوا، حد تو یہ کہ نوعمر لڑکوں کا اغوا اور زیادتی معمول بن چکی تھی۔ ایسے میں ایک گروہ جوان سب کے خلاف سینہ سپر ہو جائے، ان کا اپنا اخلاق اور کردار بھی شاندار ہو، اسے پذیرائی ملنا یقینی تھا، سو سرحد کے دونوں جانب یہ پذیرائی ملی۔ عوامی حمائت ملنے پر ان طلبہ کا حوصلہ بڑھا، انہوں نے قدم آگے بڑھائے، اپنے علاقے کو جرائم سے پاک کرنا شروع کر دیا اور مختصر سے عرصے میں قندھار چمن شاہراہ کو ہر قسم کی آمد و رفت کے لیے کھول دیا گیا۔

ابتدا میں ان کا مقصد صرف راستوں کو کھولنا اور وار لارڈز کے مظالم کو روکنا تھا، لیکن عوامی حمایت ملنے پر

امن قائم کرنے کا دائرہ بڑھنا شروع ہوا۔ پہلے سپین بولدک، پھر پورا قندھار اور اس کے بعد پورے ملک سے انہیں قیامِ امن اور وار لارڈز کے خلاف کارروائی کے لیے دعوت ملنا شروع ہوگئی۔ انہوں نے بھی امن سے آگے بڑھ کر معاشرتی برائیوں اور ناانصافیوں کا سدباب کرنا شروع کیا، جس نے ان کی مقبولیت کو بڑھا دیا۔ انہیں کام کرتا دیکھ کر بدامنی اور خانہ جنگی کے خوف سے گھروں میں بیٹھ رہنے والے سابق مجاہدین بھی اٹھے اور ان کے ساتھ شامل ہوتے گئے، افغان مہاجرین کے کیمپوں اور سرحد کے آر پار دینی مدارس کے طلبہ اور اساتذہ نے بھی انہیں پذیرائی بخشی اور جوق در جوق اس نئے گروپ کا حصہ بننا شروع ہو گئے، جہاں کوئی چھوٹا بڑا نہیں تھا، کوئی تنظیمی بندشیں اور سیٹ اپ بھی نہیں تھا، صرف عوامی حمائت، سادگی اور دین داری ہی ان کا کل اثاثہ تھا۔

ہم ان دنوں کابل میں تھے، جب قندھار سے کسی نئے گروپ کے ابھرنے کی اطلاعات تسلسل سے آنا شروع ہوئیں، نامور جہادیوں کے رویوں نے مایوس کر رکھا تھا، جو دنیا کی ایک سپر طاقت سوویت یونین کو شکست دینے میں تو کامیاب رہے لیکن اپنی ہوس اقتدار، ضد اور انا کے ہاتھوں مات کھا گئے، اخلاقی پستی کا عالم یہ تھا کہ پاکستان نے بڑی تگ ودو کے ساتھ ان سب کو اکٹھا بٹھایا، امن پر آمادہ کیا، ایک صلح نامہ تیا رہوا عبوری حکومت کا ڈھانچہ تشکیل دیا گیا، تمام لیڈر باہم شیر وشکر مکہ پہنچے جہاں بیت اللہ کے سائے میں افغان امن معاہدہ پر دستخط کئے گئے، لیکن واپس پہنچتے ہی دونوں جانب سے ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے ہوئے کابل پر قبضے کی جنگ چھیڑ دی گئی۔ اسی پس منظر میں ہم کابل میں تھے اور ماضی کے ان مجاہدین کی قتل وغارت، ہوسِ اقتدار اور برادر کشی کو براہِ راست دیکھ رہے تھے۔ فریقین کو بات چیت اور امن پر قائل کرنا ہمارا مقصد تھا، جس میں ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا، ہر صبح امن کی نئی امید کے ساتھ ہمت باندھتے، اور ہر غروب ہوتا ہوا سورج ہماری ناکامیوں کی داستاں سنا رہا ہوتا تھا۔

صورتحال یہ تھی کہ شمالی اتحاد شہر پر قابض تھا، ایوانِ صدر میں استاد برہان الدین ربانی موجود تھے اور وزیرِ دفاع احمد شاہ مسعود تھے، لیکن وہ حسبِ سابق پنجشیر سے نکلنے پر تیار نہ تھے، جبکہ شہر کا دفاع انہی کی فورسز کر رہی تھیں۔ دوسری طرف اقتدار کی تقسیم کے فارمولے میں وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ حاصل کرنے والی حزبِ اسلامی نے گلبدین حکمت یار کی قیادت میں شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا، جس میں انہیں اپنے بعض نئے پرانے اتحادیوں کی مدد بھی حاصل تھی۔ حکمت یار نے خود چار آسیاب میں ہیڈ کوارٹر قائم کر رکھا تھا۔ روزانہ

شہر پر گولہ باری ہوتی، راکٹ برسائے جاتے اور جواب میں ادھر سے بھی فائرنگ کی جاتی۔ دونوں طرف عام آدمی مارے جاتے، خون بہتا، لاشیں اٹھائی جاتیں، کوچہ و بازار تباہی کا منظر پیش کرتے، مگر اقتدار اور طاقت کی ہوس ایسی تھی کہ سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔ ہم نے انسانیت کی جو تذلیل اور انسانی جان کی جو ناقدری اس وقت دیکھی اسے بھولنا ممکن نہیں۔ وہ عام آدمی جس کا اس پوری جنگ سے کوئی لینا دینا ہی نہ تھا، صبح شام مر رہا تھا، کوچہ و بازار میں خون بہتا تھا، سڑکوں پر لاشیں گرتی تھیں کابل شہر میں ٹینک ٹیکسیوں کی طرح بھاگتے اور اپنے ہی شہریوں کو روندتے دیکھے۔

صرف کابل ہی اس صورتِ حال سے دوچار نہ تھا بلکہ پورا ملک اسی طرح کے حالات کا شکار تھا۔ شمال میں بلخ اور بدخشاں عبدالرشید دوستم اور مالک پہلوان کے استبدادی پنجے میں تھے۔ دیگر علاقوں میں احمد شاہ مسعود کی شورائے نظار کا سکہ چلتا تھا۔ خوست میں جلال الدین حقانی حکمران تھے۔ ننگرہار یعنی جلال آباد میں حاجی عبدالقدیر اپنے ذاتی اثر ورسوخ کے بل بوتے پر پورے ملک میں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی جہادی جماعتوں کے مقامی کمانڈروں کی شوریٰ بنا کر اپنا اقتدار قائم کئے ہوئے تھے، پشتون بیلٹ کے کئی علاقوں پر مولوی محمد نبی کی حکومت اور بعض جگہوں پر مولوی یونس خالص کی فورسز قابض تھیں، البتہ یہی دو رہنما تھے جو اقتدار کی جنگ میں شریک نہیں تھے۔ امن کی ہر کوشش میں ساتھ دیتے، یہاں تک کہ اپنے علاقے چھوڑنے پر بھی تیار تھے۔ جب بھی ان سے امن کے لئے بات ہوئی، ان دنوں کو ہمیشہ تیار پایا، اسی سبب انہی کے صوبوں میں نسبتاً امن بھی تھا۔

مجموعی صورتحال یہ تھی کہ ہر صوبہ اور ہر شہر مختلف گروہوں کے کنٹرول میں تھا، جس کی قیمت عوام ادا کر رہے تھے، جیسے آج کے افغانستان شہری ادا کر رہے ہیں۔ ملک بھر میں قدم قدم پر چیک پوسٹوں، بھتہ خوری، بدامنی اور قتل و غارت سے تنگ لوگوں کے لیے قندھار سے اٹھنے والے یہ نوجوان امید کی کرن، امن کا استعارہ اور زندگی کا پیغام بن کر سامنے آئے۔ عوامی سطح پر ان کی سب سے بڑی خوبی یہ سمجھی گئی کہ ان کا کسی جماعت سے تعلق نہیں تھا۔ یہ مدارس کے سادہ طالب علم تھے، اسی نسبت سے ''طالبان'' کہلائے۔ جب انہوں نے لوٹ مار کرنے والے گروہوں کا خاتمہ کیا تو مقامی آبادی نے انہیں ایک منظم اور نظم وضبط رکھنے والی قوت کے طور پر قبول کیا بلکہ ہاتھوں ہاتھ لیا، اور یوں لوگ ملتے گئے قافلہ بڑھتا گیا والی کیفیت ہوگئی اور ابتدا میں ملا عمر کے چند شاگردوں سے شروع ہونے والا یہ چھوٹا سا گروہ ایک منظم لشکر بن گیا جس

نے اکتوبر 1994 میں قندھار پر قبضہ کر کے نہ صرف خطے کے ہر کھلاڑی کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا بلکہ افغانستان کے اقتدار اور خطے کے استحکام کی جنگ میں ایک اہم فریق کے طور پر قدم رکھ دیا۔

اس وقت تک جہادی دھڑوں میں سے کوئی بڑا نام ان کے ساتھ شامل نہیں ہوا تھا۔ اصل قوت انہیں اس وقت ملی جب خانہ جنگی سے تنگ بڑے گروپ، جیسے جلال الدین حقانی، مولوی محمد نبی اور مولوی یونس خالص بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور انہوں نے ملا عمر کی بیعت کر لی۔ اس سے طالبان کی افرادی قوت اور اسلحے میں اضافہ ہوا اور انہیں بغیر لڑائی کے ہلمند، پکتیا، پکتیکا اور خوست سمیت وہ تمام صوبے مل گئے جہاں حقانی، نبی محمدی اور یونس خالص کی حکومت قائم تھی۔ ملا عمر نے آگے بڑھنے سے پہلے ان علاقوں میں امن قائم کیا۔ ان کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ عوام سے اسلحہ لے لیا جائے، فوری انصاف کے لیے قاضی مقرر کیے جائیں اور لوگوں کی دادرسی کا نظام قائم کیا جائے۔ اس سے طالبان پر اعتماد بڑھا۔ صرف دو سال بعد، ستمبر 1996 میں طالبان ایک بڑے لشکر کی صورت میں پاکستانی سرحد سے ملحق علاقوں کو فتح کرتے ہوئے ننگرہار سے گزر کر کابل کی جانب بڑھے۔ برسوں سے ایک دوسرے کا خون بہانے والی تنظیمیں ایک دن بھی مقابل نہ ٹھہر سکیں۔ حکمت یار بغیر لڑے علاقہ چھوڑ کر ایران چلے گئے۔ احمد شاہ مسعود کی فورسز نے مزاحمت کی لیکن زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں اور 25 ستمبر کو کابل بھی طالبان کے زیرِ نگیں آ گیا۔ احمد شاہ مسعود پنجشیر میں جبکہ عبدالرشید دوستم شمال میں جا چھپے۔ دونوں نے مل کر شمال میں مزاحمت کو منظم کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شمال پر قبضہ طالبان کی ایک نا آسودہ خواہش بن کر رہ گیا۔ یہی ان کے زوال کا آغاز بھی ثابت ہوا، شمالی اتحاد امریکہ کی مدد سے دوبارہ کابل پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

## ملا عمر اور موجودہ نظام کا موازنہ:

طالبان کی حکومت کیسے اور کیوں ختم ہوئی، یہ تاریخ کا حصہ ہے اور اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ تاہم یہاں مقصد اس پوری بحث کو دہرانا نہیں بلکہ ملا عمر کے دور اور موجودہ قیادت کے درمیان بنیادی فرق کو سمجھنا ہے، تاکہ واضح ہو سکے کہ جو تحریک کبھی امن کی علامت سمجھی جاتی تھی، وہ آج بدامنی اور انتشار کی علامت کیوں بن چکی ہے۔

## دین داری اور سادگی:

یہ ملا عمر کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی دین داری اور سادگی تھی۔ انہوں نے ہیبت اللہ کی طرح اپنے لیے کسی محل یا شاہانہ رہائش کا بندوبست نہیں کیا تھا۔ نہ کوئی پروٹوکول تھا، نہ بڑا حفاظتی حصار۔ وہ قندھار کے ایک سادہ گھر میں رہتے، ایک جھونپڑی کو دفتر کے طور پر استعمال کرتے اور ہمیشہ عوام کے درمیان رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ 1998 میں قندھار میں ان سے ملاقات کا موقع ملا۔ وہ ایک بڑی مسجد، جسے نبوی مسجد کہا جاتا تھا، میں جمعہ کا خطبہ دیتے تھے۔ اس کے بعد اپنی جھونپڑی میں بیٹھ کر صبح سے شام تک لوگوں کے مسائل سنتے اور حکومتی احکامات جاری کرتے۔ ہم ان سے پہلے مسجد میں تھے، وہ آئے اور منبر تک پہنچے، علم بھی نہ ہوا، خطبہ جمعہ کے بعد ویسے ہی ایک عام آدمی کی طرح پلاسٹک کی سوفٹی پہنے اپنے جھونپڑے کو چل دیئے، ہم بھی پوری سہولت کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے چلتے ان کے جھونپڑے میں جا پہنچے جہاں اور بھی لوگ موجود تھے، کسی نے کوئی سوال کیا، نہ روکا۔ یہ معاملہ صرف ملا عمر تک محدود نہیں تھا چونکہ وہ خود دیانت دار تھے، اس لیے ان کی پوری ٹیم بھی اسی طرز پر سادہ، متوکل اور نسبتاً دیانت دار تھی۔ قندھار کے گورنر ملا حسن رحمانی کی مثال سامنے ہے۔ گورنر ہاؤس میں مہمانوں کے لیے اچھا کھانا تیار ہوتا، لیکن وہ اپنے گھر سے لائی ہوئی پوٹلی کھولتے جس میں افغان روٹی کا ٹکڑا، کبھی پیاز اور کبھی اچار ہوتا۔ ان کا مؤقف تھا کہ چونکہ وہ تنخواہ لیتے ہیں، اس لیے بیت المال کے کھانے سے ذاتی طور پر فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ اکثر ذمہ داران اسی احساسِ جواب دہی سے سرشار تھے۔ گورنروں اور وزراء کو ملازمین کی سہولت حاصل نہیں تھی، وہ پانچ وقت نماز مسجد میں پڑھنے کے پابند تھے اور اسکے ساتھ ساتھ اپنا سودا سلف بھی خود خریدنے بازاروں میں دھکے کھاتے، جس سے انہیں لوگوں کے مسائل کا علم ہوتا رہا اور لوگ ابھی ان پر اعتبار کرتے تھے۔

## الزامات اور طرز حکمرانی:

ملا عمر کے طرزِ حکمرانی اور موجودہ طالبان قیادت کے درمیان فرق صرف انتظامی یا سیاسی نوعیت کا نہیں بلکہ فکری، اخلاقی، معاشرتی اور نفسیاتی سطح پر بھی نہایت گہرا اور غیر معمولی ہے۔ طالبان کے موجودہ نظام پر سب سے بڑا اعتراض یہی کیا جاتا ہے کہ اس نے اُن اصولوں، نعروں اور دعووں سے انحراف کیا ہے جنہیں

کبھی یہ تحریک اپنی اخلاقی برتری اور عوامی مقبولیت کی بنیاد قرار دیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج نہ صرف عام افغان شہریوں میں مایوسی بڑھ رہی ہے بلکہ خود طالبان کے اندر بھی خاموش اضطراب، بے اعتمادی اور اندرونی تقسیم محسوس کی جاسکتی ہے۔

طالبان کی پہلی حکومت کے دوران ملا عمر کی شخصیت کو ایک ایسے رہنما کے طور پر پیش کیا جاتا تھا جو ذاتی مفادات سے بالاتر، سادہ طرزِ زندگی کا حامل اور اقتدار کی ظاہری چمک دمک سے دور تھا۔ اس وقت طالبان کے اندر عمومی تاثر یہی تھا کہ قیادت اور کارکن ایک ہی صف میں کھڑے ہیں۔ امیر، وزیر، گورنر یا عام سپاہی کے درمیان ظاہری فرق کم دکھائی دیتا تھا۔ یہی چیز طالبان کی اُس وقت کی طاقت بھی تھی کیونکہ جنگوں سے تباہ حال افغانستان میں لوگ ایک ایسے نظام کی تلاش میں تھے جو کم از کم بدعنوانی، لاقانونیت اور مقامی کمانڈروں کے ظلم سے نجات دلا سکے۔ اس کے برعکس آج طالبان حکومت کے بارے میں یہ تاثر تیزی سے مضبوط ہو رہا ہے کہ اقتدار محدود حلقوں میں سمٹ چکا ہے اور تحریک رفتہ رفتہ ایک ایسے بند نظام میں تبدیل ہو رہی ہے جہاں رسائی، اختیارات اور وسائل فردِ واحد کے ہاتھ میں محدود ہو چکے ہیں۔ سب سے زیادہ تنقید حکمران قندھار گروپ پر کی جاتی ہے جسے آج طالبان اقتدار کا اصل مرکز سمجھا جاتا ہے۔

خرابی اس حد تک پھیل چکی ہے کہ صرف نچلی قیادت ہی نہیں بلکہ خود ملا ہیبت اللہ اخوندزادہ پر بھی مالی بے ضابطگیوں اور اختیارات کے ناجائز استعمال کے الزامات لگائے جاتے ہیں۔ ان پر الزام ہے کہ اقتدار سنبھالتے ہی انہوں نے قندھار کے پوش علاقے عینو مینا میں مقتول پولیس چیف جنرل عبدالرازق اچکزئی کے گیسٹ ہاؤس اور رہائش گاہ پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں اسی علاقے میں ان کے بھائی دین محمد اچکزئی کی جائیداد بھی اپنے قبضے میں لے لی گئی۔ عینو مینا قندھار کا سب سے مہنگا اور محفوظ علاقہ سمجھا جاتا ہے جہاں افغانستان کی اشرافیہ، کاروباری شخصیات اور طاقتور قبائلی خاندان رہائش رکھتے رہے ہیں۔ وہاں ایک رہائشی یونٹ کی قیمت لاکھوں ڈالر تک بتائی جاتی ہے۔ خود ملا ہیبت اللہ کے قبضہ کردہ جائدادوں میں سے صرف ایک رہائشی یونٹ کی مالیت تقریباً پندرہ لاکھ ڈالر، یعنی لگ بھگ بیالیس کروڑ پاکستانی روپے یا دس کروڑ افغانی بتائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اقتدار کے مرکز پر بیٹھے افراد پر اس نوعیت کے الزامات سامنے آئیں تو پھر نچلی سطح پر احتساب، دیانت داری اور قانون کی بالادستی کا تصور خود بخود کمزور پڑ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج قندھار کے اسی علاقے میں طالبان حکومت کے درجنوں اعلیٰ

عہدیداروں کی جائیدادوں کا چرچا عام ہے۔بعض جائیدادیں خریدی گئیں جبکہ متعدد پر قبضے کے الزامات موجود ہیں۔اس مالی بدعنوانی میں شامل افراد کی اکثریت کا تعلق قندھار گروپ سے بتایا جاتا ہے۔نمایاں ناموں میں ملا ہبیت اللہ کے قریبی ساتھی، سابق گورنر قندھار اور موجودہ گورنر بلخ ملا یوسف وفا سرِفہرست ہیں۔ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے قندھار میں ایک بڑا ہوٹل اور قیمتی رہائش گاہ حاصل کی، جن کی مجموعی مالیت تقریباً چار لاکھ ڈالر بتائی جاتی ہے۔اسی طرح سابق طالبان رہنما ملا محمد اختر منصور کے بیٹے تحفۃ اللہ، نائب وزیر، سابق وزیر ٹرانسپورٹ امیر محمد عمر مجاہد کے بھائی، وزیر دفاع ملا یعقوب کے چچا عبدالمنان عمری، نائب وزیر برائے محنت وسماجی امور عبدالغنی برادر کے قریبی رشتہ دار، ہدایت اللہ، نائب وزیر انسدادِ منشیات ملا عبدالحق بدری اور ملا ہبیت اللہ کی اسپیشل فورس کے کمانڈر ملا عبدالاحد طالب جیسے افراد کے نام بھی زبان زدِ عام ہیں۔یہ تمام صورتحال طالبان کے اُس ابتدائی تاثر سے بالکل مختلف ہے جو ملا عمر کے دور میں موجود تھا۔

## عوامی طرزِ زندگی

ملا عمر خود ایک نہایت سادہ ماحول میں رہتے تھے۔ان کی رہائش گاہ پر غیر معمولی سکیورٹی حصار نہیں ہوتا تھا۔ عام افراد، قبائلی عمائدین اور علماء نسبتاً آسانی سے ان تک رسائی حاصل کر لیتے تھے۔ان کے قریبی ساتھی بھی عام لوگوں کے درمیان رہتے تھے۔بازاروں، مساجد اور عوامی مقامات پر ان کی موجودگی معمول کی بات سمجھی جاتی تھی۔اس دور میں طالبان قیادت کے اندر خوفِ احتساب موجود تھا۔گورنروں اور کمانڈروں کو یہ احساس رہتا تھا کہ اگر کسی علاقے میں ظلم، رشوت یا لوٹ مار کی شکایات بڑھیں تو انہیں سزا مل سکتی ہے۔یہی وجہ تھی کہ اُس وقت طالبان کی تنظیمی گرفت نسبتاً مضبوط سمجھی جاتی تھی۔

موجودہ طالبان حکومت میں صورتحال یکسر مختلف ہے۔آج ملا ہبیت اللہ اخوندزادہ تک رسائی تقریباً ناممکن سمجھی جاتی ہے۔عام افغان شہری تو دور کی بات، خود طالبان کے وزراء، گورنروں اور عسکری کمانڈروں کو بھی ملاقات کے لیے ہفتوں بلکہ بعض اوقات مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔طالبان کے اندر یہ بات عام کہی جاتی ہے کہ صرف چند مخصوص افراد ہی ایسے ہیں جنہیں براہِ راست رسائی حاصل ہے۔ان افراد میں ملا ندا محمد ندیم، ملا یوسف وفا، چیف جسٹس عبدالحکیم حقانی اور ملا شیرین جیسے نام شامل ہیں۔ان سب کا تعلق کسی نہ کسی صورت میں قندھار کے طاقتور حلقے سے ہے۔اس صورتحال نے طالبان کے اندر شورائی نظام اور

اجتماعی فیصلہ سازی کے تصور کو بھی کمزور کیا ہے۔

ہیبت اللہ سے ملاقات کے لئے ایسے پیچیدہ پروٹوکول نافذ کیے گئے ہیں کہ کسی فلم کی کہانی کا گمان ہوتا ہے۔ اگر کوئی وزیر، گورنر یا اہم شخصیت امیر سے ملاقات چاہے تو اسے پہلے قندھار جا کر باضابطہ درخواست دینی پڑتی ہے۔ درخواست میں ملاقات کی وجہ لکھی جاتی ہے، پھر کئی مراحل سے گزرنے کے بعد فیصلہ ہوتا ہے کہ ملاقات کی اجازت دی جائے یا نہیں۔ اکثر صورتوں میں درخواست مسترد ہو جاتی ہے یا کسی نمائندے کے ذریعے جواب دے دیا جاتا ہے۔ اگر کسی خوش نصیب کو ملاقات کی اجازت مل جائے تو اسے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، شائد دنیا کی معلوم تاریخ میں کسی بادشاہ یا کسی ڈان سے ملاقات بھی اتنی مشکل اور پیچیدہ نہ ہوگی۔ جب قیادت خود عوام اور اپنے ساتھیوں سے کٹ جائے تو پھر نچلی سطح پر بھی یہی طرزِ عمل منتقل ہوتا ہے۔ نتیجتاً حکومت عوامی مسائل، غربت، بھوک، بے روزگاری، مہنگائی اور سماجی بے چینی سے دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ آج افغانستان میں یہی صورتحال دکھائی دیتی ہے جہاں لاکھوں لوگ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں مگر اقتدار کے مراکز میں اس درد کا احساس تک نہیں، وزرا کمشن میں اربوں روپے وصول کر رہے ہیں، 80 فیصد شہری عالمی خیراتی اداروں کے رحم و کرم پر ہیں، بین الاقوامی اداروں سے ملنے والی خیرات میں بھی کرپشن اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری ہے۔

## مساوات، انصاف اور احتساب

طالبان کی پہلی حکومت کے دوران مساوات اور قانون کی بالادستی کو ایک اصول کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ عام سپاہی ہو یا اہم کمانڈر، سب کے لیے ایک ہی قانون تھا۔ اگر کوئی جنگی کمانڈر حکم عدولی کرتا یا میدان چھوڑ کر بھاگنے کی کوشش کرتا تو اسے سزا دی جاتی۔ 1997 میں طالبان نے چند دن کے لئے مزار شریف پر قبضہ کیا، احمد شاہ مسعود کی جنگی چال نے جب پانسہ پلٹ کر دکھا دیا تو طالبان کو فرار کا راستہ نہیں مل رہا تھا، بہت بڑی تعداد میں لوگ قندوز آن پہنچے جہاں سے زخمیوں کو ہیلی کاپٹر پر نکالنے کا بندوبست تھا، ایک مرکزی کمانڈر زخمی نہیں تھا، لیکن زخمیوں میں چھپ کر فرار کی کوشش میں تھا، پکڑا گیا وہیں سب کے سامنے درے مارے گئے، ایسے کئی واقعات آج بھی طالبان کے پرانے حلقوں میں بطور مثال بیان کیے جاتے ہیں۔ موجودہ طالبان حکومت پر سب سے بڑا اعتراض ہی یہ ہے کہ اب احتساب صرف کمزور طبقے تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

نچلی سطح کے اہلکاروں اور عام شہریوں کو تو سرِ عام سزائیں دی جاتی ہیں مگر اعلیٰ قیادت کے خلاف کارروائی تقریباً ناممکن دکھائی دیتی ہے۔ تین مثالیں تو بہت نمایاں ہیں کہ وزیر معدنیات پر اربوں کی کرپشن خود ہیبت اللہ کی انکوائری کمیٹی نے ثابت کر دی مگر سزا کیا ملی؟ وزارت بدل دی گئی۔ ابھی یہ اپریل 2026 کا قصہ ہے کہ وزیر صحت اور اس کا پورا خاندان کرپشن کی دلدل میں گھٹنوں تک دھنسا ہوا پکڑا گیا، خود جی ڈی آئی نے پکڑا، مال برآمد کیا، لیکن صرف ایک ہفتے میں سب کلیئر ہو گیا، گرفتار رہا ہو گئے بلکہ عہدوں پر بحال بھی کر دیئے گئے، وزیر کو تو کوئی گرفتار بھی نہ کر سکا حالانکہ اس کے گھر سے سب برآمد ہوا تھا۔ 2024 کے پاسپورٹ سکینڈل سامنے آیا، گرفتاریاں بھی ہوئیں، طالبان سے تعلق رکھنے والے بعض افسر وقتی طور پر عہدوں سے ہٹائے گئے لیکن صرف ایک ہفتہ، اس کے بعد تحقیقات ختم، رپورٹ ہیبت اللہ سیکریٹیریٹ میں جمع، تمام ملزمان کو رہا کر کے دوبارہ بحال کر دیا گیا حالانکہ ان پر بدعنوانی اور اختیارات کے ناجائز استعمال کے سنگین الزامات ثابت ہو چکے تھے۔ دوسری جانب سابق حکومت کے دور میں بھرتی ہونے والے غیر طالبان جنہیں احسان کرتے ہوئے نوکری جاری رکھنے کی اجازت دی گئی تھی، وہ پکڑے گئے خصوصاً نچلے درجے کے اہلکاروں کو سخت سزاؤں اور تذلیل کا نشانہ بنایا گیا تا کہ انہیں دوسروں کے لیے عبرت بنایا جا سکے۔

کابل میں آج کل یہ جملہ عام طور پر سننے کو ملتا ہے کہ ''اگر تمہارے پاس پرچی ہے تو ہر ناجائز کام بھی ہو جائے گا، کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوگا۔'' یہ فقرہ صرف ایک طنزیہ جملہ نہیں بلکہ موجودہ نظام میں سفارش، تعلقات اور گروہی وابستگی کے بڑھتے ہوئے کردار کی عکاسی کرتا ہے جہاں قانون اور احتساب اکثر طاقتور حلقوں کے سامنے بے معنی دکھائی دیتے ہیں۔

مالی بدعنوانی کے ان واقعات نے یہی تاثر مضبوط کیا کہ طالبان کے اندر طاقتور شخصیات کے لیے الگ نظام موجود ہے۔ کئی گرفتار اہلکار جلد رہا کر دیئے گئے جبکہ نچلے درجے کے ملازمین کو سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری جانب عام آدمی کا یہ حال ہے کہ روزانہ کی بنیاد پر کئی شہروں میں مرد و زن کو سرِ عام کوڑے مارے جاتے ہیں، سزائیں سنائی جاتی ہیں۔

اقربا پروری بھی طالبان رجیم کا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ سرکاری سطح پر اس کی مخالفت کی جاتی ہے مگر عملی طور پر متعدد اہم عہدے قریبی رشتہ داروں، وفادار ساتھیوں اور مخصوص حلقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے

پاس ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اقتدار کا دائرہ محدود سے محدود تر ہوتا جا رہا ہے۔

## ملا عمر کا امن وامان کا ویژن اور اسلحہ پالیسی

اسلحے کے معاملے میں بھی موجودہ طرزِ عمل اور ملا عمر کے دور کی پالیسی میں واضح تضاد دکھائی دیتا ہے۔ملا عمر کے زمانے میں ہتھیاروں کے بارے میں پالیسی سخت، منظم اور غیر امتیازی تھی۔ طالبان جب کسی نئے علاقے پر قبضہ کرتے تو ان کی اولین ترجیح وہاں سے اسلحہ جمع کرنا ہوتی تھی۔عام شہریوں سے لے کر مقامی کمانڈروں اور بااثر افراد تک سب کے ہتھیار ضبط کر لیے جاتے تھے تاکہ کسی متوازی طاقت کے ابھرنے کا امکان باقی نہ رہے۔سرکاری اہلکاروں کو بھی صرف ڈیوٹی کے دوران اسلحہ رکھنے کی اجازت ہوتی تھی۔ عام حالات میں کسی شخص کا مسلح ہو کر بازاروں، گلیوں یا عوامی مقامات پر گھومنا قابلِ قبول نہیں تھا۔کسی علاقے میں طالبان کے کنٹرول کی سب سے نمایاں علامت یہی مانی جاتی تھی کہ وہاں گھروں سے اسلحہ جمع کر لیا جاتا، غیر ضروری مسلح نقل وحرکت ختم ہو جاتی اور کھلے عام ہتھیاروں کی نمائش تقریباً ناپید ہو جاتی تھی۔اسی پالیسی کے باعث عام جرائم، ڈکیتی، اغوا اور مسلح جھگڑوں کی شرح نسبتاً کمتر سطح پر چلی گئی کیونکہ لوگ جانتے تھے کہ غیر قانونی اسلحہ رکھنے یا اس کی نمائش پر فوری کارروائی ہو سکتی ہے۔اس ماحول نے کم از کم ظاہری سطح پر خوف اور نظم وضبط کا ایک ایسا تاثر قائم رکھا جسے طالبان اپنی حکمرانی کی کامیابی کے طور پر پیش کرتے تھے۔

## موجودہ رجیم کی دوغلی پالیسی

موجودہ رجیم میں صورتحال مختلف ہے۔عام شہریوں کے لیے سخت پابندیاں ہیں مگر چہیتوں کو مکمل آزادی حاصل ہے۔تحریک طالبان پاکستان، القاعدہ، ازبک جنگجوؤں اور دیگر غیر ملکی تنظیموں کے بارے میں اطلاعات آتی رہی ہیں کہ انہیں مختلف علاقوں میں اسلحہ رکھنے کی اجازت حاصل ہے۔2022 اور 2023 کے ابتدائی دنوں میں پکتیا اور پکتیکا میں اسلحہ جمع کرنے کی مہم چلائی گئی، ٹی ٹی پی نے اسلحہ دینے سے انکار کر دیا، مزاحمت کی، گولی بھی چلی، ریاست نے اپنی رٹ قائم کرنے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی، یہی وجہ ہے کہ افغانستان کے بعض حصوں میں طاقت کے غیر رسمی مراکز دوبارہ ابھر رہے ہیں۔

پابندی ہے کہ نیٹو کا چھوڑا ہوا اسلحہ نجی سطح پر نہیں رکھا جا سکتا لیکن ملا وفا کے پاس انبار لگے ہیں، کوئی پوچھنے والا

نہیں، دوسری جانب عام افغان شہری اگر امریکی یا نیٹو افواج کا چھوڑا ہوا ایک پستول بھی رکھے تو اسے گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ کئی افراد جیلوں میں ڈالے جاچکے ہیں جبکہ طاقتور عناصر کے پاس بھاری اسلحے کے ذخائر موجود ہیں، خرید وفروخت بھی معمول کی بات بن چکی ہے۔ بھاری ہتھیاروں سے لے کر سرکاری گوداموں کے ساز وسامان تک، سب کچھ غیر رسمی منڈیوں میں دستیاب ہے۔ مسلح افراد کی آزادانہ نقل و حرکت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ عام شہری خود کو مسلسل خوف اور غیر یقینی کیفیت میں محسوس کرتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں بدامنی کا ایک نیا دور جنم لے رہا ہے۔ قتل وغارت، لوٹ مار، اغوا، بھتہ خوری اور اختیارات کے ناجائز استعمال کے واقعات میں اضافہ محسوس کیا جارہا ہے۔ کرپشن کی ایسی ایسی حیران کن داستانیں سامنے آرہی ہیں کہ ہر واقعہ اپنی جگہ ایک مکمل کتاب کا موضوع بن سکتا ہے۔ سرکاری وسائل کی بندر بانٹ، سفارش پر تقرریاں، قبضوں کے جھگڑے، اور طاقتور حلقوں کی پشت پناہی میں ہونے والی زیادتیاں عام لوگوں میں بے چینی پیدا کررہی ہیں۔ کابل سے قندھار اور شمالی علاقوں تک عام شہریوں کی گفتگو میں ایک ہی شکایت بار بار سنائی دیتی ہے کہ قانون کا اطلاق کمزور آدمی پر ہوتا ہے جبکہ بااثر افراد اکثر احتساب سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہی احساس رفتہ رفتہ عوام کے اعتماد کو کمزور کررہا ہے اور معاشرے میں خوف، بے یقینی اور محرومی کے احساس کو مزید گہرا کررہا ہے۔

## القاعدہ اور طالبان

القاعدہ سے تعلق، طالبان اور ملا عمر کے دور کا سب سے حساس اور متنازع موضوع رہا ہے جس پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ اس حوالے سے اہم ترین امر یہ ہے کہ صرف امریکہ ہی نہیں بلکہ طالبان اور ان کے حامی بھی ہمیشہ پورا سچ بولنے سے گریز کرتے رہے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ امریکہ اور طالبان دونوں کے مفاد میں یہ بات شامل رہی کہ طالبان اور اسامہ بن لادن کے تعلقات کی مکمل حقیقت پوری طرح سامنے نہ آئے۔ ایک جانب امریکہ نے اپنی طویل جنگی حکمتِ عملی، خفیہ رابطوں اور بعد ازاں مذاکراتی عمل کے کئی پہلو مکمل شفافیت کے ساتھ کبھی عوام کے سامنے نہیں رکھے، تو دوسری جانب طالبان نے بھی ہمیشہ اپنے داخلی معاملات، القاعدہ کے ساتھ تعلقات کی نوعیت اور مختلف عرب جنگجوؤں کے کردار کے بارے میں محتاط اور مبہم مؤقف اختیار کیے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس پورے معاملے

کے گرد آج بھی سوالات، شکوک اور متضاد بیانیے موجود ہیں۔ طالبان کی پالیسی شفٹ کو سمجھنے کے لئے صرف دو پہلوؤں اک ذکر لازم ہے۔

## اسامہ بن لادن کی افغانستان آمد اور ابتدائی صورتحال

مئی 1996 کو اسامہ بن لادن کو امریکی دباؤ پر سوڈان سے نکال دیا گیا اور وہ ایک چارٹرڈ طیارے پر ننگرہار کے دارالحکومت جلال آباد پہنچے۔ ہم ان دنوں کابل میں تھے۔ صدر برہان الدین ربانی نے بڑی خوشی سے ہمیں اطلاع دی کہ ''مشہور عرب مجاہد اسامہ بن لادن افغانستان پہنچ گئے ہیں، ہم ان کی میزبانی کر رہے ہیں۔'' وہ اس پہلو کو اپنے مخالف گلبدین حکمت یار کے خلاف اپنے حق میں دلیل کے طور پر استعمال کر رہے تھے کہ اسامہ انہیں یعنی شمالی اتحاد کو حق پر سمجھتا ہے، اس لیے ہمارا مہمان بنا۔ جلال آباد میں مجاہدین کی شوریٰ کی حکومت تھی جس کا گورنر حاجی عبدالقدیر تھا اور اس کا تعلق حزب اسلامی یونس خالص گروپ سے تھا۔ اس نے اسامہ کا باقاعدہ استقبال کیا اور اسے کیمپ مہیا کیا۔ ستمبر 1996 میں طالبان پیش قدمی کرتے ہوئے ننگرہار پہنچے۔ جلال آباد شوریٰ نے لڑے بغیر سرنڈر کر دیا۔ طالبان نے علاقے پر قبضہ کرتے وقت اسامہ بن لادن اور اس کے ساتھیوں کو تحویل میں لے لیا۔ بعد میں کہا گیا کہ یہ حفاظتی تحویل تھی حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

سچ یہ ہے کہ اس وقت تک طالبان کا اسامہ بن لادن سے کوئی تعلق نہیں تھا، اس گرفتاری پر اہم سلفی علماء متحرک ہوئے، بعض اہم شخصیات کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا، ملاعمر اور دیگر طالبان قائدین کے پاکستانی اساتذہ سے رابطے کئے گئے، انہیں افغانستان بھیجا گیا، یوں کئی ہفتوں کی تگ ودو کے بعد ملاعمر قائل ہوئے، پھر کہیں جا کر اسامہ اور ملاعمر کی ملاقات ممکن ہوسکی، اور یوں یہ سلسلہ تعلق میں تبدیل ہوا لیکن طالبان مجموعی طور پر اسامہ کو تسلیم کرنے سے گریزاں رہے۔ بہت بڑا سچ یہ ہے کہ اسامہ اور ان کے دیگر اتحادیوں کو افغانستان میں ہر طرح کی آزادی حاصل نہیں تھی۔ وہ ملاعمر کے احکامات کے پابند تھے۔ ملاعمر اسامہ یا کسی بھی دوسرے کو اپنی پالیسی میں دخل دینے کی اجازت نہیں دیتے تھے بلکہ انہیں ڈسپلن میں رکھتے تھے۔

اکتوبر 1998 میں ہم نے قندھار کا سفر کیا تو اسامہ بن لادن قندھار ایئرپورٹ کے قریب نہر کے کنارے ایک ایسے گاؤں میں رہائش پذیر تھے جو سوویت فضائیہ کی بمباری سے کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا، معلوم ہوا کہ ملاعمر نے اسامہ بن لادن اور ان کے ساتھیوں کو ایک طرح سے ہاؤس اریسٹ جیسی کیفیت

میں رکھا ہوا تھا ان کی میڈیا یا کسی بھی غیر ملکی سے طالبان کی اجازت کے بغیر ملاقات اور بات چیت پر بھی پابندی لگا دی گئی تھی، ان کے مہمانوں کے لئے قندھار جا کر طالبان کے متعلقہ لوگوں سے اجازت لینا لازم کر دیا گیا تھا۔ اسامہ بن لادن نے ملا عمر کا مخصوص قسم کی لیڈ پنسل سے لکھا حکم دکھایا اور بتایا کہ مجھ پر یہ پابندیاں عائد کی جا چکی ہیں۔ ان پابندیوں کے باوجود اسامہ بن لادن اور القاعدہ نے نائن الیون کیسے کیا؟ ملا عمر نے اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کیوں نہ کیا؟ یہ ایک الگ تحقیق طلب معاملہ ہے جس پر اب تک صرف وہی کچھ لکھا گیا جس کی امریکہ کو ضرورت تھی۔ پورا سچ کب سامنے آ سکے گا، اس کا انتظار رہے گا۔

اسامہ اور طالبان کے تعلقات اور ہاؤس اریسٹ کی تصدیق خود ملا متقی نے بھی کی ہے۔ 2001 میں امریکیوں کی جاری کردہ ڈی کلاسیفائیڈ انٹیلی جنس رپورٹس نے بھی اس امر کی تصدیق کی کہ ملا متقی نے دسمبر 1997 میں امریکیوں سے اپنی خفیہ ملاقاتوں میں بتایا تھا کہ اسامہ پر پابندیاں لگائی جا چکی ہیں۔

## اقتدار کا توازن

ملا عمر کے دور میں پالیسی سازی کا اختیار مکمل طور پر طالبان قیادت کے پاس تھا، ملا عمر کبھی بھی اس میں القاعدہ کی مداخلت قبول نہیں کی، القاعدہ کو کبھی حکومتی عہدوں میں شامل نہیں کیا گیا اور نہ ہی انہیں کسی چھوٹے سے چھوٹے عسکری محاذ کی کمان سونپی گئی۔ ملا عمر کا پورا دور اس بات کا گواہ ہے کہ القاعدہ یا اسامہ بن لادن سے گہرے تعلقات کے باوجود اصل اتھارٹی ملا عمر کی تھی۔ اسامہ بن لادن بھی ان کا حکم ماننے پر مجبور تھے۔ ملا عمر نے القاعدہ سے تعلق رکھنے والے کسی فرد کو طالبان یا حکومت میں کبھی کوئی عہدہ نہیں دیا۔ ان کا اسٹیٹس ہمیشہ ایک مہمان کا رہا۔ یہاں تک کہ جنگ کے دوران بھی القاعدہ کو کسی چھوٹے سے چھوٹے محاذ کی کمان بھی نہیں دی گئی۔

طالبان کے عسکری، سیاسی اور انتظامی فیصلے مکمل طور پر اپنی قیادت کے دائرہ اختیار میں رہتے تھے۔ القاعدہ کے افراد اگرچہ مختلف علاقوں میں موجود تھے اور بعض مواقع پر جنگی معاونت بھی فراہم کرتے تھے لیکن انہیں فیصلہ سازی کے عمل میں شریک نہیں کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ملا عمر اپنے دائرہ اختیار، تنظیمی نظم اور قیادت کی بالادستی پر کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ پہلو اس لیے بھی اہم ہے کیونکہ موجودہ طالبان کے اندر مختلف غیر ملکی گروہوں، علاقائی دباؤ اور داخلی طاقت کے مراکز کے حوالے سے جو نئی بحثیں جنم لے رہی ہیں، انہیں سمجھنے کے لیے ماضی کے اس توازن کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

## موجودہ صورتحال کا تقابل

ہیبت اللہ رجیم کے بارے میں اقوامِ متحدہ سمیت پوری دنیا چیخ رہی ہے کہ القاعدہ کے اثر ورسوخ میں اضافہ ہوا ہے، وہ ریاستی فیصلہ سازی اور پالیسی امور میں باقاعدہ طور پر شامل ہے۔ اگر تقابلی انداز میں دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''ملا عمر کے دور میں القاعدہ ایک پناہ گزین گروپ تھا''، جبکہ موجودہ دور میں وہ حکومت کا حصہ ہے اور پالیسیوں اور فیصلوں پر اثرانداز ہورہی ہے۔ یہ معاملہ صرف پالیسی تک محدود نہیں بلکہ القاعدہ کے لوگ حکومتی مشینری کا حصہ ہیں اور یہ نمائندگی اعلیٰ سطح سے لے کر نچلی سطح تک ہر جگہ موجود ہے۔

۔۔۔طالبان کی انٹیلی جنس ایجنسی جی ڈی آئی کے ڈپٹی چیف ملا تاج میر جواد، جو القاعدہ شوریٰ کا رکن رہ چکا ہے، بظاہر اب بھی رابطوں میں ہے۔ اس کے علاوہ جی ڈی آئی اور وزارتِ دفاع کے ڈھانچے میں القاعدہ اور اس کے اتحادی گروہوں کے متعدد افراد کو ذمہ داریاں دی گئی ہیں۔ ان میں طویل عرصے سے افغانستان میں رہنے والے غیر ملکی بھی شامل ہیں جنہیں ''امہ مسلمہ'' پالیسی کے تحت افغان شہریت دے کر عہدوں پر فائز کیا گیا ہے۔

۔۔۔سابق گورنر ہلمند، ملا ہیبت اللہ کی خصوصی فورس (امیری دستہ) کے چیف اور موجودہ پولیس چیف قندھار ملا عبدالاحد طالب سمیت کم از کم تین گورنرز کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ القاعدہ سے وابستہ ہیں اور اب بھی مختلف سطحوں پر روابط رکھتے ہیں۔

۔۔۔قاری احسان اللہ بریال (گورنر کا پیسا) ہے، ابھی تک القاعدہ کے رابطے میں ہے۔

۔۔۔ مولوی محمد آغا حکیم (گورنر پنجشیر) کے بارے میں بھی اسی نوعیت کے دعوے سامنے آتے ہیں۔ مؤخر الذکر کے حوالے سے یہ الزام بھی لگایا گیا ہے کہ وہ عرب النسل ہیں اور انہیں افغان شہریت دی گئی ہے۔

۔۔۔اسی طرح مولوی نور جلال جلالی (وزیر صحت) سمیت متعدد افراد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں القاعدہ سے وابستگی کی بنیاد پر اہم عہدے دیئے گئے۔

اس امر کے ثبوت موجود ہیں کہ مختلف بین الاقوامی دہشت گرد تنظیموں کے عناصر اس وقت افغانستان میں موجود ہیں جن میں القاعدہ، القاعدہ برصغیر، القاعدہ 313، ای ٹی آئی ایم، جماعت انصار اللہ تاجکستان، آئی ایم یو اور تحریک طالبان تاجکستان (ٹی ٹی ٹی) سمیت کم از کم 23 دہشت گرد تنظیمیں وہاں صرف موجود

ہی نہیں بلکہ پالیسی اور فیصلہ سازی میں شریک بھی ہیں۔ اس بنا پر یہ کہنا بے جا نہیں کہ ہیبت اللہ حکومت دراصل عالمی دہشت گردوں کی حکومت ہے جس کا افغان عوام کی فلاح و بہبود سے کوئی تعلق نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ملا عمر کے دور میں جب اسامہ بن لادن اور القاعدہ پوری طرح آزاد نہیں تھی، ان پر بعض پابندیاں عائد تھیں، اس وقت ایک تنظیم نے جس سطح پر عالمی دہشت گردی کی، اس کی مثال نہیں ملتی۔ اب جبکہ صرف ایک القاعدہ نہیں بلکہ 23 عالمی دہشت گرد تنظیمیں پوری آزادی کے ساتھ افغانستان میں موجود ہیں اور ملا عمر جیسی کسی مضبوط شخصیت کا کنٹرول بھی نہیں، تو دنیا کو کتنی خونریزی دیکھنی پڑ سکتی ہے؟

## علاقائی پالیسی

افغانستان میں ملا محمد عمر کی حکومت میں مسلسل خانہ جنگی کے باوجود خارجہ محاذ پر ایک محتاط اور محدود طرزِ عمل اختیار کیا گیا۔ اس دور کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ طالبان حکومت نے اپنی تمام تر توانائیاں افغانستان کے اندر اقتدار کے استحکام، خانہ جنگی کے خاتمے اور مرکزی نظم کے قیام پر مرکوز رکھیں جبکہ پڑوسی ممالک کے اندر براہِ راست مداخلت یا بدامنی پھیلانے سے قصداً گریز کیا۔

پڑوسی ممالک خصوصاً ایران اور تاجکستان کے ساتھ تعلقات کشیدہ تھے۔ ایران کے ساتھ اختلافات کی بنیاد فرقہ ورانہ تھی۔ 1998 میں مزار شریف میں ایرانی سفارت کاروں کے قتل کے واقعے کے بعد کشیدگی انتہائی خطرناک حد تک بڑھ گئی اور دونوں ممالک عملاً جنگ کے دہانے تک پہنچ گئے لیکن اس شدید کشیدگی نے کبھی سرحد پار جنگ کی شکل اختیار نہیں کی۔ طالبان قیادت خصوصاً ملا عمر نے ایران کے اندر کسی قسم کی دہشت گردی یا خفیہ کارروائی کی اجازت نہیں دی۔ ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ اس حوالے سے بعض مقامی، عالمی اور فرقہ ورانہ عناصر نے انہیں اکسانے اور راستہ اختیار کرنے کے لیے قائل کرنے کی کوشش بھی کی۔

میں یہ گواہی دے سکتا ہوں کہ ان کے قریب سمجھا جانے والا ایک غیر افغان کمانڈر شدید فرقہ ورانہ رجحان رکھتا تھا، اسی رجحان کا شکار ہو کر وہ مارا بھی گیا۔ اس نے ایران کے خلاف ایک دہشت گرد تنظیم قائم کرنے اور ایران کو سبق سکھانے کا ایک منصوبہ بھی پیش کیا، جس پر اسے شدید ذلت کا سامنا کرنا پڑا، اسے کسی بھی اہم ذمہ داری کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا، اس پر ہمیشہ نظر رکھی گئی کہ خود سے کوئی واردات نہ کر دے، حالانکہ طالبان کی ایک مستقل شکایت یہ بھی رہی کہ ایران ان کے خلاف افغانستان کے اندر بالواسطہ جنگ میں ملوث ہے۔ طالبان کے نزدیک شمالی اتحاد کو ایران کی حمایت حاصل تھی جبکہ اس اتحاد کی

بڑی قیادت ایران اور تاجکستان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ تاجکستان بھی شمالی اتحاد کے لیے ایک اہم پناہ گاہ اور لاجسٹک مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اس صورتحال میں طالبان کے لیے یہ جواز موجود تھا کہ وہ ردعمل کے طور پر ان ممالک کے اندر کارروائیاں کریں مگر عملی طور پر ایسا نہیں ہوا کیونکہ یہ ملا عمر کی پالیسی نہیں تھی۔

## موجودہ رجیم کا علاقائی رویہ:

ہمسایوں کے حوالے سے موجودہ رجیم کی پالیسی سو فیصد مختلف ہے۔ عالمی ادارے اور خطے کے ممالک متفق ہیں کہ افغانستان عالمی دہشت گردی کا مرکز بن چکا ہے۔ ان کی پالیسی ہمسایہ ممالک کے لیے ہمیشہ سے زیادہ بڑا چیلنج بن گئی ہے۔ ٹی ٹی پی سے لے کر جیش العدل، آئی ایم یو، جماعت انصار اللہ، اور ای ٹی آئی ایم کی سرپرستی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں بلکہ پاکستان کے خلاف دہشت گردی میں خود افغان طالبان کی شمولیت کے ناقابل تردید ثبوت موجود ہیں۔ یہ دعویٰ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ ہمسایہ ممالک کے خلاف دہشت گردی کرنے والے گروپوں کو مختلف سطح پر سرکاری طور پر ہر طرح کی سہولتیں فراہم کی جارہی ہیں جس کی وجہ سے علاقائی سلامتی پر تباہ کن اثرات مرتب ہورہے ہیں۔

ہیبت اللہ رجیم ہر ہمسایہ ملک کے لیے عذاب بنا ہوا ہے۔ صرف پاکستان ہی ان کی مسلط کردہ دہشت گردی کو نہیں بھگت رہا بلکہ ہر ہمسایہ ملک کے خلاف دہشت گرد تنظیمیں افغان طالبان کی مہربانیوں سے لطف اندوز ہورہی ہیں۔ ایران کے خلاف جیش العدل اور دہشت گردوں کا ایک نیا اتحاد ''جبہۃ المبارزین'' صوبہ نیمروز میں موجود ہے۔ ازبکستان کے خلاف اسلامک موومنٹ آف ازبکستان (آئی ایم یو)، تاجکستان کے خلاف جماعت انصار اللہ اور تحریک طالبان تاجکستان (ٹی ٹی ٹی)، اور چین کے خلاف آئی ٹی آئی ایم کو ایک پالیسی کے تحت پالا جارہا ہے اور استعمال کیا جارہا ہے۔

## پاکستان سے تعلقات

افغانستان اور پاکستان کے تعلقات ہمیشہ پیچیدہ رہے ہیں مگر ایک دور ایسا بھی تھا جب یہ تعلق نسبتاً واضح اور باہمی مفادات پر مبنی رہا۔ یہ واحد دور تھا جب پاکستان اپنی مغربی سرحد سے ایک حد تک مطمئن ہوا، کسی حد تک بےفکری اور امن نصیب ہوا۔ یہ ملا محمد عمر کا دورِ حکومت تھا۔

1996 میں طالبان کے کابل میں داخل ہونے کے بعد افغانستان کی سیاسی صورتحال یکسر بدل گئی۔ اس

موقع پر طالبان کی وزارتِ خارجہ نے اپنے سرکاری بیان میں پاکستان کو ایک برادر ملک قرار دیا اور قیام امن کی کوششوں اور افغانوں کی میزبانی کی ذمہ داری ادا کرنے پر اس کے تعاون کو سراہا، شکریہ ادا کیا، اس کے علاوہ بھی قندھار میں ہونے والے شوریٰ کے اجلاسوں میں بھی پاکستان کو افغان عوام کا خیر خواہ کہا جاتا تھا۔ یہ محض رسمی بیانات نہیں تھے بلکہ پالیسیوں میں بھی اس کا اظہار ہوتا تھا۔

9/11 کے بعد بھی جب پوری دنیا طالبان کے خلاف کھڑی تھی، پاکستان نے طالبان کے ساتھ خیر خواہی کا رشتہ قائم رکھا، عالمی برادری کے ساتھ چلنے کے سلسلہ میں ان کی رہنمائی کرنے کی کوشش کی، صورتحال کو جنگ سے بچانے اور معاملات کو بات چیت سے حل کرنے کے سلسلہ میں انہیں مشاورت بھی فراہم کی اور انہیں امریکہ کے ساتھ مذاکرات پر بٹھانے میں مدد کی تو ملاعمر نے اس موقع پر بھی پاکستان کے کردار پر اعتراض نہیں اٹھایا، سوال نہیں کیا، الزام عائد نہیں کیا بلکہ اس اقدام کو سراہا اور پاکستان کو انصاف کی بات کرنے والا ملک قرار دیا۔

ایسا نہیں کہ ملاعمر کے دور میں دونوں ممالک کے درمیان تعلقات یکساں رہے، اتار چڑھاؤ بھی آیا لیکن ایک حد کے اندر رہ کر، 1999 میں پہلی بار دونوں ممالک کے درمیان سنجیدہ نوعیت کی سرحدی کشیدگی سامنے آئی۔ ڈیوڑنڈ لائن کے مختلف حصوں میں بدمزگی ہوئی، ملاعمر نے سرحدی کمانڈروں یا مقامی قبائل کے تعصّبات پر معاملہ نہیں چھوڑا بلکہ فیصلہ کن کردار ادا کیا اور واضح ہدایات دیں کہ سرحدی تنازع کو جنگ کی صورت اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ یہ ایک اہم موڑ تھا کیونکہ افغانستان کے اندر قوم پرست حلقے اس معاملے کو شدت دینے کے حق میں تھے۔ طالبان سے کہا جارہا تھا کہ اگر پاکستان کے خلاف سخت اقدام کیے جائیں تو قوم پرست ان کی حمایت میں آجائیں گے اور طالبان کی پوزیشن مستحکم ہوجائے گی۔ شمالی افغانستان میں بھی طالبان کی رٹ قائم کرنے کی پیشکش بھی کی گئی مگر طالبان قیادت نے معاملہ کنٹرول میں رکھا۔

2000 تک آتے آتے طالبان حکومت نے اپنی داخلی اور خارجی پالیسی کو مزید منظم کرلیا تھا۔ اس مرحلے پر پاکستان کے ساتھ تعلقات صرف سفارتی سطح تک محدود نہیں رہے بلکہ اس میں معاشی اور سکیورٹی تعاون بھی شامل ہوگیا۔ کراچی سے قندھار تک تجارتی راستہ فعال رہا، پاکستانی قونصلیٹس کو تحفظ دیا گیا اور سب سے اہم بات یہ کہ پاکستان مخالف گروپوں کو افغانستان میں کسی قسم کی سرگرمی کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس بات کے ثبوت موجود ہیں کہ پاکستان دشمن قوتوں نے افغان سرزمین کو پاکستان کے خلاف استعمال کرنے

کی کوشش ضرور کی لیکن ملاعمر حکومت نے اسے سختی سے کچل کر رکھ دیا۔ ملاعمر نے واضح کیا کہ وہ پاکستان کے ساتھ محاذ آرائی برداشت نہیں کریں گے۔ قندھار میں 1998 کی ملاقات پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کے بعد ہو رہی تھی، ملاعمر جو عموماً لمبی گفتگو سے گریز کرتے تھے، ہر سوال کے جواب میں قرآن کی کوئی آئت پڑھ دینا یا کوئی بہت ضرورت آن پڑنے پر ایک آدھ جملے میں اپنا مدعا بیان کر دیتے۔ انہوں نے پاکستان کے ایٹمی دھماکوں پر خوشی کا اظہار کیا اور اسے امت مسلمہ کی قوت قرار دیا۔ گفتگو کے دوران ایک موقع پر کھل کر کہا کہ ''پاکستان کو ضرورت محسوس ہوئی تو ہم اس کے دفاع کو ترجیح دیں گے۔''

## موجودہ رجیم اور پاکستان

موجودہ رجیم کا معاملہ پوری دنیا کے سامنے ہے کہ پاکستان کے ساتھ تعلقات میں کشیدگی کو کھلی جنگ اور دہشت گردی تک پہنچانے میں اس کا کردار ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ ملاعمر جس پاکستان کے دفاع کو اپنی ترجیح قرار دینے کی بات کرتے تھے، موجودہ رجیم اسی دفاع کو ملیا میٹ کرنے کی خاطر ہر حد تک جانے کو تیار ہے۔ ایک جانب ٹی ٹی پی اور گل بہادر جیسے دہشت گرد گروپوں کی سرپرستی کی جا رہی ہے تو دوسری جانب ہیبت اللہ رجیم کے وزراء اسلام آباد اور لاہور میں حملوں کی کھلی دھمکیاں دیتے ہوئے پائے جا رہے ہیں، اسلام آباد پر ڈرون حملے کرنے کی کوششیں بھی کرتے ہیں، دہشت گردوں کا استقبال ہوتا ہے، ان کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں، عالمی میڈیا پر طالبان کا ترجمان اور وزیر دفاع دہشت گردوں کا دفاع کرتے ہوئے انہیں سیاسی کارکن قرار دیتے ہیں، امن معاہدے پامال کیے جاتے ہیں اور پاکستان کی تباہی کے ہر منصوبے میں ہیبت اللہ رجیم کی مہر ثبت کی جاتی ہے بلکہ اس دشمنی میں وہ بھارت سے بھی چار ہاتھ آگے دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف سکیورٹی چیلنجز، ٹی ٹی پی جیسے گروہوں کی موجودگی اور سرحدی کشیدگیاں ہیں تو دوسری طرف علاقائی سیاست میں بدلتے ہوئے اتحاد اور مفادات ہیں۔ اس وقت یہ بحث بھی جاری ہے کہ افغانستان کی سرزمین کس حد تک پاکستان کے خلاف استعمال ہو رہی ہے اور اس پر کنٹرول کس کا ہے؟

## ملاعمر کے بھارت سے تعلقات

ملاعمر کے دور میں بھارت کے ساتھ تعلقات انتہائی محدود بلکہ پاکستان کی پالیسی کے تابع رکھے گئے تھے

، بھارت کی کوششوں کے باوجود ملاعمر نے واضح طور پر بھارت کو افغانستان میں کسی قسم کی سیاسی یا سفارتی رسائی دینے سے انکار کیا۔ بھارت اس وقت بھی خطے میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا، 1947 سے بھی پہلے سے افغان سرزمین پر موجود بھارتی پراکسیز کی بقا اس کی ترجیح تھی مگر ملاعمر حکومت نے یہ دروازہ مستقل بند رکھا۔ ملاعمر کا یہ فیصلہ پاکستان کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا کیونکہ جنوبی ایشیاء کی سیاست میں اس کا براہ راست اثر پڑتا تھا۔ اسی تناظر میں ملاعمر کی خارجہ پالیسی میں پاکستان کے ساتھ ہم آہنگی مزید واضح ہوتی گئی۔ کشمیر کے مسئلے پر بھی ملاعمر کی طالبان حکومت نے پاکستان کے موقف کی ہمیشہ حمایت کی۔

1998 کے ایک سرکاری بیان میں کشمیری مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کی مذمت کی گئی اور پاکستان کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا گیا۔ ملاعمر باقاعدہ بیانات جاری نہیں کرتے تھے لیکن 1998 میں جاری ہونے والے ایک سرکاری بیان میں کشمیری مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کی مذمت کی گئی اور پاکستان کے ساتھ کھڑے ہونے کا اعلان کیا گیا۔ ملاعمر کا واضح موقف تھا کہ بھارت کی مداخلت افغانستان کے لیے نقصان دہ ہے۔ اسی عرصے میں کشمیر میں بھارتی اقدامات پر طالبان نے پاکستان کے موقف کی کھل کر حمایت کی۔ افغانستان کی وزارت اطلاعات نے ملاعمر کا پیغام جاری کیا کہ ''کشمیر میں مسلمانوں پر ظلم ناقابل قبول ہے اور ہم پاکستان کے ساتھ ہیں۔'' اس سے ملاعمر کی خارجہ پالیسی میں پاکستان کے ساتھ ہم آہنگی ظاہر ہوتی تھی جبکہ بھارت کو ایک مخالف فریق کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔

## موجودہ رجیم اور بھارت

ہیبت اللہ استبداد کی بھارت نوازی ملاعمر کی پالیسی سے سو فیصد ٹکراتی ہے اور اس کے یکسر متصادم ہے۔ یہ رجیم جس طرح بھارت کی گود میں جا بیٹھا ہے اسے دیکھتے ہوئے کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ یہ وہی طالبان ہیں؟ جو کل بھارت کو افغانوں کا دشمن قرار دیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف نام وہی ہے ورنہ یہ لوگ اجنبی ہیں، ان کا ملاعمر سے کوئی تعلق نہیں۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنی بنیاد سے برعکس اور مختلف سیاسی و انتظامی ڈھانچے میں تبدیل ہو چکے ہیں، ان کی پالیسی، نظریہ، منزل، مقاصد اور اہداف ملاعمر کے طالبان سے الٹ ہیں۔ زمینی حقائق اور پالیسیوں کا جائزہ لیا جائے تو ایک واضح فرق محسوس ہوتا ہے جو اس سوال کو مزید اہم بنا دیتا ہے۔

ملا عمر کے دور کے طالبان نے اپنی جدوجہد کا آغاز انقلابی نعرے، مسلح سرداروں کے خلاف جنگ، پرامن مزاحمت کے قیام اور شریعت کے نفاذ کے بیانیے کے ساتھ کیا تھا۔ اس وقت ان کا بیانیہ سخت نظم، سادگی اور کرپشن سے پاک نظام کے گرد گھومتا تھا مگر موجودہ طالبان حکومت کے طرز عمل پر نظر ڈالی جائے تو اس کے برعکس صورتحال دکھائی دیتی ہے۔ اقربا پروری، طاقت کے مراکز میں مخصوص گروہوں کا اثر ورسوخ اور داخلی و خارجی پالیسیوں میں سخت نظریاتی یکسوئی کی کمی واضح ہو چکی ہے۔ علاقائی تعلقات، خارجہ روابط اور دہشت گردی کے مسئلے پر عالمی برادری کے تحفظات برقرار ہیں اور اس حوالے سے سوالات بھی اٹھتے رہتے ہیں۔

ہیبت اللہ کے طالبان اور ملا عمر دور کے طالبان کے درمیان فکری، عملی اور پالیسی سطح پر ایک واضح خلیج پیدا ہو چکی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اتنی بڑی تبدیلی کیسے واقع ہوئی؟

## طالبان کی کایا کلپ

ملا عمر کے طالبان سے لے کر ہیبت اللہ کے طالبان تک پالیسیوں میں تضاد، تبدیلی اور رویوں کی ٹرانسفارمیشن کوئی اچانک حادثاتی واقعہ نہیں، اس کے پس منظر میں ایک پوری داستان ہے جس کا آغاز ملا عمر کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا جب بعض طالبان رہنماؤں نے خفیہ طور پر امریکہ اور سی آئی اے سے روابط قائم کیے۔ اس سب کی ابتداء ملا امیر خان متقی سے ہوئی جو بعد میں ملا عبدالغنی برادر، عباس ستنکزئی اور دیگر کے ساتھ مل کر اس تبدیلی کا مرکزی حصہ بنے۔

ملا عمر کی زندگی میں ان میں ان کے سخت کنٹرول کے باعث یہ سازشی ٹولہ کوئی بڑی کارروائی کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور ان کی زندگی میں یہ عمل انتہائی محدود رہا۔ اس کے بعد ملا اختر محمد منصور چونکہ ملا عمر کی زندگی میں ہی ٹیک اوور کر چکے تھے، فیلڈ کمانڈر تھے اور ملا عمر کی موت کے بعد کئی سال تک انہوں نے ملا عمر کے ترتیب دیئے گئے نظام کو اسی انداز میں چلایا کہ کسی کو شک نہ ہو سکے کہ ملا عمر موجود نہیں، یہ احتیاط بھی غالباً اسی سبب تھی کہ ملا عمر کو یہ شبہ ہو گیا تھا کہ ان کی آستینوں میں سانپ پل رہے ہیں لہٰذا اس گروپ کو کوششوں کے باوجود انہیں ملا منصور کے دور میں بھی پَر پھیلانے کا موقع نہیں ملا۔

ملا ہیبت اللہ کی کمزور اور ناتجربہ کار قیادت میں یہ گٹھ جوڑ کھل کر سامنے آ گیا۔ ان لوگوں نے ملا ہیبت اللہ کی کمزور حیثیت اور اقتدار کی ہوس سے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے ساتھ ملاتے ہوئے طالبان کی پالیسیوں کو بدل کر رکھ دیا گیا۔ پہلے جو امن اور شریعت کے لیے اٹھے تھے اب وہ آمریت، طاقت، دولت اور قبضے کی

ہوس کے اسیر بن گئے، اور جو چند مخلص بچے تھے انہیں منظر سے ہٹا دیا گیا۔ اپنے مقام سے گرنا تو دیکھیں کہ جس امریکہ کے خلاف 20 سالہ آزادی کی جنگ لڑی گئی، اسی کا فرستادہ زلمے خلیل زاد دو دہائیوں میں طالبان کے خلاف جنگ میں معین و مددگار تھا، کبھی امریکی سفیر کے روپ میں تو کبھی سی آئی اے کے ساتھ مل کر اب وہی ان کا دماغ اور ترجمان قرار پایا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج پورا خطہ دہشت گردی کی آگ میں جل رہا ہے۔

## سازش کا پہلا قدم

1990 کی دہائی میں سوویت یونین کے افغانستان سے انخلا اور وسط ایشیائی ریاستوں کی آزادی کے بعد ترکمانستان سے پاکستان تک گیس پائپ لائن کے منصوبے کے حوالے سے بین الاقوامی کمپنیوں کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ دو بڑی کمپنیاں، ارجنٹائن کی بریڈاس اور امریکی کمپنی یونوکال، آمنے سامنے آئیں لیکن خانہ جنگی اس منصوبے کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن گئی۔ طالبان 1996 میں اقتدار میں آئے تو امیدیں پھر سے روشن ہوئیں اور دونوں کمپنیاں ایک بار پھر میدان میں آ گئیں۔

## ملا عمر سے دھوکے کا آغاز

اس پائپ لائن منصوبے کی مخاصمت ہی وہ نکتہ بن گیا جس سے طالبان کے اندر امریکہ اور سی آئی کو ایجنٹ پیدا کرنے کا موقع ملا اور ملا عمر سے دھوکے کا آغاز ہوا، دوسرے لفظوں میں آج کے طالبان کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کی ابتدا ملا متقی کے دورہ امریکہ سے ہوئی، جب 1997 میں ملا محمد عمر نے انہیں امریکی آئل کمپنی یونوکال (Unocal) کی دعوت پر بات چیت کے لیے ایک وفد کے ہمراہ امریکہ بھیجا، متقی نے اس موقع کو اپنے ذاتی، سیاسی اور طویل المدتی تعلقات کے لیے استعمال کیا۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ 1996 میں طالبان نے ترکمانستان سے پاکستان تک گیس پائپ لائن کا معاہدہ ارجنٹائن کی کمپنی بریڈاس (Bridas) کے ساتھ کیا تھا مگر امریکی کمپنی یونوکال (CentGas کنسورشیم) میدان میں آ گئی اور قندھار میں دفتر کھول لیا۔ دراصل اس کمپنی کی حمایت میں امریکی حکومت اور انٹیلی جنس اپنا جال پھیلا رہی تھی۔ اس کمپنی کے دو اہلکار زلمے خلیل زاد اور رابرٹ اوکلی امریکی سی آئی اے کے مہرے تھے، جنہیں اسی مقصد یعنی طالبان کو ٹریپ کرنے کے لیے اس کمپنی میں شامل کروایا گیا تھا۔ زلمے خلیل زاد جو اس وقت رینڈ کارپوریشن کے ڈائریکٹر آف سٹریٹیجی تھے اور امریکی

فارن آفس کے ساتھ بھی قریبی روابط رکھتے تھے، انہیں یونوکال نے کنسلٹنٹ کے طور پر متعارف کروایا۔ انہوں نے طالبان کو قائل کرنے کے لیے ان کے ایک وفد کو یونوکال ہیڈ کوارٹرز آنے کی دعوت دی جیسے کہ کاروباری کمپنیاں کیا کرتی ہیں۔ مہمان وفد کی میزبانی اور خفیہ روابط کی تمام تر ذمہ داری بھی زلمے خلیل زاد ہی کی تھی۔

1997 میں یونوکال کے مکمل اخراجات پر دو طالبان وفود امریکہ گئے۔ پہلا فروری 1997 میں گیا، اس تین رکنی وفد کی قیادت ملا امیر خان متقی (وزیر اطلاعات وثقافت) نے کی۔ یہ وفد ٹیکساس میں ہوسٹن کے قریب شوگر لینڈ میں یونوکال کے ہیڈ کوارٹر پہنچا جہاں کمپنی کے نائب صدر مارٹن ملر اور دیگر سے ملاقاتیں ہوئیں جبکہ زلمے خلیل زاد کی سہولت کاری کے تحت امریکی سفارتی نمائندوں سے بھی خفیہ اور غیر رسمی ملاقاتیں ہوئیں۔ وفد نے ٹیکساس میں کارپوریٹ مہمان نوازی کا مکمل لطف اٹھایا جس میں سیر وتفریح، شاپنگ اور دیگر سرگرمیاں شامل تھیں۔

دوسرا وفد دسمبر 1997 میں قائم مقام وزیر خارجہ ملا محمد غوث کی قیادت میں گیا۔ اس میں ملا متقی، ملا دین محمد، ملا احمد جان اور دیگر شامل تھے۔ وفد نے فائیو سٹار ہوٹل میں قیام کیا، شہر کی بہترین سپر مارکیٹس میں شاپنگ کی، چڑیا گھر اور ناسا اسپیس سینٹر کا دورہ کیا۔ 4 دسمبر 1997 کو یونوکال کے نائب صدر سے رسمی ملاقات ہوئی جہاں نائب صدر مارٹن ملر کے گھر پر ڈنر ہوا اور کرسمس ٹری کے سامنے گروپ فوٹو بنوائی گئی (یہ تصویر بعد میں میڈیا میں بہت مشہور ہوئی)۔ اس دورے میں ملا امیر خان متقی، احمد جان اور دین محمد خفیہ طور پر واشنگٹن ڈی سی بھی گئے، جہاں 8 دسمبر 1997 کو امریکی اسسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ برائے جنوبی ایشیاء کارل انڈر فرتھ اور ڈائریکٹر ساؤتھ ایشیاء افیئرز مائیکل مالینوفسکی سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کی پوری تفصیل دسمبر 2001 میں ڈی کلاسیفائیڈ نیشنل سیکورٹی آرکائیو الیکٹرانک بک نمبر 97 میں ''طالبان فائلز'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ ملا متقی کی بے چینی کا ایک مظاہرہ بھی اسی دستاویز میں درج ہے کہ ''انڈر فرتھ اپنی کسی دوسری مصروفیت کے لیے اٹھ کر جانے لگے اور مزید بات چیت مائیکل مالینوفسکی کے حوالے کی تو ملا متقی نے انہیں روک لیا اور کہا ''جس طرح سوویت یونین کے خلاف آپ نے مدد کی تھی، اسی طرح آپ ہماری بھی مدد کریں''۔ امریکی دستاویزات میں کوٹ ان کوٹ میں ملا متقی کا جملہ لکھا ہوا ہے کہ انہوں نے کہا ''Lets be Friend''۔

Current Class: CONFIDENTIAL
Current Handling: n/a
Document Number: 1997STATE231842

Case Number: 200104094

"ACTING MINISTER OF MINES AND INDUSTRY" ARMAD JAN, ACTING MINISTER OF INFORMATION AND CULTURE" AMIR KHAN MOTTAQI, AND "ACTING MINISTER OF PLANNING" DIN MOHAMMED (AN ETHNIC TAJIK). (INNER SHURA MEMBER MULLAH MOHAMMED GHAUS IS IN OMAHA [redacted] DID NOT ACCOMPANY THE GROUP TO WASHINGTON.) TALIBAN "UN PERMREP DESIGNATE" MUJAHID (WHO IS ARMAD JAN'S BROTHER-IN-LAW) ACCOMPANIED THE THREE AND SERVED AS TRANSLATOR. THE GROUP DISTRIBUTED A POSITION PAPER (SEE PAPA 18 FOR TEXT). WE UNDERSTAND THE TALIBAN'S SUPREME AUTHORITY, MULLAH OMAR, ORDERED THE DELEGATION TO SEEK THIS MEETING WITH A/S INDERFURTH.

LET'S BE FRIENDS

4. (C) MOTTAQI, WHO DID MOST OF THE TALKING, EXPRESSED THE TALIBANVS WISH FOR GOOD RELATIONS WITH US. HE THANKED US FOR OUR SUPPORT DURING THE FIGHT AGAINST THE COMMUNISTS BUT WARNED THAT RUSSIAN-TRAINED AGENTS WERE STILL WORKING IN AFGHANISTAN. HE WENT ON TO DESCRIBE ATROCITIES COMMITTED BY RESISTANCE COMMANDERS AFTER THE RUSSIAN WITHDRAWAL AND







طالبان کی سینئر قیادت میں موجود ایک دوست نے بتایا کہ ملا عمر نے انہیں صرف پائپ لائن کے معاملے پر بات چیت کی اجازت دی تھی مگر ملا متقی نے ملا عمر سے چھپ کر واشنگٹن میں خفیہ ملاقاتیں کیں اور اپنے روابط مستحکم کیے۔ ان ملاقاتوں کے حوالے سے ملا متقی نے ملا عمر کو کبھی اعتماد میں نہیں لیا۔ یہ ملا عمر کے ساتھ پہلا بڑا دھوکہ تھا جس نے بعد میں طالبان کی اندرونی سیاست کو تبدیل کرنے کی بنیاد رکھی اور ملا متقی نے زلمے خلیل زاد کے ساتھ خفیہ روابط قائم کیے، ہمارے سورسز کے مطابق یہ رابطے اس دوران بھی قائم رہے جب طالبان کے خلاف امریکی جنگ جاری تھی۔

دسمبر 1997 میں ہونے والی ان ملاقاتوں کی تفصیلات بعد میں امریکی دستاویزات میں سامنے آئیں جن میں طالبان نمائندوں اور امریکی حکام کے درمیان گفتگو کی پوری تفصیل موجود ہے۔ ان ملاقاتوں میں اسامہ بن لادن، القاعدہ کی علاقائی سیاست اور ممکنہ تعاون جیسے موضوعات زیر بحث آئے۔ زلمے خلیل زاد نے بعد میں اپنے کالم میں لکھا کہ طالبان نے یقین دلایا ہے کہ وہ ایران کی طرح امریکہ کے خلاف نہیں جائیں گے۔ پبلک کیے گئے ریکارڈ کے مطابق انڈر فرتھ سے ملاقاتوں میں متقی نے کہا کہ ''اسامہ بن لادن اور ان کے ساتھیوں کی وجہ سے ہم بدنام ہو رہے ہیں۔''

دین محمد نے کہا کہ ''اگر ہم انہیں نکالیں گے تو وہ ایران چلے جائیں گے۔''

احمد جان نے وضاحت کی کہ ''ہم نے انہیں نہیں بلایا، وہ سابق حکومت کے زمانے میں آئے تھے، ہم صرف انہیں سنبھال رہے ہیں۔''

اس دستاویز کے مطابق متقی نے امریکیوں کو یقین دلایا کہ ''ہم (طالبان) نے بن لادن پر پابندیاں عائد کر دی ہیں، انہیں انٹرویو دینے اور ایران/عراق میں اپنے لوگوں سے رابطہ کرنے سے روک دیا ہے۔''

## مجموعی تاثر

یہ تمام تفصیلات اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ طالبان کی پالیسیوں اور طرزِ حکمرانی میں وقت کے ساتھ نمایاں تبدیلیاں آئیں جن کی وجوہات اور اثرات پر مختلف زاویوں سے بحث جاری ہے۔

## زلمے متقی تعلقات کا دوسرا دور

2012 میں جب امریکہ اور طالبان کے درمیان مذاکرات کی بات چیت چلی تو تمام تر لابنگ اور

کوشش کے باوجود ملا عمر نے متقی کو مذاکرات کار مقرر نہیں کیا بلکہ ملا معتصم آغا جان جو کوئٹہ شوریٰ سے منسلک تھے انہیں اپنا نمائندہ مقرر کر کے دوحہ بھیجا۔ ملا عمر کی وفات کے بعد ملا معتصم آغا جان، متقی دھڑے کے زیر عتاب آ گئے اور انہیں تبدیل کر دیا گیا، اسی دوران ملا متقی نے اپنے دوست زلمے خلیل زاد سے رابطہ کیا۔ ملا متقی کی سفارش پر زلمے خلیل زاد نے امریکی حکومت پر دباؤ ڈال کر ملا عبدالغنی برادر کو پاکستان کی جیل سے رہا کروا دیا۔ اس کے بعد زلمے خلیل زاد اور ملا برادر کے درمیان قریبی تعلقات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ ابتدا میں طالبان نے ملا برادر کو مذاکراتی ٹیم کا سربراہ مقرر کیا مگر بعد میں یہ تاثر سامنے آیا کہ وہ طالبان کے بجائے امریکی موقف کے زیادہ قریب ہیں جس پر 2020 کے آخر میں طالبان شوریٰ نے انہیں انٹرا افغان مذاکرات کے موقع پر مذاکراتی ٹیم کی سربراہی سے ہٹا دیا۔

زلمے خلیل زاد نے ملا برادر کی امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ سے براہ راست بات چیت بھی کروائی جس کے بعد ٹرمپ نے کہا تھا کہ ''مجھے طالبان کے بارے میں مختلف باتیں بتائی گئیں، یہ تو بہت اچھے لوگ ہیں''۔ یہ تعلقات اس قدر قریبی سمجھے گئے کہ بعض حلقوں نے انہیں ذاتی نوعیت کے روابط قرار دیا۔ ملا متقی اس وقت طالبان کے وزیر خارجہ ہیں اور زلمے خلیل زاد کے ساتھ ان کے تعلقات اپنی انتہا پر ہیں، ہر دوسرے مہینے زلمے کابل میں ہوتا ہے، جہاں اس کی ملا متقی اور برادر سے بے تکلفانہ ملاقاتوں کی تصاویر جاری ہوتی ہیں، زلمے ہر موقع پر ذبیح اللہ مجاہد سے بھی پہلے پاکستان کے خلاف اور طالبان کی حمائت میں عالمی میڈیا پر بیان جاری کر کے، متقی اور برادر سے دوستی کا حق ادا کرتا ہے، یہ حق دوستی یہ سمجھانے کو کافی ہے کہ موجودہ طالبان خطے میں کس کے مقاصد کی آبیاری کر رہے ہیں اور کس کی پراکسی ہیں۔

## پالیسی کا تغیر، اصول سے مفاد تک

ملا عمر کے دور میں طالبان کی پالیسی میں پاکستان دوستی اور افغانستان کی سرحدوں سے باہر کسی قسم کی شر انگیزی میں حصہ دار نہ بننے کے اصول کو مرکزی حیثیت حاصل تھی جبکہ موجودہ دور میں دہشت گردی اور پورے خطے میں بدامنی ان کی پالیسی بن چکی ہے۔ یہ تبدیلی طالبان کی اندرونی سیاست، بیرونی سازشوں اور بعض شخصیات کے کردار کی عکاسی کرتی ہے۔ ملا عمر کے دور میں امریکہ سے خفیہ روابط کو ''دھوکہ'' جبکہ

موجودہ دور میں اسے ''سیاسی حکمت عملی'' کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔اسی خفیہ کاری کا نتیجہ ہے کہ زلمے خلیل زاد طالبان کی نمائندگی کرتے ہوئے پاکستان کے خلاف نہ صرف بیانات جاری کر رہا ہے بلکہ طالبان قیادت کو پاکستان کے خلاف پلاننگ میں تعاون فراہم کر رہا ہے۔ ہفتہ وار ملنے والے ڈالر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں جو پورے خطے کو عدم استحکام کا شکار کیے ہوئے ہیں۔

## یوسف وفا کی امریکیوں سے وفاداری

حاجی محمد یوسف نیازی عرف ملا یوسف وفا سابق گورنر قندھار اور موجودہ گورنر بلخ، طالبان کی صفوں میں ایک اور اہم امریکی مہرے کی حیثیت رکھنے والی شخصیت ہے۔حکومت میں آنے پہلے یہ طالبان کے حلقوں میں کوئی بڑا نام نہیں تھا۔ وہ پاکستان کے علاقے چمن میں افغان مہاجر کے طور پر مقیم رہے۔ پیشے کے اعتبار سے تاجر ہونے کے دعویدار ہیں مگر ان کے قریبی حلقے جانتے ہیں کہ وہ پاکستان، افغانستان اور ایران کے درمیان بارڈر ٹریڈ یعنی اسمگلنگ کرتے تھے۔ اسی خصوصیت کے باعث طالبان نے انہیں سرحدی نقل و حرکت کا معاون مقرر کیا اور بعد میں 2018 میں پاک افغان سرحدی قصبے سپین بولدک کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا۔اسی دوران ملا ہیبت اللہ نے انہیں اپنی سیکیورٹی کی ذمہ داری بھی سونپی کیونکہ یہ ملا ہیبت اللہ کے قبیلے نورزئی سے تعلق رکھتے تھے۔ بارڈر پر تینوں ممالک میں آمدورفت کا نیٹ ورک رکھنے کی وجہ سے یہ مقامی امریکی کمانڈ سے بھی رابطے میں تھے اور شواہد موجود ہیں کہ بلوچستان میں دہشت گردی کرنے والے عناصر بی ایل اے وغیرہ سے بھی ان کے تعلقات تھے۔ان کا ''سامان'' ادھر سے ادھر کرنے کی خدمات انجام دینے کے باعث پاکستان دشمن تمام دہشت گرد گروپوں کے سرپرستوں سے ان کے تعلقات ثابت ہیں، جس میں بلوچ دہشت گرد کے لئے ایران و افغانستان سے اسلحہ کی ترسیل بھی شامل ہے۔ ذرائع کا دعویٰ ہے کہ امریکی انخلا کے موقع پر ان ہی روابط کی وجہ سے انہیں قندھار میں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور قندھار کے تین بڑے سرکاری اسلحہ ڈپو بڑی سہولت کے ساتھ ان کے حوالے کر دیئے گئے۔اس کے ساتھ ساتھ بلوچ دہشت گردوں کے لیے مخصوص اسلحہ کا ذخیرہ بھی ان کے ہاتھ لگ گیا۔

صرف امریکہ ہی نہیں بلکہ بھارتی را بھی یوسف وفا پر اعتماد کرتی تھی کیونکہ یہ اس کی پراکسی بی ایل اے کا سہولت کار تھا، اسی لئے نیمروز اور قندھار میں بلوچ دہشت گردوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اسلحہ کا ایک بڑا ذخیرہ بھی ان کے حوالے کر دیا گیا۔ اشرف غنی دور میں قندھار کے گورنر کے نرم رویہ اور غیر

معمولی تیز رفتار فتح کے بدلے میں ملا ہیبت اللہ نے انہیں گورنر قندھار اور اپنے سیکریٹیریٹ کا انچارج مقرر کیا، بعد میں گورنر بلخ لگا دیا گیا۔ 2024 میں طالبان نے افغانستان میں امریکہ اور نیٹو کا چھوڑا ہوا اسلحہ رکھنے کو جرم قرار دیا تو یوسف وفا کو اس حکم سے استثناء دیا گیا اور ان کے اسلحہ کے ذخائر سرکاری تحویل میں نہیں لیے گئے۔ اب بھی پاکستان دشمن دہشت گردوں کی اسلحہ کی تمام ضروریات یہی پوری کر رہا ہے۔

ملا ہیبت اللہ کے قریبی حلقے میں شامل ہونے کی وجہ سے انہیں پاکستان دشمن پالیسی پر قائل کرنے میں ملا یوسف وفا کا بنیادی کردار ہے کیونکہ پاکستان دشمنی اور سمگلنگ کا کاروبار اس کی روزی روٹی ہے۔ بی ایل اے سے یاری کے باعث یہ بھارتی حلقوں کے بھی قریب ہے اور ملا ہیبت اللہ کو بھارتی پالیسیوں کے قریب لانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

## طالبان اور بھارت تعلقات میں تبدیلی

ملا محمد عمر کی قیادت میں طالبان کی ابتدائی حکمرانی کا دور بھارت کے لیے شدید دشمنی کا زمانہ تھا۔ طالبان نے بھارت کو اپنا تاریخی دشمن سمجھا، پاکستان کی مکمل حمایت کی، کشمیر سمیت علاقائی مسائل میں بھارت مخالف پالیسیاں اپنائیں، یہاں تک کہ بھارت کی امداد کی پیشکش کو بھی مسترد کر دیا گیا۔ تاہم ہیبت اللہ اخوندزادہ کے دور میں اس پالیسی میں تبدیلی کے اثرات دیکھے گئے۔ اس تبدیلی کے پس منظر میں کئی عوامل بیان کیے جاتے ہیں، جن میں ایک اہم کردار شیر محمد عباس ستنکزئی کا ہے۔

## عباس ستنکزئی پس منظر اور کردار

شیر محمد عباس ستنکزئی کا پس منظر منفرد ہے۔ وہ سوویت دور میں افغان قومی فوج سے وابستہ رہے اور 1979 سے 1982 تک انڈین ملٹری اکیڈمی (IMA) ڈیرہ دون میں تربیت حاصل کی۔ وہ بھگت بٹالین کی کرن کمپنی میں شامل تھے، جہاں کل 45 غیر ملکی کیڈٹس تربیت پا رہے تھے۔ ان کے ہم عصر بھارتی افسروں نے انہیں ''شیرو'' کا لقب دے رکھا تھا، کیونکہ وہ دوسروں سے قدرے بڑے قد کا لگتا تھا۔ انڈین آرمی کیڈٹ کالج ڈیرہ دون میں تین سال کی بنیادی تربیت کے بعد وہ آفیسر کیڈٹ کے طور پر IMA پہنچے۔ یہ تربیت انڈو افغان تعاون پروگرام کے تحت ہوئی تھی۔

1990 میں شیر محمد عباس ستنکزئی آرمی سے فرار ہو کر مولوی نبی محمدی کی جماعت حرکۃ انقلاب اسلامی میں

شامل ہو گئے۔ 1995 میں یہ جماعت طالبان میں ضم ہو گئی تو وہ بھی طالبان کے ساتھ چلے گئے۔ طالبان کی پہلی حکومت میں وہ نائب وزیر خارجہ اور نائب وزیر صحت جیسے اہم عہدوں پر فائز رہے۔ 2001 کے بعد امریکی حملے کے خلاف مزاحمت میں بھی فعال رہے۔ 2012 میں قطر میں طالبان نے مذاکرات کی ابتدائی تیاری کے لیے وفد دوحہ بھیجا تو وہ اس کے اہم ارکان میں شامل تھے۔ امریکہ کے ساتھ مذاکرات میں مرکزی کردار ادا کیا۔ ان کی انگریزی، اردو، پشتو اور دری پر عبور نے انہیں سفارتی میدان میں ممتاز کیا۔

## بھارت کے ساتھ روابط کی بحالی

2018 میں جب طالبان اور امریکہ کے درمیان دوحہ میں مذاکرات شروع ہوئے تو ملا برادر کی قیادت میں بننے والی مذاکراتی ٹیم میں شیر محمد عباس ستنکزئی کو بھی شامل کیا گیا۔ اس وقت بھارتی را (RAW) کو یاد آیا کہ یہ شخص ان کے لیے ''کام'' کا ہے۔ بھارت نے پرانی رفاقت کو زندہ کرنے کا منصوبہ بنایا، پہلے مرحلے میں ان کے سابق کورس میٹ بھارتی افسروں کو تلاش کیا گیا۔ بھارتی میڈیا میں ستنکزئی کے سابق دوستوں کی یادیں شائع ہونے لگیں۔ میجر جنرل (ر) اے ڈی چتر ویدی نے انہیں ''اکیڈمی کا پسندیدہ لڑکا'' قرار دیا جو دوسروں سے کچھ بڑا لگتا تھا۔ اس کے ساتھ گنگا نہانے کی ایک تصویر بھی شیئر کی گئی۔ کرنل (ر) کیسر سنگھ شیخاوٹ نے بھی گنگا نہانے کے واقعے کا ذکر کیا اور اسے ''شیرو'' کہا۔ بریگیڈیئر (ر) سندیپ نے اس کی ''مخلصانہ انداز اپنانے کی خوبی'' کا تذکرہ کیا۔

یہ سب باتیں اتفاق نہیں تھیں، یہ بھارتی را کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا، طالبان میں نقب لگانے کی کوشش۔ دوسرے مرحلے میں انہی سابق دوستوں کی دوحہ آمد و رفت شروع ہوئی، پرانے روابط کو بحال کرنے پر زور دیا گیا۔ یوں پرانی محبتیں زندہ ہوئیں اور ستنکزئی طالبان میں بھارت کے غیر رسمی سفیر بن کر سامنے آئے۔ ان کی انگریزی اور سفارتی مہارت نے اس عمل کو آسان بنایا۔ اگست 2021 میں جب طالبان نے کابل پر قبضہ کیا تو دوحہ میں بھارتی سفیر دیپک متل نے ستنکزئی سے باقاعدہ ملاقات کی۔ ستنکزئی خود کہتے ہیں کہ غیر متوقع طور پر بھارتی سفیر نے انہیں فتح کابل کی مبارکباد دی اور کہا کہ ''ہم آپ کو نئی حکومت کا وزیر اعظم دیکھنا چاہتے ہیں، آپ ہمارے دوست ہیں ہمیں خوشی ہوگی''۔

ملاقات میں باہمی تعاون، انسانی امداد، بھارتی شہریوں کی واپسی اور علاقائی مفادات اور چابہار بندرگاہ پر بات چیت ہوئی۔ اس ملاقات نے راستہ ہموار کیا۔ ستنکزئی کے ذریعے بھارت کو طالبان کے دیگر

رہنماؤں سے رابطے کا موقع ملا۔ روابط بحال ہوئے اور اعتماد بڑھا جو بالآخر طالبان کو بھارتی پراکسی کے مقام تک لے گیا۔

## دوحہ ملاقاتوں کے بعد کی پیش رفت

طالبان کے کابل پر قبضے کے صرف چھ ماہ بعد مارچ 2022 میں طالبان شوریٰ کے اجلاس میں ستنکزئی نے بھارت سے دوستی کی بھرپور حمایت کی، پاکستان سے تعلقات کے تناظر میں بھارت سے الگ رہنے کے نقصانات گنوائے، بھارت سے تعلقات کے فوائد پر بات کی۔ ان کا موقف تھا کہ پاکستان طالبان کو اپنی پراکسی بنا کر رکھنا چاہتا ہے، اس سے ہم کچھ بڑا نہیں کر سکیں گے۔ دوسرا یہ کہ خود پاکستان کو بھارت عالمی سطح پر تنہا کرنے جا رہا ہے، پاکستان ہمیں دنیا کے سامنے کس طرح سے منوا سکتا ہے، بھارت سے تعلقات کا یہ فائدہ ہوگا کہ ہم پر پاکستان کا ایجنٹ ہونے کا الزام ختم ہوگا، مغربی دنیا میں ہمیں ویلکم کیا جائے گا۔ بھارت بڑا ملک ہے، ہمیں اس کے ساتھ جانا چاہئے۔ اجلاس میں موجود ایک ذریعہ نے بتایا کہ ستنکزئی کے الفاظ تھے کہ ''یہ بھارت کا بڑا پن ہے کہ وہ ہمیں تعلقات کی دعوت دے رہا ہے، اور یہ سب میری وجہ سے ممکن ہوا ہے۔'' یہ لابنگ مؤثر ثابت ہوئی اور ایرانی لابی کی شہرت رکھنے والے گروپ نے بھی ان کی حمایت کی۔ یوں ہیبت اللہ اخوندزادہ کی حکومت اور بھارت کے درمیان گٹھ جوڑ کا راستہ کھلا، ستنکزئی اور ان کے ساتھیوں نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ستنکزئی نے بھارت سے اپنی پرانی وابستگی کا اس موقع پر بھرپور استعمال کیا اور طالبان قیادت کو باور کرایا کہ اگر بھارت سے تعلقات اچھے کر لیے جائیں تو پاکستان کی محتاجی ختم ہو جائے گی۔ ملا ہیبت اللہ کے ساتھ ستنکزئی کی ایک ملاقات میں موجود دوست کے بقول ستنکزئی نے دلائل دیے کہ ''پاکستان طالبان کو اپنی پراکسی بنا کر رکھنا چاہتا ہے، ہم ان کی ڈکٹیشن سے آزاد ہو سکتے ہیں۔''

2023 میں کابل کے سفر کے دوران ہمیں بتایا گیا کہ ''پاکستان افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کے حوالے سے مسائل پیدا کر رہا ہے، اگر باز نہ آیا تو ہم اپنی پوری ٹرانزٹ ٹریڈ ایران میں چاہ بہار سے منسلک کر لیں گے، بھارت ہمیں بے شمار رعایتیں دے رہا ہے۔'' یہ بھی معلوم ہوا کہ بھارت انہیں اکسا رہا تھا کہ یہ پاکستان کی وسط ایشیاء سے تجارت روکیں اور مطالبہ رکھیں کہ پاکستان واہگہ سے افغانستان تک بھارتی ٹرانسپورٹ کو آنے کی اجازت دے تو افغانستان راستے کھولے گا۔'' ہمارے اسی سفر میں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ تمام پیشکش ستنکزئی کے ذریعے سے کی جا رہی تھی۔

ایک جانب ستنکزئی بھارتی نمائندہ بنا ہوا تھا تو دوسری جانب یوسف وفا کی حمایت بھی اسے حاصل ہوگئی کیونکہ وہ بی ایل اے والے معاملے میں بھارتی را سے رابطوں میں تھا۔ ایک تیسرا گروپ بھی تھا جو ستنکزئی کے معاون کے طور پر سامنے آیا، اسے طالبان میں ایرانی لابی کا نام دیا جاتا ہے۔ ستنکزئی نے نہ صرف شوریٰ میں لابنگ کی بلکہ عوامی سطح پر بھی بھارت دوست بیانات دیے اور طالبان کو مکمل طور پر بھارت کی ایک پراکسی بنانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اسی غیر ضروری اعتماد میں آکر ہیبت اللہ کی پالیسیوں پر بھی تنقید کرنا شروع کردی، جس پر بعد میں انہیں عہدے سے ہٹا دیا گیا اور ملک سے فرار ہونا پڑا۔

## ملا ابراہیم صدر گروپ

بھارت سے روابط اور دہشت گردی کی سرپرستی جیسے معاملات میں امریکہ کے خلاف جنگ کے دوران ایران میں قیام پذیر کمانڈروں کا کردار بھی کم اہم نہیں۔ اس گروپ میں طالبان کے قندھار گروپ کے 4 طاقتور کمانڈر شامل ہیں، جن کی قیادت ملا ابراہیم صدر کر رہے ہیں۔

ملا ابراہیم صدر کی پیدائش 1960ء میں ہلمند میں ہوئی۔ سابقہ طالبان دور میں وہ نائب وزیرِ دفاع رہے اور 2014 کے بعد چار سال تک فوجی کمیشن کے سربراہ رہے۔ سوویت جنگ کے دوران چار سدہ آیا اور یہاں ایک مدرسہ میں پڑھاتا رہا۔ 2016 میں پشاور میں اس کی ٹی ٹی پی کو طالبان کا اسلحہ فراہم کے حوالے سے اس کی مشکوک سرگرمیوں پر انتباہ کیا گیا تو یہ ایران فرار ہوگیا۔ اس کے بعد یہ کبھی پاکستان نہیں آیا، حالانکہ اس کی فیملی پاکستان میں ہی رہی۔ جن سرگرمیوں کی وجہ سے اسے پشاور سے بھاگنا پڑا، وہ ایران میں بھی جاری رکھنے کی کوشش کی، اطلاع ملنے پر ہیبت اللہ نے 2018 میں اسے طالبان ملٹری کمیشن کی قیادت سے الگ کردیا، جس پر اس نے الزام عائد کیا کہ اس کے خلاف یہ کارروائی پاکستان کے دباؤ پر کی گئی ہے۔

اسی عرصے میں ملا عبدالقیوم، حاجی نجیب اللہ ذاکر اور پیر آغا بھی اس کے ساتھ شامل ہوگئے اور ایران منتقل ہوگئے۔ یہی گروپ تھا جس نے 2019 میں طالبان کے امریکہ کے ساتھ مذاکرات کو مسترد کرتے ہوئے ایران میں ''حزبِ ولایتِ اسلامی'' کے نام سے ایک نئی تنظیم بھی بنائی لیکن اسے پذیرائی حاصل نہیں مل سکی۔ ایران میں اپنے اسی قیام کے دوران ملا ابراہیم سے زاہدان کے بھارتی قونصل خانے میں تعینات بھارتی ایجنسی را کے افسروں نے رابطہ کیا، جس کے نتیجے میں موصوف نے کئی بار اپنے علاج کے

نام پر دہلی کا سفر بھی کیا۔

مارچ 2022 میں طالبان شوریٰ کے اجلاس میں سنتکزئی نے جب بھارت سے تعلقات کی بات چھیڑی تو یہی گروپ تھا جس نے دل کھول کر اس کا ساتھ دیا، صرف ایک ماہ بعد اپریل 2025 میں ابراہیم صدر ایک بار پھر بیمار ہوئے اور علاج کے بہانے دہلی جا پہنچے، جہاں مہینے سے زیادہ عرصہ زیرِ علاج رہے۔ موصوف کو یوسف وفا کی حمایت بھی حاصل ہو چکی ہے، اس وجہ سے یہ ہیبت اللہ کے قریب ہے۔ وزیرِ داخلہ سراج حقانی پر نظر رکھنے کی خاطر اسے نائب وزیرِ داخلہ بنایا گیا ہے لیکن وہ بہت کم کابل میں دکھائی دیتا ہے، اس کا زیادہ وقت زاہدان اور دہلی میں گزرتا ہے۔ وہ نہ صرف افغانستان میں پاکستان کے اثر و رسوخ کے مخالف ہیں بلکہ پاکستان سے معمول کے تعلقات کے بھی مخالف سمجھے جاتے ہیں۔ وہ خطے میں پاکستان مخالف قوتوں کے ساتھ روابط مضبوط کرنے کے حامی ہیں تاکہ پاکستان کے اثر و رسوخ کو متوازن کیا جا سکے۔

## آپریشن سندور کے دوران ملا ابراہیم صدر کا کردار

بھارت کی جانب سے مئی 2025 وہ ٹرننگ پوائنٹ تھا، جب طالبان کھل کر بھارت کی گود میں جا بیٹھے۔ اس میں ملا صدر کا کردار سب سے اہم تھا۔ 22 اپریل کو بھارت نے پہلگام میں فالس فلیگ دہشت گردی سرانجام دیا اور الزام پاکستان پر عائد کیا تو، اس کے صرف 5 دن بعد 27 اپریل 2025 کو بھارتی سیکریٹری خارجہ کا دورۂ کابل انتہائی اہمیت کا حامل اور الارمنگ تھا، اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگا لیں کہ اس کے صرف ایک ہفتہ بعد 3 مئی کو ملا ابراہیم صدر دہلی میں موجود تھے، یعنی بھارت کے پاکستان کے خلاف 7 مئی کے جارحانہ اقدام سے عین پہلے، چونکہ اس دورے سے کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں ہوئی، اس لیے بھارت نے ابتدائی طور پر خاموشی اختیار کی۔

دوسری جانب طالبان حکومت نے پاکستان کی آپریشن بنیان مرصوص میں کامیابی کو دیکھتے ہوئے پینترا بدلا اور فوری طور پر پاکستان اور چین کو یقین دہانی کرائی کہ ''افغانستان میں بھارت کا کردار صرف سفارتی سطح تک محدود رہے گا۔'' پاکستان کو اصل صورتحال کا علم تھا، لیکن اسکے باوجود وزیر خارجہ اسحٰق ڈار کابل گئے اور سہ فریقی اجلاس میں شرکت کی، طالبان کو یوں ہاتھ سے پھسلتا دیکھ کر بھارت تلملایا اور اس نے ملا ابراہیم صدر کے دورے کی خبر لیک کر دی۔ جس پر طالبان شوریٰ میں بحث بھی ہوئی۔ سوال کیا گیا کہ اس موقع پر

ابراہیم صدر نے بھارت کا خفیہ دورہ کیوں کیا؟ اس معاملہ پر ہیبت اللہ نے وضاحت کی کہ وہ جگر کا علاج کرانے گئے تھے۔ یہ وضاحت درست ہونے کے باوجود مکمل حقیقت نہیں تھی۔ یہ سچ ہے کہ ملا ابراہیم صدر کو جگر کی بیماری ہے اور وہ تہران میں علاج کروا رہے تھے۔ ایرانی اسپتال نے ان کا چیک اپ دہلی میں کروایا کیونکہ علاقائی ممالک کے مقابلے میں انڈیا میں جگر کا علاج نسبتاً سستا ہے۔ ہماری اطلاع یہ ہے کہ ابراہیم صدر نے دہلی کا یہ سفر صرف ملا ہیبت اللہ کی اجازت سے ہی نہیں کیا، بلکہ ملا ہیبت اللہ نے اسے مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ بھارتیوں سے پاکستان کے خلاف باہمی تعاون پر بات چیت بھی کرے کیونکہ اس وقت پاکستان دہشت گردی کے الزامات کی وجہ سے پھنسا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ملا ہیبت اللہ، ابراہیم صدر اور یوسف وفا کا خیال تھا کہ یہ مناسب وقت ہے کہ بھارت کو پاکستان کے خلاف تعاون کی پیشکش کی جائے اور اس سے فوائد حاصل کیے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ملا ہیبت اللہ خود بھی اپنی پاکستان مخالف پالیسیوں کے لیے عالمی اتحادی تلاش کر رہے تھے اور بھارت ان کی پہلی ترجیح تھا۔

ابراہیم صدر کا طبی بنیادوں پر دورۂ دہلی اس موقع پر موزوں ثابت ہوا۔ ملا ابراہیم صدر کی خواہش پر اجیت ڈوول نے دہلی میں اس سے ملاقات کی اور پاکستان کے خلاف عملی اقدامات پر اتفاق کیا، لیکن چونکہ بھارت ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا، انہیں طالبان کی پیشکش کی زیادہ پروا نہیں ہوئی۔ بھارت کا خیال تھا کہ ہم پاکستان کو اڑا کر رکھ دیں گے، طالبان کی کیا ضرورت، بعد میں جب پاکستان نے تمام تدبیریں الٹ ڈالیں اور طالبان بھی ہاتھ سے نکلتے محسوس ہوئے تو انہیں گراں گزرا اور خبر لیک کر کے دوبارہ تعلقات بحال کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

## پاک بھارت جنگ اور طالبان کی منافقت

حیرت انگیز طور پر ایک جانب ملا ہیبت اللہ پاکستان کے خلاف بھارت سے پیغام رسانی کر رہے تھے تو دوسری جانب شوریٰ کے دباؤ پر ملا متقی کو ہدایت کی کہ وہ پاکستان اور چین کو یقین دہانی کرائیں کہ ''بھارت سے افغان طالبان کے تعلقات صرف سفارتی سطح تک محدود رہیں گے۔'' اگرچہ پاکستان اس دورے کی حقیقت سے واقف تھا، تاہم اس نے کوئی سخت سرکاری ردعمل نہیں دیا۔ ذرائع کا دعویٰ ہے کہ یہی وقت تھا جب بھارتی حکومت نے طالبان اور افغانستان کے اندر اپنی پراکسیز کو پاکستان کے خلاف مزید جارحانہ طور پر استعمال کرنے کی حکمت عملی تیار کی، جس کے تحت ٹی ٹی پی جیسے دہشت گرد گروپس کے ساتھ سے پہلے

موجود روابط مزید مستحکم اور متحرک کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس سے قبل 27 اپریل کو بھارتی خارجہ سیکریٹری کا کابل کا دورہ بھی اہم ترین پیش رفت تھی، جو پہلگام حملے (22 اپریل) کے صرف پانچ دن بعد ہوا۔ انہوں نے طالبان حکومت کو ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ اپریل کے آخر میں بھارت کے افغانستان کے لیے خصوصی نمائندے نے بھی دوحہ میں ملا متقی سے ملاقات کی اور پاکستان کے خلاف مکمل تعاون کی پیشکش کی، اور پہلگام حملے میں پاکستان کو موردِ الزام ٹھہرانے کی حمایت کا مطالبہ کیا۔ ایک اور اہم رابطہ 15 مئی 2025 کو ہوا، جب بھارتی وزیر خارجہ ایس جے شنکر نے طالبان کے وزیر خارجہ امیر خان متقی سے فون پر بات کی۔ جے شنکر نے متقی سے کہا کہ بھارت طالبان سے تعلقات مضبوط کرنے کے لیے ''جو بھی ضروری ہوا، کرنے کو تیار ہے''۔ انہوں نے براہِ راست انسانی امداد، معاشی تعاون بڑھانے، ایران کے اسٹریٹجک بندرگاہ چابہار تک آزادانہ رسائی، اور پاکستان سے نکالے گئے افغان مہاجرین کے لیے امداد کی پیشکش بھی کی۔ تاہم، یہ تمام سہولتیں پاکستان کے خلاف اقدامات سے مشروط تھیں۔

## زوال کی داستان کا سبق

طالبان کی موجودہ صورتِ حال کو اگر ٹھنڈے دل و دماغ سے دیکھا جائے تو اسے محض ایک ''تبدیلی'' کہنا کافی نہیں۔ یہ دراصل ایک ہمہ جہت نظریاتی زوال اور طاقت کی بے قابو ہوس کی کہانی ہے۔ جو گروہ کبھی ایک سخت نظم و ضبط، مرکزی قیادت اور واضح نظریاتی بنیاد پر کھڑا تھا، وہ اب اقتدار کے گرد جمع مفادات کے اسیروں کے ٹولے کا ہتھکنڈا بن گیا ہے۔ ہیبت اللہ کے دور میں سب سے نمایاں تبدیلی یہی ہے کہ قیادت کی گرفت کمزور ہوئی ہے۔ یہ کمزوری محض انتظامی نہیں بلکہ فکری اور اخلاقی بھی ہے۔ جب قیادت واضح سمت دینے میں ناکام ہو جائے اور دوسروں کی رہنمائی کرنے کے بجائے خود ہی مفاد پرستوں کے نرغے میں پھنس جائے تو طاقت خود بخود بکھر کر رہ جاتی ہے۔ یہی یہاں ہوا۔ مختلف کمانڈر، علاقائی گروپ اور مفاداتی حلقے اپنے اپنے دائرے میں خود مختار ہوتے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ طالبان اب ایک مرکز سے چلنے والی تحریک نہیں رہے بلکہ طاقت کے کئی چھوٹے مراکز میں تقسیم ہو گئے ہیں۔

یہ بکھراؤ صرف تنظیمی مسئلہ نہیں بلکہ پالیسی پر بھی براہِ راست اثر انداز ہوا ہے۔ ہر دھڑا اپنی ترجیحات رکھتا ہے۔ کچھ عناصر اب بھی مذہبی بیانیے کو بنیاد بناتے ہیں، مگر ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو طاقت، دولت اور بقا

کی سیاست کا کھیل کھیل رہا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو اقتدار پر قابض ہے اور اس نے طالبان کی سمت بدل دی ہے۔ مفادات کی خاطر طاقتوروں کی غلامی اور ہمیشہ سے تخریبی قوتوں کو موقع دینے کا نتیجہ ہے کہ افغانستان ایک بار پھر بڑی طاقتوں کے مفادات کا میدان بنا ہوا ہے۔ امریکہ کے جانے کے بعد جہاں پاکستان اور چین کی مدد سے توانائی کے منصوبوں، راہداریوں کی سہولت اور طالبان حکومت کی قانونی حیثیت منوانے کی سفارتی جنگ شروع کی جا چکی تھی، خود طالبان کے اندر سے دھڑوں نے دشمن قوتوں سے ساز باز کر کے ان دوستوں کی پشت پر وار کر دیا، جو انہی کے لیے دنیا سے لڑ رہے تھے، جس کی وجہ سے انہیں آزادی اور کامیابی ملی۔

مفادات کی اس کشمکش نے طالبان کو ایک ایسے کھیل میں دھکیل دیا ہے، جہاں اصولوں سے زیادہ سودے بازی اہم ہوگئی۔ ایسے ماحول میں وہ عناصر مضبوط ہوتے جا رہے ہیں جو بیرونی طاقتوں کے ساتھ معاملات کرنے اور ان کی جنگ لڑتے ہوئے دہشت گردی کا بازار گرم کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

طالبان کی اس کایا پلٹ سے صرف پاکستان اور خطے کا امن ہی تباہ نہیں ہوا بلکہ آج طالبان کے اندر بھی واضح دھڑے بندی نظر آ رہی ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو ماضی کے سخت گیر نظریاتی فریم ورک کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، دوسری طرف وہ گروہ ہیں جو سودے بازی کرنے اور ہر حال میں مال کمانے کے قائل ہیں۔ اس تقسیم نے نہ صرف پالیسی کو غیر مستقل بنایا بلکہ اعتماد کو بھی ختم کر دیا۔ اب کوئی ایک مؤقف یا حکمتِ عملی پائیدار نہیں رہتی۔

اس کا سب سے خطرناک پہلو ترجیحات کی تبدیلی ہے۔ ماضی میں طالبان کا بنیادی ہدف اقتدار کا حصول تھا مگر اب اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے ہر ممکن ذریعہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس میں مالی وسائل کا حصول مرکزی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ جب ریاستی ڈھانچہ کمزور ہو اور نگرانی کا مؤثر نظام موجود نہ ہو تو اقتدار خود ایک کاروبار بن جاتا ہے۔ یہی صورتحال افغانستان میں نظر آتی ہے۔

آج کا طالبان نظام ایک گنجلک اور غیر متوازن ڈھانچہ ہے۔ ہر دھڑے کو یہ خدشہ ہے کہ یہ بندوبست زیادہ دیر نہیں چلے گا۔ اسی خوف نے لوٹ مار اور وسائل سمیٹنے کی دوڑ کو جنم دیا ہے۔ اقتدار کو وقتی سمجھ کر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی سوچ غالب آ چکی ہے۔ اس ماحول میں قانون، انصاف یا عوامی مفاد کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہتی۔ بظاہر قندھار کا مرکزی دھڑا ایک حد تک متحد دکھائی دیتا ہے، خاص طور پر طاقت کے

استعمال اور کنٹرول کے معاملے میں، مگر اندرونی سطح پر یہی گروپ ایک دوسرے کے خلاف بھی برسرِ پیکار ہیں۔ یہ کشمکش کھل کر سامنے نہیں آتی، لیکن پالیسی کے تضادات اور فیصلوں کی غیر یقینی کیفیت اس کی واضح علامت ہے۔ اس سارے عمل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ طالبان کی ابتدائی شناخت تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ اس کی جگہ ایک ایسا نظام آ چکا ہے جس میں طاقت، خوف اور مفاد بنیادی عناصر ہیں۔ طالبان کی اس کایا پلٹ کو اگر ایک جملے میں سمیٹا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک نظریاتی تحریک سے مفاداتی اقتدار تک کا سفر ہے۔ اس سفر میں اصول پیچھے رہ گئے اور طاقت آگے نکل گئی۔ اس سطح پر اخلاقیات، قانون، شریعت یا کوئی بھی مہذب حوالہ ان کے لیے محض ایک لفظ ہے۔ طالبان کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل نہیں کہ وہ ایک نازک موڑ پر کھڑے ہیں، جہاں ہر فیصلہ ان کے مستقبل کی سمت متعین کر رہا ہے۔ اس اہم موڑ پر استعمال تو کوئی بھی کر سکتا ہے، لیکن اصلاح ممکن نہیں۔ حل صرف ایک ہے کہ اندر سے کوئی طاقتور گروپ اٹھے، جو مفاد پرست ٹولے سے نظم و ضبط چھین لے، لیکن یہ ایک نئی خانہ جنگی کی ابتدا ہوگی، مزید خون بہے گا، بدامنی ہوگی۔ مسئلہ صرف پاکستان کا نہیں ہے، خطے کے تمام ممالک کو سوچنا ہوگا، متحد ہو کر کوئی حل نکالنا پڑے گا، ورنہ منتشر اور دہشت گردوں کی آماجگاہ بنا ہوا افغانستان پورے خطے کو خون کے آنسو رلاتا رہے گا۔

## پاکستان جنگ پر مجبور کیوں ہوا؟

ہیبت اللہ رجیم کی خود پسندی اور بے تدبیری کی حد یہ ہے کہ وہ پاکستان جس نے نصف صدی تک 50 لاکھ سے زائد افغانوں کی میزبانی کی، انہیں اپنے وسائل میں شریک کیا، عالمی طاقتوں کے خلاف ان کی جنگ میں ساتھ دیا، سفارتی اور اقتصادی نقصانات اٹھائے، اس رجیم نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ افغان سرزمین پر دہشت گردی کے خلاف مسلح کارروائی کرے۔ طالبان کے ساتھ پاکستان کا تعلق ہمیشہ محض سیاسی یا تزویراتی نہیں رہا بلکہ اس میں انسانیت کے ناطے درپردہائیوں سے جنگ کی صعوبتوں کا افغان شہریوں سے ہمدردی، خطے میں امن کی خواہش اور دہشت گردی کے خلاف مشترکہ ذمہ داریوں کی امید کا عنصر بھی شامل رہا ہے۔ پاکستان نے ہر مشکل مرحلے پر اس تعلق کو نبھانے کی کوشش کی، افغان عوام اور طالبان دونوں کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے اور ہر بحران میں مفاہمت اور تعاون کا راستہ اختیار کیا۔ افغان جہاد کے زمانے سے لے کر طالبان کی پہلی حکومت اور پھر 2021 میں ان کی دوبارہ اقتدار میں واپسی تک پاکستان نے مسلسل یہ کوشش کی کہ افغانستان میں استحکام قائم رہے، خانہ جنگی نہ ہو اور افغان سرزمین کسی بڑے علاقائی تصادم کا مرکز نہ بنے۔ لاکھوں افغان مہاجرین کو پناہ دینا صرف ایک سفارتی یا وقتی سیاسی فیصلہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک ایسا انسانی اور تاریخی بوجھ تھا جسے پاکستان نے دہائیوں تک اپنے وسائل پر برداشت کیا۔

پاکستان کے شہروں، بازاروں، تعلیمی اداروں اور اسپتالوں میں افغان شہریوں کو وہ سہولتیں ملتی رہیں جو دنیا کے بہت کم ممالک اتنے طویل عرصے تک فراہم کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کے عوام اور ریاست دونوں کے ذہن میں ہمیشہ یہ تصور موجود رہا کہ افغانستان کے ساتھ تعلقات محض سرحدی سیاست کا معاملہ نہیں بلکہ ایک مذہبی، ثقافتی، تاریخی اور انسانی رشتہ بھی ہیں لیکن طالبان قیادت خصوصاً ہیبت اللہ رجیم، نے اس تعلق کی نزاکت اور پاکستان کی مسلسل قربانیوں کو سمجھنے کے بجائے اسے اپنی تزویراتی برتری سمجھ لیا۔

انہیں یہ غلط فہمی لاحق ہوگئی کہ پاکستان ہر قیمت پر تحمل کا مظاہرہ کرتا رہے گا اور کابل وقندھار کی جانب کبھی سخت عسکری ردعمل اختیار نہیں کرے گا۔ کئی دہائیوں تک پاکستان کے صبر، سفارتی نرمی اور مسلسل مفاہمانہ رویے نے طالبان کے اندر یہ احساس پیدا کر دیا کہ وہ پاکستان کے سلامتی کے خدشات کو مسلسل نظر انداز کرنے کے باوجود کسی سنجیدہ ردعمل سے محفوظ رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ٹی ٹی پی کے دہشت گرد افغان سرزمین پر دوبارہ منظم ہونے لگے، جب خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں دہشت گرد حملوں میں اضافہ ہوا، جب پاکستانی فوجی تنصیبات اور شہری اہداف کو مسلسل نشانہ بنایا جانے لگا، تب بھی طالبان حکومت نے نہ صرف اس مسئلے کو سنجیدگی سے لینے سے گریز کیا بلکہ اکثر اوقات ایک غیر ذمہ دارانہ اور ہٹ دھرمی پر مبنی رویہ اختیار کیے رکھا۔ پاکستان کی جانب سے بارہا انٹیلی جنس معلومات فراہم کی گئیں، اعلیٰ سطحی وفود کابل بھیجے گئے، سرحدی کشیدگی کے باوجود سفارتی رابطے جاری رکھے گئے، مگر طالبان حکومت مسلسل یہ مؤقف دہراتی رہی کہ افغان سرزمین کسی کے خلاف استعمال نہیں ہو رہی حالانکہ زمینی حقائق، گرفتار دہشت گردوں کے بیانات، انٹیلی جنس رپورٹس اور سرحد پار حملوں کا تسلسل اس دعوے کی نفی کرتا رہا۔ طالبان قیادت نے نہ صرف پاکستان کے تحفظات کو نظر انداز کیا بلکہ بعض مواقع پر ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دانستہ طور پر وقت گزاری اور مبہم بیانات کے ذریعے صورتحال کو طول دینا چاہتے ہوں۔

## سفارتکاری کا لاحاصل سلسلہ

پاکستان ایک طویل عرصے تک اس امید کے ساتھ صبر کرتا رہا کہ طالبان اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کریں گے اور دونوں ممالک کے تعلقات کو تصادم کے بجائے تعاون کی طرف لے جائیں گے۔ اسلام آباد نے عالمی دباؤ کے باوجود طالبان حکومت سے رابطے ختم نہیں کیے، انہیں مکمل سفارتی تنہائی میں دھکیلنے کے بجائے مسلسل انگیج رکھنے کی کوشش کی اور کئی مواقع پر بین الاقوامی فورمز پر بھی افغانستان کے انسانی بحران کو اجاگر کیا لیکن طالبان کی سخت گیر قیادت نے پاکستان کے اس طرزِ عمل کو خیر سگالی کے بجائے کمزوری سمجھا۔ ان کے رویے سے مسلسل یہ تاثر ابھرتا رہا کہ وہ پاکستان کے سلامتی کے خدشات کو محض وقتی دباؤ تصور کرتے ہیں اور انہیں یقین ہے کہ پاکستان مغربی سرحد پر کسی بڑے تصادم کا خطرہ مول نہیں لے گا۔ یہی غلط اندازہ رفتہ رفتہ ایک خطرناک غرور میں تبدیل ہو گیا۔

ہیبت اللہ رجیم نے پاکستان کے تحمل، صبر اور مسلسل سفارتی رویے کو کمزوری سمجھ لیا اور شاید یہ بھول گیا کہ

ریاستیں دوستی اور برادرانہ تعلقات کے باوجود اپنی سلامتی پر سمجھوتہ نہیں کرتیں۔ جب کسی ملک کے شہری مسلسل دہشت گردی کا نشانہ بنیں، اس کے فوجی جوان شہید ہوں اور اس کی سرزمین کے خلاف منظم کارروائیاں جاری رہیں تو پھر پالیسی تبدیل ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ پاکستان نے افغانستان کی اس خوش فہمی کا علاج اچھی طرح سے کر دیا ہے۔ یہ صرف ایک عسکری پیغام نہیں تھا بلکہ ایک واضح سیاسی اور تزویراتی اعلان بھی تھا کہ اب پاکستان اپنی سلامتی کے معاملے میں مزید ابہام یا غیر یقینی برداشت نہیں کرے گا۔ اس تبدیلی نے نہ صرف طالبان قیادت بلکہ پورے خطے کو یہ احساس دلایا کہ پاک افغان تعلقات اب صرف جذباتی نعروں، مذہبی وابستگیوں یا ماضی کی قربانیوں کی بنیاد پر نہیں چل سکتے۔ اب تعلقات کی بنیاد باہمی ذمہ داری، سرحدی نظم وضبط، اور دہشت گردی کے خلاف عملی اقدامات ہوں گے۔ ہیبت اللہ رجیم وہ کرنے میں کامیاب ہو گیا جو سوویت یونین اور بھارت نصف صدی کی کوششوں کے باوجود ناکام رہے۔

## طالبان کی واپسی اور پاکستان کی ابتدائی توقعات

15 اگست 2021 کو افغانستان میں طالبان کی دوبارہ اقتدار میں واپسی کے بعد پاکستان اور افغانستان کے درمیان کم از کم 250 مرتبہ رسمی اور غیر رسمی سفارتی روابط قائم ہوئے۔ ان روابط میں اعلیٰ سطحی سفارتی وفود، انٹیلی جنس مذاکرات، فوجی فلیگ میٹنگز، کثیر الجہتی کانفرنسیں، اور بین الاقوامی ثالثی کے ذریعے طے پانے والے معاہدے شامل تھے، جبکہ 849 مرتبہ سفارتی سطح پر احتجاجی مراسلہ دیا گیا۔ اس پورے عرصے کی بنیادی کہانی ایک ہی مرکزی مسئلے کے گرد گھومتی رہی: افغان طالبان کی جانب سے تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کے اُن دہشت گردوں کے خلاف کارروائی نہ کرنا یا نہ کر پانا، جو افغان سرزمین پر موجود رہے۔ ہر جنگ بندی بالآخر ٹوٹ گئی، ہر وفد قابلِ عمل ضمانتوں کے بغیر واپس آیا۔ صرف اکتوبر 2025 کا دوحہ معاہدہ ایک جزوی استثنا ثابت ہوا، جس میں پہلی مرتبہ قطر اور ترکی جیسے بیرونی ضامن شامل ہوئے اور ایک ایسی جنگ بندی وجود میں آئی جو مئی 2026 تک، اگرچہ نازک حالت میں، برقرار رہی۔

پاکستان اور افغانستان کے درمیان 2670 کلومیٹر طویل بین الاقوامی سرحد ساتھ واقع ہے، اور یہ دنیا کی سب سے زیادہ غیر محفوظ سرحدوں میں شمار ہوتی ہے۔ اگست 2021 میں طالبان کے اقتدار سنبھالنے کے بعد اسلام آباد میں محتاط امید پیدا ہوئی، کیونکہ پاکستان کی مختلف حکومتوں کے طالبان قیادت کے ساتھ غیر رسمی روابط موجود رہے تھے۔

پاکستان کو توقع تھی کہ طالبان حکومت سرحدی سلامتی، تجارت، اور افغانستان سے پاکستان میں حملے کرنے والے ٹی ٹی پی دہشت گردوں کے خلاف تعاون کرے گی۔ تاہم یہ توقعات جلد ہی مایوسی میں بدل گئیں۔ 2021 سے 2026 کے درمیان پاکستان، خصوصاً خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں، ٹی ٹی پی کے حملوں میں نمایاں اضافہ ہوا۔ طالبان حکومت مسلسل یہ انکار کرتی رہی کہ وہ ٹی ٹی پی کو پناہ گاہیں فراہم کر رہی ہے، جبکہ پاکستان کی سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ اس کے برعکس انٹیلی جنس شواہد پیش کرتی رہی۔ یہی بنیادی اختلاف ہر مذاکراتی دور کی بنیاد بھی بنا اور اکثر انہی مذاکرات کے ناکام ہونے کی وجہ بھی۔

## ابتدائی سفارتی روابط اور اعتماد سازی کی کوششیں

15 اگست 2021 کو طالبان کے کابل پر قبضے کے چند گھنٹوں کے اندر پاکستان نے متعدد سفارتی رابطے فعال کر دیے۔ دفترِ خارجہ نے کابل میں پاکستانی سفارت خانے کے ذریعے طالبان نمائندوں سے رابطہ کیا، جبکہ وزیرِ اعظم عمران خان نے دوحہ میں طالبان رہنماؤں سے ٹیلیفونک گفتگو کی۔ پاکستان نے امریکا اور اقوام متحدہ کے ساتھ انخلا کے معاملات میں بھی تعاون کیا۔ یہ اگرچہ کوئی باضابطہ معاہدہ نہیں تھا، مگر تعلقات کے ایک نئے مرحلے کا آغاز ضرور تھا۔ تاہم طالبان کی غیر نمائندہ اور مکمل مردوں پر مشتمل کابینہ کی تشکیل اور ٹی ٹی پی کے خلاف کارروائی نہ کرنے کے باعث پاکستان کی ابتدائی امیدیں تیزی سے دم توڑنے لگیں، اور 2022 کے آغاز تک اسلام آباد کی خوش فہمی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔

### پہلا رابطہ

4 ستمبر 2021 کو اُس وقت کے ڈی جی آئی ایس آئی لیفٹیننٹ جنرل فیض حمید پاکستانی فوجی طیارے کے ذریعے کابل پہنچے۔ سرینا ہوٹل میں طالبان قیادت سے ہونے والی ان کی ملاقاتیں خاصی توجہ کا مرکز بنیں، اور نیلے بلیزر میں ان کی آرام دہ انداز کی تصاویر کو طالبان پر پاکستان کے اعتماد کی علامت قرار دیا گیا۔ ان مذاکرات میں حکومت سازی، سرحدی امور، اور سکیورٹی تعاون زیرِ بحث آئے۔ اس دورے نے ابتدائی طالبان کابینہ کی تشکیل میں کردار ادا کیا، مگر اس کے باوجود کوئی تحریری معاہدہ سامنے نہ آ سکا۔ وقت گزرنے کے ساتھ طالبان دیگر علاقائی طاقتوں کے قریب ہوتے گئے اور پاکستان کا اثر و رسوخ کم ہونا شروع ہو گیا۔ 2022 کے وسط تک طالبان نے ٹی ٹی پی کے خلاف پاکستان کی اکثر درخواستوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔

## علاقائی سفارت کاری اور سکیورٹی تعاون کی ناکام کوششیں

20 اکتوبر 2021 کو پاکستان نے اسلام آباد میں چین، روس، ایران اور وسطی ایشیائی ممالک کے انٹیلی جنس سربراہان اور سفارتکاروں کی ایک کثیر الجہتی کانفرنس منعقد کی۔ اس وقت کے ڈی جی آئی ایس آئی فیض حمید نے اجلاس کی صدارت کی جبکہ طالبان حکام نے بالواسطہ شرکت کی۔ مذاکرات منظم اور باضابطہ تھے اور انٹیلی جنس شیئرنگ کے طریقۂ کار پر توجہ مرکوز رہی۔ اجلاس کے اختتام پر ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا جس میں افغان سرزمین کو دہشت گردی کے لیے استعمال نہ ہونے دینے پر اتفاق کیا گیا، لیکن اس کے نفاذ کے لیے کوئی عملی نظام قائم نہ کیا جا سکا۔ چند ماہ بعد علاقائی طاقتیں دوبارہ طالبان کے ساتھ انفرادی روابط کی طرف لوٹ گئیں اور انٹیلی جنس تعاون کا وعدہ عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔

11 نومبر 2021 کو وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی ایک اعلیٰ سطحی وفد کے ہمراہ کابل پہنچے۔ طالبان کی جانب سے قائم مقام وزیر خارجہ امیر خان متقی نے صدارتی محل میں وفد کا استقبال کیا۔ مذاکرات رسمی نوعیت کے تھے اور بعد ازاں مشترکہ پریس کانفرنس بھی منعقد ہوئی۔ پاکستان نے انسانی امداد اور تجارتی سہولتوں کا اعلان کیا، لیکن طالبان نے سکیورٹی معاملات میں کوئی عملی جواب نہ دیا۔ چند ہی ہفتوں میں سرحد پار حملے دوبارہ شروع ہو گئے اور یہ دورہ بگڑتی ہوئی سکیورٹی صورتحال کے سامنے غیر مؤثر ثابت ہوا۔

## ٹی ٹی پی مذاکرات اور جنگ بندی کا ناکام تجربہ

مئی 2022 میں افغان طالبان، خصوصاً قائم مقام وزیر داخلہ سراج الدین حقانی، نے پاکستانی انٹیلی جنس حکام اور ٹی ٹی پی کمانڈروں کے درمیان براہِ راست مذاکرات کی میزبانی کی۔ یہ مذاکرات کابل اور خوست میں کئی دن جاری رہے، جہاں طالبان ثالث کے طور پر دونوں فریقوں کے درمیان رابطہ کاری کرتے رہے۔ اعتماد سازی کے اقدام کے طور پر قیدیوں کی رہائی پر بھی گفتگو ہوئی۔ بعد ازاں ایک عارضی جنگ بندی کا اعلان کیا گیا اور پاکستان نے درجنوں ٹی ٹی پی دہشت گردوں کو رہا کیا۔ تاہم ٹی ٹی پی نے فاٹا کی نیم خودمختار حیثیت کی بحالی اور فوجی انخلا جیسے مطالبات پیش کیے جنہیں پاکستان نے مسترد کر دیا۔ 2022 کے اختتام تک ٹی ٹی پی نے دوبارہ بڑے حملے شروع کر دیے اور دونوں فریقوں نے ایک دوسرے پر بداعتمادی کا الزام لگایا۔ یوں یہ معاہدہ مکمل طور پر ناکام ہو گیا۔

جولائی 2022 میں مذہبی اور قبائلی ثالثی کی کوششیں بھی کی گئیں۔ مفتی تقی عثمانی کی قیادت میں علماء کا ایک وفد کابل گیا جبکہ اسی دوران 17 رکنی قبائلی جرگہ بھی افغانستان پہنچا۔ دونوں گروہوں نے طالبان اور ٹی ٹی پی نمائندوں سے ملاقاتیں کیں اور مذہبی وقبائلی اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے کشیدگی کم کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایک غیر رسمی اور روایتی ثالثی عمل تھا۔ طالبان اور ٹی ٹی پی نے ان کی بات سنی، مگر کوئی ٹھوس وعدہ نہ کیا۔ تشدد جاری رہا اور اگست 2022 تک یہ کوششیں بغیر نتائج کے ختم ہوگئیں۔

## سرحدی کشیدگی اور فوجی رابطے

11 اور 12 دسمبر 2022 کو چمن بارڈر پر سرحدی فائرنگ سے ہونے والے جانی نقصان کے بعد دونوں ممالک کے فوجی کمانڈروں نے ہنگامی فلیگ میٹنگز کیں۔ یہ آمنے سامنے ملاقاتیں ایک غیر جانبدار خیمہ نما مقام پر ہوئیں جن میں بٹالین سطح کے افسران شریک تھے۔ مذاکرات کا محور فائرنگ کے واقعات کی تحقیقات اور بارڈر کراسنگ کی بحالی تھا۔ سرحد کو عارضی طور پر پیدل آمدورفت اور تجارت کے لیے دوبارہ کھول دیا گیا، مگر کوئی مستقل طریقۂ کار قائم نہ کیا جاسکا۔ اسی نوعیت کے فائرنگ کے واقعات 2023 اور 2024 میں دوبارہ پیش آئے، جس سے واضح ہوگیا کہ یہ محض ایک عارضی حل تھا۔

22 فروری 2023 کو پاکستان کے وزیر دفاع خواجہ آصف اور اُس وقت کے ڈی جی آئی ایس آئی جنرل ندیم انجم نے ایک اعلیٰ سطحی وفد کے ہمراہ کابل کا دورہ کیا۔ طالبان کی جانب سے وزیر دفاع محمد یعقوب، جو ملا عمر کے بیٹے ہیں، نے وفد سے ملاقات کی۔ مذاکرات میں عسکریت پسندوں کی پناہ گاہوں سے متعلق تفصیلی بریفنگز شامل تھیں۔ طالبان نے ٹی ٹی پی کو محفوظ پناہ گاہیں دینے سے انکار کیا اور ثبوت طلب کیے۔ پاکستان نے انٹیلی جنس معلومات فراہم کیں، لیکن اس کے بعد کوئی عملی کارروائی نہ ہوئی۔ وفد بغیر کسی دستخط شدہ معاہدے کے واپس آ گیا جبکہ 2023 کے دوران ٹی ٹی پی حملوں میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ یہ کوشش بھی باہمی مایوسی پر ختم ہوئی۔

6 ستمبر 2023 کو طورخم بارڈر پر کشیدگی اس وقت شدت اختیار کر گئی جب پاکستانی فورسز نے افغان اہلکاروں کو پاکستانی حدود کے اندر تعمیرات کرنے سے روکا۔ اس پر افغان فورسز نے اندھا دھند فائرنگ کی جس سے طورخم ٹرمینل کو نقصان پہنچا۔ پاکستانی اور افغان سرحدی کمانڈروں نے پہلے ریڈیو رابطے کے ذریعے اور بعد ازاں بارڈر کراسنگ پر آمنے سامنے ہنگامی مذاکرات کیے۔ پاکستانی دفتر خارجہ نے

باضابطہ سفارتی احتجاج بھی ریکارڈ کرایا۔ طالبان نے تعمیرات ہٹانے سے انکار کر دیا جبکہ پاکستان نے کئی ہفتوں تک بارڈر بند رکھا۔ آخرکار کوئی مستقل حل نہ نکل سکا۔ پاکستان نے اس کے باوجود خیر سگالی اور انسانی ہمدردی کے تحت بارڈر دوبارہ کھول دیا، کیونکہ اس سے عام افغان شہری تاثر ہو رہے تھے۔ اس واقعے نے دوطرفہ اعتماد کو مستقل نقصان پہنچایا۔

## افغان مہاجرین کا بحران اور سفارتی تناؤ

ستمبر 2023 سے پاکستان کی وزارت داخلہ نے غیر دستاویزی افغان باشندوں کے انخلا کی آخری تاریخ کا اعلان کیا، جس کے بعد اسلام آباد اور کابل کے درمیان وزارت داخلہ کے حکام کی سطح پر متعدد سفارتی مذاکرات ہوئے۔ افغان طالبان نمائندوں نے مہلت میں توسیع اور کمزور طبقات کے لیے استثنا کی درخواست کی جبکہ پاکستان کے سفارت خانے نے دستاویزی عمل میں تعاون کیا اور نومبر 2023 سے مہاجرین کی بے دخلی کا عمل شروع کر دیا گیا، جس کے نتیجے میں پانچ لاکھ سے زائد افغان واپس افغانستان گئے۔ افغانستان نے اس پالیسی کی عوامی سطح پر مذمت کی، مگر مذاکرات اسے روکنے میں ناکام رہے۔ یہ اختلاف 2026 تک وقفے وقفے سے سفارتی کشیدگی کا باعث بنتا رہا۔

## 2024 کے رابطے اور مسلسل ناکامی

جولائی 2024 میں پاکستان کے وزیر داخلہ محسن نقوی نے ایک وفد کے ہمراہ کابل کا دورہ کیا، جہاں طالبان کی وزارت داخلہ میں سراج الدین حقانی کی قیادت میں ملاقاتیں ہوئیں۔ مذاکرات میں انسداد دہشت گردی، انٹیلی جنس شیئرنگ، اور سرحدی سلامتی پر توجہ دی گئی۔ ماحول بظاہر کاروباری انداز کا تھا، مگر کشیدگی واضح محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی باضابطہ معاہدہ طے نہ پا سکا۔ طالبان نے ایک مرتبہ پھر ٹی ٹی پی کی محفوظ پناہ گاہوں کی موجودگی سے انکار کیا۔ چند ہی ہفتوں بعد خیبر پختونخوا میں ٹی ٹی پی کے بڑے حملے ہوئے۔ رابطے کے ذرائع کھلے رہے، مگر عملی طور پر غیر مؤثر ثابت ہوئے۔

## دوحہ معاہدہ: پہلی نسبتاً کامیاب ثالثی

اکتوبر 2025 میں ایک ہفتے تک جاری شدید سرحدی جھڑپوں کے بعد قطر اور ترکی نے ثالثی کی پیشکش کی۔ پاکستان کے سینئر سکیورٹی اور انٹیلی جنس حکام جبکہ افغانستان کی جانب سے وزیر دفاع محمد یعقوب کے وفود

دوحہ پہنچے۔ مذاکرات ایک بند ہوٹل میں 13 گھنٹے تک جاری رہے، جہاں قطری اور ترک حکام مختلف کمروں کے درمیان پیغامات پہنچاتے رہے۔ پورا عمل انتہائی خفیہ رکھا گیا۔ بعدازاں ایک باضابطہ تحریری معاہدے پر دستخط ہوئے جس میں فوری جنگ بندی، سرحد پار عسکریت پسندی سے باہمی اجتناب، اور ایک تصدیق شدہ فالواَپ عمل، یعنی "استنبول ڈائیلاگ"، شامل تھا۔ قطر اور ترکی اس معاہدے کے ضامن بنے۔ مئی 2026 تک یہ جنگ بندی بڑی حد تک برقرار رہی، اگرچہ چند معمولی خلاف ورزیاں بھی ہوئیں۔ اب تک یہ سب سے کامیاب معاہدہ تصور کیا جاتا ہے۔

17 اکتوبر 2025 کو جب دوحہ کی ابتدائی 48 گھنٹے کی جنگ بندی ختم ہونے کے قریب پہنچی تو وفود دوبارہ دوحہ میں جمع ہوئے۔ انہی ثالث ممالک نے مذاکرات میں سہولت کاری کی۔ پاکستان نے خیر سگالی کے طور پر چمن کے راستے پھنسے ہوئے افغان مہاجرین کو گزرنے کی اجازت دی۔ مذاکرات کا محور جنگ بندی میں توسیع کی شرائط تھیں۔ تاہم صرف محدود مدت کی توسیع پر اتفاق ہو سکا، مستقل جنگ بندی پر نہیں۔ طورخم بارڈر بند رہا اور دونوں جانب سے ایک دوسرے پر پیش رفت میں رکاوٹ ڈالنے کے الزامات لگائے جاتے رہے۔ دسمبر 2025 میں ہونے والے فالواَپ مذاکرات بھی طویل المدتی معاہدہ طے کرنے میں ناکام رہے۔

## 2026 کے ہنگامی مذاکرات اور سفارتی تعطل

جنوری اور فروری 2026 میں سرحد پار توپ خانے کے تبادلوں کے بعد فوجی کمانڈروں نے تین سطحوں پر ہنگامی مذاکرات کیے: طورخم پر بٹالین کمانڈرز، کابل میں بریگیڈ سطح کے افسران، اور اسلام آباد میں سفارتی چینلز۔ مذاکرات فوری نوعیت کے تھے اور کشیدگی کم کرنے پر مرکوز رہے۔ ان کے نتیجے میں تشدد میں عارضی کمی آئی اور تجارتی راستے جزوی طور پر دوبارہ کھول دیے گئے، مگر کوئی مستقل جنگ بندی طے نہ پا سکی۔ مارچ 2026 تک معمولی فائرنگ کے واقعات دوبارہ شروع ہو گئے اور دونوں جانب نے سرحدی پوزیشنز مزید مضبوط کر لیں۔

7 اپریل 2026 کو پاکستان کے دفتر خارجہ نے ایک باضابطہ یکطرفہ سفارتی پیغام جاری کیا جس میں مذاکرات کے لیے پاکستان کے عزم کا اعادہ کیا گیا، ٹرانزٹ ٹریڈ معاہدے کے غلط استعمال کے خلاف خبردار کیا گیا، اور کہا گیا کہ افغان جانب سے بلا اشتعال فائرنگ دہشت گردوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ یہ پیغام اسلام آباد میں افغان سفارت خانے تک پہنچایا گیا۔ افغان طالبان نے اپنے جوابی بیان

میں ان الزامات کو مسترد کر دیا۔ کسی فالواَپ مذاکرات کا اعلان نہیں کیا گیا اور یہ سفارتی تبادلہ تعطل پر ختم ہوا، جہاں دونوں جانب نے عوامی سطح پر ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرایا، تاہم ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ مذاکرات کے دروازے بند نہیں ہوئے۔ مئی 2026 تک کسی نئے مذاکرات کا اعلان سامنے نہ آ سکا۔

## مذاکراتی عمل کے مستقل رجحانات

اس پورے عرصے میں ایک مستقل اور بار بار دہرایا جانے والا چکر نمایاں طور پر سامنے آیا۔ تمام سفارتی رابطوں میں ایک ہی ترتیب دیکھی گئی، جسے صرف دوحہ معاہدہ جزوی طور پر توڑ سکا۔ ابتدا میں پاکستان کو یقین دلایا جاتا کہ طالبان ٹی ٹی پی کے خلاف کارروائی کریں گے، پھر اعلیٰ سطحی دورے، انٹیلی جنس معلومات کا تبادلہ، اور بعض اوقات قیدیوں کی رہائی جیسے اقدامات کیے جاتے۔ اس کے بعد عارضی جنگ بندی ہوتی اور حملے وقتی طور پر رک جاتے، مگر طالبان کی جانب سے عملی کارروائی نہ ہونے کے باعث ٹی ٹی پی کی محفوظ پناہ گاہیں برقرار رہتیں اور کسید ہشت گرد کو حوالے نہیں کیا جاتا۔ نتیجتاً پاکستان کے اندر دہشت گرد حملے دوبارہ شروع ہو جاتے، دونوں فریق ایک دوسرے پر بدنیتی کا الزام لگاتے اور مذاکرات ختم ہو جاتے۔

## ٹی ٹی پی: ہر ناکامی کی بنیادی وجہ

ہر مذاکراتی دور کی ناکامی کے مرکز میں ایک ہی مسئلہ موجود رہا: افغان سرزمین پر ٹی ٹی پی کمانڈروں کی موجودگی۔ پاکستان کی جانب سے حوالگی یا فوجی کارروائی کے مطالبات مسلسل مسترد کیے جاتے رہے۔ طالبان خودمختاری کا مؤقف اختیار کرتے رہے اور ٹی ٹی پی کے ساتھ کسی باضابطہ تعلق سے انکار کرتے رہے، حالانکہ اس کے برعکس معتبر انٹیلی جنس معلومات پیش کی جاتی رہیں۔ جب تک اس بنیادی مسئلے کا کوئی حل نہیں نکلتا یا کوئی قابلِ اعتماد نفاذی نظام قائم نہیں ہوتا، مذاکرات کے اسی دائرہ نما چکر کے جاری رہنے کا امکان برقرار رہے گا۔

## قطر اور ترکی کا کردار

اس پورے عرصے کی سب سے اہم سفارتی پیش رفت اکتوبر 2025 میں قطر اور ترکی کا فعال ثالث کے طور پر سامنے آنا تھا۔ اس سے قبل مذاکرات اس لیے بھی ناکام ہوتے رہے کیونکہ کوئی بیرونی طاقت دونوں فریقوں کو جواب دہ بنانے کے لیے تیار یا قادر نہیں تھی۔ دوحہ معاہدے نے اس صورتحال کو تبدیل کیا کیونکہ

اس میں باضابطہ ضامن شامل کیے گئے جن کی اپنی ساکھ بھی معاہدے کی کامیابی سے وابستہ تھی۔ اگرچہ اس انتظام کی پائیداری کا ابھی مکمل امتحان باقی ہے، لیکن اب تک ہونے والے تمام معاہدوں میں اسے سب سے مضبوط ساختی بنیاد رکھنے والا معاہدہ سمجھا جاتا ہے۔

## سرحدی نظم ونسق اور اعتماد کا بحران

سرحدی نظم ونسق بھی مسلسل کشیدگی کا مرکز بنا رہا، خصوصاً طورخم اور چمن کراسنگ بار بار تنازعات کا محور بنتی رہیں۔ دونوں سرحدی گزرگاہیں کئی مرتبہ عارضی طور پر بند کی گئیں۔ فوجی فلیگ میٹنگز ایک معمول کا تنازعہ کم کرنے والا ذریعہ بن چکی ہیں، مگر یہ اصل مسائل کے بجائے صرف ان کی علامات کا علاج کرتی رہیں۔ ستمبر 2023 کا طورخم تعطل خاص طور پر اہم تھا کیونکہ اس نے باہمی اعتماد کو مستقل نقصان پہنچایا، جسے بعد کی کوئی سفارتی کوشش بحال نہ کرسکی۔

## انسانی بحران اور مہاجرین کا مسئلہ

نومبر 2023 سے شروع ہونے والی پانچ لاکھ سے زائد غیر دستاویزی افغان شہریوں کی بے دخلی نے پہلے سے کشیدہ تعلقات میں ایک انسانی بحران کا پہلو بھی شامل کر دیا۔ طالبان حکام نے اس پالیسی کی مذمت کی اور بعد کے مذاکرات میں اسے پاکستان کی بدنیتی کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا رہا۔ مہاجرین کا مسئلہ اب سکیورٹی مذاکرات کے ساتھ جڑ چکا ہے اور اس نے سفارتی روابط کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔

## نتیجہ اور مستقبل کا منظرنامہ

مئی 2026 تک پاکستان اور افغانستان کے تعلقات کی بنیادی خصوصیات ساختی بداعتمادی، غیر حل شدہ سکیورٹی خطرات، اور نامکمل سفارتی فریم ورک ہیں۔ اکتوبر 2025 کے دوحہ معاہدے نے اب تک کی سب سے پائیدار جنگ بندی ضرور فراہم کی، مگر یہ ٹی ٹی پی، ڈیورنڈ لائن، یا مہاجرین کی واپسی جیسے بنیادی تنازعات حل نہیں کر سکا۔ دونوں حکومتیں بظاہر مذاکرات کے عزم کا اظہار کرتی ہیں، لیکن ساتھ ہی اپنے مؤقف مزید سخت بھی کرتی جا رہی ہیں۔

مستقل بہتری کے لیے تین شرائط ناگزیر دکھائی دیتی ہیں۔ پہلی، ایک قابلِ اعتماد نظام، چاہے وہ بیرونی ثالثی، معاشی مراعات، یا دونوں کے امتزاج پر مبنی ہو، جو طالبان کو ٹی ٹی پی کے معاملے میں تعاون پر آمادہ

کر سکے۔ دوسری، طورخم اور چمن پر مشترکہ طور پر طے شدہ سرحدی نظم ونسق کا نظام۔ اور تیسری، مہاجرین کی بے دخلی کے مسئلے کا ایسا حل جو دونوں فریقوں کے لیے قابلِ قبول ہو۔ جب تک ان معاملات میں پیش رفت نہیں ہوتی، مذاکرات، ناکامی، اور نئے بحرانوں کا یہ سلسلہ جاری رہنے کا امکان برقرار رہے گا۔ اگر دوحہ فریم ورک برقرار رہتا ہے اور مجوزہ استنبول مذاکرات میں اسے مزید وسعت دی جاتی ہے تو یہ مستقبل کے لیے سب سے قابلِ عمل راستہ ثابت ہوسکتا ہے۔ تاہم یہ سوال بدستور اہم رہے گا کہ آیا دونوں حکومتوں اور ان کے بیرونی ضامنوں میں اس عمل کو مکمل کرنے کی سیاسی خواہش موجود ہے یا نہیں۔

## ۔۔۔اور پھر پاکستان کا صبر جواب دے گیا

افغانستان کے ساتھ تعلقات میں پاکستان نے طویل عرصے تک صبر، تحمل اور مذاکرات کی پالیسی اختیار کیے رکھی۔ اسلام آباد مسلسل یہ امید لگائے بیٹھا رہا کہ طالبان حکومت اپنے وعدوں کی پاسداری کرے گی، افغانستان کی سرزمین پاکستان کے خلاف استعمال نہیں ہونے دے گی اور تحریک طالبان پاکستان سمیت دیگر دہشت گرد گروہوں کے خلاف عملی کارروائی کرے گی۔ لیکن وقت کے ساتھ یہ واضح ہوتا گیا کہ طالبان صرف وعدے کر رہے ہیں، زمینی حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ پاکستان کے اندر خودکش حملے بڑھتے گئے، فوجی قافلے نشانہ بنتے رہے، پولیس چوکیوں پر حملے ہوتے رہے اور دہشت گرد نیٹ ورکس کو افغانستان کے اندر کھلی چھوٹ حاصل رہی۔

اسلام آباد نے بارہا مذاکرات کیے، سفارتی ذرائع استعمال کیے، کابل کو شواہد فراہم کیے اور برادرانہ انداز میں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ افغان سرزمین سے ہونے والی دہشت گردی نہ صرف پاکستان بلکہ پورے خطے کے امن کے لیے خطرہ بن رہی ہے۔ مگر طالبان قیادت ہر بار یا تو انکار کرتی رہی یا پھر ایسے وعدے کرتی رہی جن پر کبھی عمل نہ ہوا۔ پاکستان کو رفتہ رفتہ یہ احساس ہونے لگا کہ طالبان دراصل وقت حاصل کر رہے ہیں جبکہ دوسری طرف دہشت گردی کا پورا ڈھانچہ مزید مضبوط کیا جا رہا ہے۔

## طالبان را گٹھ جوڑ، بڑی وجہ

صورتحال اس وقت مزید خطرناک ہوگئی جب پاکستان کے سیکیورٹی اداروں کے پاس یہ شواہد آنے لگے کہ طالبان حکومت نے بھارتی خفیہ نیٹ ورک ''را'' کے ساتھ مختلف سطحوں پر رابطے بڑھا دیے ہیں اور

پاکستان مخالف دہشت گردی کو منظم انداز میں سرکاری سرپرستی فراہم کی جارہی ہے۔ پاکستان کے لیے یہ ناقابلِ قبول صورتحال تھی۔ اسلام آباد کی نظر میں یہ صرف سرحدی شورش نہیں رہی تھی بلکہ پاکستان کی قومی سلامتی کے خلاف ایک مکمل پراکسی وار میں تبدیل ہو چکی تھی۔ طالبان نے مسلسل یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ پاکستان افغانستان کے اندر وسیع کارروائی کی ہمت نہیں کرے گا، مگر پاکستان نے واضح کر دیا کہ اگر قومی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو تو کارروائی کسی بھی حد تک جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان نے اس بار صرف سرحدی مورچوں کو نہیں بلکہ پورے دہشت گرد ڈھانچے کو ہدف بنایا۔

اکتوبر 2025 سے پاکستان کے صبر کا پیمانہ عملاً لبریز ہونا شروع ہوا۔ خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں دہشت گرد حملوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ تحریک طالبان پاکستان نے کھلے عام حملوں کی ذمہ داری قبول کی جبکہ اقوام متحدہ کی رپورٹس بھی اس بات کی تصدیق کرتی رہیں کہ ٹی ٹی پی، القاعدہ اور دیگر شدت پسند گروہ افغانستان کے اندر محفوظ پناہ گاہیں رکھتے ہیں۔ پاکستان مسلسل یہ کہتا رہا کہ اگر افغان طالبان اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتے تو پاکستان کو اپنے شہریوں کے تحفظ کے لیے خود اقدام کرنا پڑے گا۔

پہلے مرحلے میں پاکستان نے سرحدی نگرانی سخت کی، سرحدی راستے بند کیے اور سفارتی دباؤ بڑھایا، مگر جب صورتحال قابو میں نہ آئی تو پاکستان نے فیصلہ کیا کہ اب محدود دفاعی حکمت عملی کافی نہیں۔ پاکستان کی عسکری قیادت اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ طالبان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ پاکستان صرف سرحدی علاقوں تک محدود کارروائی کرے گا اور افغانستان کے اندر گہرائی تک جانے سے گریز کرے گا۔ یہی وہ غلط اندازہ تھا جس نے بعد میں طالبان کو شدید دھچکا پہنچایا۔

## دہشت گرد نیٹ ورک کا نقصان

فروری 2026 میں پاکستان نے افغانستان کے اندر دہشت گرد نیٹ ورکس کے خلاف انتہائی منظم اور ہدفی کارروائیاں شروع کیں۔ یہ صرف سرحدی پٹی تک محدود حملے نہیں تھے بلکہ ان تمام مقامات کو نشانہ بنایا گیا جہاں دہشت گردی کو سہولت، تربیت، اسلحہ، لاجسٹک سپورٹ اور انٹیلی جنس معاونت فراہم کی جارہی تھی۔ پاکستان نے واضح کیا کہ یہ کارروائیاں افغانستان کے خلاف نہیں بلکہ ان دہشت گرد انفراسٹرکچرز کے خلاف ہیں جو پاکستان کے شہریوں کے قتل میں ملوث ہیں۔ پاکستان کی کارروائیاں ایک مجبوری تھیں۔ ہر ریاست کی بنیادی ذمہ داری اپنے شہریوں کے جان و مال کا تحفظ ہوتی ہے اور پاکستان بھی یہی کر رہا تھا۔

## سویلین ہلاکتوں کا پروپیگنڈہ

طالبان نے ان کارروائیوں کے بعد سویلین ہلاکتوں کا شور مچانا شروع کیا، مگر پاکستان کے مطابق یہ دعوے حقائق کے بجائے پروپیگنڈے پر مبنی تھے۔ دراصل طالبان بھارتی میڈیا کے انداز پر چلتے ہوئے جھوٹ کی توپ چلانے میں مصروف تھے، تاکہ اصل مسئلے یعنی دہشت گردوں کی موجودگی سے توجہ ہٹائی جاسکے۔ جبکہ پاکستان نے واضح طور پر صرف تصدیق شدہ عسکری اہداف کو نشانہ بنایا اور کارروائیوں میں جدید ٹیکنالوجی اور انٹیلی جنس کی بنیاد پر انتہائی احتیاط برتی گئی۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ بعض جگہ کچھ سویلین ہلاکتیں بھی ہوئی ہیں، لیکن اس کی ذمہ داری مکمل طور پر طالبان پر عائد ہوتی ہے، کیونکہ انہوں نے دانستہ طور پر دہشت گرد انفراسٹرکچر کو شہری آبادیوں کے قریب قائم کیا۔ دہشت گردوں کے مراکز، تربیتی مقامات اور لاجسٹک نیٹ ورکس کو عام آبادی میں چھپانے کی کوشش دراصل طالبان کی اپنی حکمت عملی تھی تاکہ کارروائی کی صورت میں دنیا کے سامنے سویلین ہلاکتوں کا بیانیہ کھڑا کیا جاسکے۔

کابل میں جن مقامات کے حوالے سے شور مچایا گیا، وہاں کی حقیقت یکسر مختلف تھی۔ مثال کے طور پر کیمپ فینکس کو عالمی سطح پر ایک معروف فوجی اور سیکیورٹی تنصیب سمجھا جاتا ہے۔ اگر وہاں دھماکے یا نقصانات ہوئے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک حساس عسکری مقام پر کون سی سرگرمیاں جاری تھیں اور وہاں کن عناصر کو سہولت فراہم کی جارہی تھی۔ پورا سچ یہ ہے کہ افغان رجیم کے تعاون سے دہشت گرد نیٹ ورکس نے ایسے کئی مقامات کو آپریشنل حب کے طور پر استعمال کرنا شروع کردیا تھا۔ کابل میں اصل قصہ یہ تھا کہ وہاں طالبان کی ڈرون مینو فیکچرنگ فیکٹری اور خودکش بھرتی کرنے کا مرکز تھا، طالبان نے دانستہ اس کے قریب ہی ایک جگہ پر ہسپتال کا بورڈ لگا کر ایک طرح سے ہیومن شیلڈ بنانے کی کوشش کی۔ پاکستان نے جب اصل عسکری ہدف کو نشانہ بنایا تو وہاں سے کچھ شعلے نام نہاد ہسپتال تک پہنچے اور لوگ مارے گئے۔

پاکستان کا یہ موقف عالمی سطح پر تسلیم کرلیا گیا ہے کہ یہ لڑائی افغانستان کے عوام کے خلاف نہیں بلکہ ان عناصر کے خلاف ہے جو افغانستان کی سرزمین کو دہشت گردی کے لیے استعمال کررہے ہیں۔ پاکستان بارہا کہہ چکا ہے کہ وہ ایک پرامن، مستحکم اور خودمختار افغانستان چاہتا ہے، مگر ایسا افغانستان نہیں جہاں دہشت گرد تنظیمیں ریاستی سرپرستی میں کام کریں، بھارتی خفیہ نیٹ ورکس کے ساتھ روابط بڑھائے جائیں اور پاکستان کے خلاف پراکسی جنگ چلائی جائے۔ پاکستانی پالیسی ساز اب یہ سمجھتے ہیں کہ افغانستان میں دہشت گردی کا مسئلہ صرف

سفارتی بیانات سے حل نہیں ہوگا۔ اگر طالبان واقعی خطے میں امن چاہتے ہیں تو انہیں دہشت گرد گروہوں سے مکمل لاتعلقی اختیار کرنا ہوگی، ورنہ پاکستان اپنے دفاع اور شہریوں کے تحفظ کے لیے ہر وہ اقدام جاری رکھے گا جسے وہ ضروری سمجھے گا۔

پاکستان کی اس مسلسل کارروائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ افغانستان کے اندر موجود دہشت گردی کا وہ انفراسٹرکچر، جو برسوں سے محفوظ سمجھا جا رہا تھا، پہلی بار شدید دباؤ میں آ گیا۔ پاکستان نے صرف وقتی یا نمائشی کارروائیاں نہیں کیں بلکہ ان مراکز کو نشانہ بنایا جہاں سے دہشت گرد نیٹ ورکس کو منصوبہ بندی، تربیت، مالی معاونت، لاجسٹک سپورٹ اور انٹیلی جنس سہولتیں فراہم کی جا رہی تھیں۔ اس آپریشن کے بعد ٹی ٹی پی اور اس سے وابستہ گروہوں کے کئی تربیتی مراکز، اسلحہ ڈپو، مواصلاتی نظام اور نقل و حرکت کے محفوظ راستے متاثر ہوئے، جس سے ان کی کارروائیوں کی رفتار اور تنظیمی صلاحیت کو نقصان پہنچا۔

اس کارروائی نے طالبان حکومت کے اس تاثر کو توڑ دیا کہ پاکستان صرف دفاعی پوزیشن میں رہے گا اور سرحدی پٹی سے آگے کارروائی نہیں کرے گا۔ اس بار پاکستان نے واضح پیغام دیا کہ جہاں کہیں بھی پاکستان مخالف دہشت گردی کے لیے انفراسٹرکچر موجود ہوگا، وہ ہدف بن سکتا ہے۔ عسکری تجزیہ کاروں کے مطابق یہی وہ عنصر تھا جس نے طالبان اور ان سے جڑے گروہوں کو نفسیاتی طور پر بھی دباؤ میں ڈالا۔

سرحدی علاقوں میں بھی اس آپریشن کے اثرات نمایاں ہو رہے ہیں، صوبہ کنڑ اور نورستان کے پانچ اضلاع نے مکمل طور پر طالبان حکومت کو مسترد کر کے آزاد حیثیت میں پاکستان سے باضابطہ معاہدے کر لیے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس آپریشن کی اصل کامیابی صرف عسکری نہیں بلکہ اسٹریٹجک تھی۔ اسلام آباد نے یہ پیغام دینے کی کوشش کی کہ پاکستان اب ''اسٹریٹجک صبر'' کی پالیسی سے نکل چکا ہے اور اگر افغانستان کی سرزمین سے حملے جاری رہے تو پاکستان صرف سفارتی احتجاج تک محدود نہیں رہے گا۔ پاکستانی حلقوں کے مطابق اس کارروائی نے دہشت گرد تنظیموں کے لیے محفوظ پناہ گاہوں کے تصور کو چیلنج کیا اور طالبان حکومت کو یہ احساس دلایا کہ پاکستان اپنی داخلی سلامتی کے معاملے پر اب زیادہ جارحانہ اور پیشگی حکمت عملی اختیار کر سکتا ہے۔

---

# حوالہ جات/ باب اول


1. Taliban-Ahmed Rashid
2. The Afghanistan Wars-William Maley
3. Human Rights Watch Reports
5. Oil and Fundamentalism , Militant Islam: Taliban,Ahmed Rashid in Central Asia, Yale University Press, 2000.
6. Associated Press Dispatch, 12 October 1996.
7. Reuters Kabul Bureau Reports (1995-1998).
8. BBC Monitoring Service, South Asia (1996-2001).
9. BBC Pashto Service, Border Coverage, July 1999.
10. BBC Urdu, Taliban Reaction to Pakistan Decision, September 2001.
11. AFP (Agence France-Presse), South Asia Reports 1997-2001.
12. The Guardian (South Asia Desk) 1997-2000.
13. The Washington Post, Regional Diplomatic Reports 2000-2001.
14. Christian Science Monitor, Taliban Interview Notes, 1998.
15. CSIS Report, The Taliban and Pakistan Relationship, 2000.
16. Ministry of Foreign Affairs Pakistan, 98 Annual Report 1997.
17. Taliban,Ahmed Rashid.
18. BBC, Reuters Reports, (December 1997), Kabul and Kandahar.
19. Sunday Telegraph (17 December 1997), Oil Barons Court Taliban.
20. US State Department Declassified Documents (8 December 1997), The Taliban File (National Security Archive) Taliban File.
21. RFE/RL, Washington Post, and Telegraph Reports, 1990s.
22. Zalmay Khalilzad Interview and 2020 Memoirs.
23. Foreign Policy and other research articles (Unocal-Taliban)

# باب دوم

## طالبان کی داخلی تقسیم:

بھیڑیوں کے بارے میں میں کہا جاتا ہے کہ جاڑے کی راتوں میں جھنڈ (دائرہ) بنا کر بیٹھتے ہیں، لیکن جیسے ہی کسی ایک کی آنکھ جھپکتی ہے، دیگر اس کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر پر حملہ کرتے ہیں اور چیڑ پھاڑ کر کھا جاتے ہیں، اگلی شب پھر وہی ہوتا ہے، یہاں تک کہ جاڑہ ختم ہو جائے یا بھیڑیئے۔ جو آخر میں بچ رہے اس کے لئے اردو کی اصطلاح ''گرگ بارہ دیدہ'' مستعمل ہے۔ موجودہ طالبان کا بھی یہی معاملہ ہے۔ قندھاری اور حقانی بڑے گروپ ہیں، ان کے علاوہ بھی کئی دھڑے قائم ہو چکے ہیں، یہ سب بھیڑیوں کے جھنڈ ہیں بظاہر متحد اور یک جان لیکن ہر لیڈر یا کمانڈر دوسرے کی آنکھ جھپکنے کا منتظر ہے۔ افغان طالبان بظاہر ایک منظم، مربوط اور متحد قوت کے طور پر سامنے آتے ہیں، لیکن زمینی حقیقت اس تاثر سے مختلف ہوتی جا رہی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اندرونی اختلافات گہرے ہو رہے ہیں اور مختلف دھڑوں کے درمیان فاصلے بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اتحاد جو کبھی بیرونی دنیا کو بھی حیران کر دیتا تھا، اب اسی

ڈھانچے کے اندر دراڑوں کی صورت میں سامنے آ رہا ہے۔ بعض حلقوں میں یہ بات بھی زیر بحث ہے کہ اگر یہی رجحان جاری رہا تو اندرونی کشمکش مزید شدت اختیار کر سکتی ہے۔ ماضی کی طرف دیکھا جائے تو ملا عمر کے دور میں طالبان کے اندر ایک خاص نوعیت کی یکجہتی اور سخت نظم وضبط پایا جاتا تھا۔ فیصلے ایک مرکز سے نکلتے تھے اور اختلافات کو یا تو دبایا جاتا تھا یا تنظیمی ڈھانچے کے اندر حل کر لیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے اس دور کو ایک نسبتاً مربوط قیادت کے طور پر یاد کیا جاتا ہے، چاہے اس کی پالیسیوں پر عالمی سطح پر اختلاف موجود رہا ہو۔

موجودہ صورتحال اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ اب گروہی مفادات، اثر ورسوخ کی کشمکش اور اختیارات پر گرفت کی جنگ نے اندرونی فضا کو متاثر کیا ہے۔ قندھاری اور حقانی گروپوں کے درمیان تقسیم کو تو پہلے ہی نمایاں سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ تصویر مکمل نہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی چھوٹے بڑے دھڑے موجود ہیں جو اپنے اپنے دائرہ اثر کو مضبوط بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تنظیم کا مجموعی تاثر ایک یکجان قوت کا کم اور مختلف مراکز میں بٹی ہوئی طاقت کا زیادہ بن رہا ہے۔ آج کے طالبان کے بارے میں بھی یہ تاثر تقویت پکڑ رہا ہے کہ بظاہر اتحاد موجود ہے، مگر اندرونی سطح پر اعتماد کی وہ کیفیت نہیں رہی جو کسی مضبوط تنظیم کی بنیاد ہوتی ہے۔ قندھاری اور حقانی دھڑوں کے علاوہ دیگر گروہوں کی موجودگی اس پیچیدگی کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ ہر گروہ اپنے اثر کو محفوظ رکھنے اور دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی کوشش میں ہے۔ یہ صورتحال ایک ایسے موڑ کی طرف اشارہ کرتی ہے جہاں اندرونی توازن قائم رکھنا سب سے بڑا چیلنج بن چکا ہے۔ اگر یہ اختلافات نظم میں نہ ڈھل سکے تو مستقبل میں اس کے سیاسی اور تنظیمی اثرات مزید نمایاں ہو سکتے ہیں۔

افغان طالبان کی موجودہ حکومت قائم ہونے کے بعد 2023 میں پہلی بار افغانستان جا کر حالات کو قریب سے دیکھنے اور مختلف حلقوں سے بات چیت کا موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ بظاہر نظر آنے والا اتحاد اندر سے شدید کھوکھلا ہو چکا ہے۔ ہر شخص دوسرے کے خلاف برسرپیکار دکھائی دیتا ہے۔ اختلاف صرف قیادت تک محدود نہیں بلکہ دوسرے اور تیسرے درجے کے کمانڈروں سے لے کر عام طالبان تک بے چینی، بداعتمادی اور کشیدگی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ تصادم کا خطرہ ہر وقت منڈلاتا محسوس ہوتا ہے۔ آج صورتحال اس نہج پر پہنچ چکی ہے جہاں ہر دھڑا دوسرے کی کمزوری، تنہائی یا لغزش کا منتظر ہے۔ طالبان کے اقتدار میں آنے

کے بعد شروع ہی سے اندرونی اختلافات اور اقتدار کی رسہ کشی کی خبریں گردش کرتی رہی ہیں، مگر اس وقت یہ تنازعات افواہوں یا محدود سیاسی چپقلش سے کہیں آگے نکل چکے ہیں۔ اب اختلافات تنظیمی ڈھانچے کے اندر واضح دراڑوں کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ یہ تقسیم صرف سیاسی قیادت تک محدود نہیں بلکہ فوج، انٹیلی جنس، انتظامیہ اور صوبائی سطح کے ڈھانچوں میں بھی نمایاں ہو چکی ہے۔ مختلف حلقے ایک دوسرے پر عدم اعتماد کرتے ہیں اور ہر دھڑا اپنے اثر و رسوخ کو بچانے یا بڑھانے کی جنگ میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔

ظاہری اتحاد کے پیچھے شدید رقابت، خوف اور طاقت کی جنگ جاری ہے۔ ان تنازعات کی کئی وجوہات بیان کی جاتی ہیں لیکن بنیادی اور سب سے بڑی وجہ امیر ہیبت اللہ اخوندزادہ کے گرد قائم وہ شخصی اقتدار ہے جس نے پورے نظام کو ایک محدود دائرے میں قید کر دیا ہے۔ وسائل، اہم عہدے، اختیارات اور پالیسی سازی کا مرکز چند مخصوص افراد بنتے جا رہے ہیں۔ قندھار کے گرد بننے والا یہ طاقت کا دائرہ دیگر دھڑوں میں شدید بے چینی پیدا کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقانی گروپ سمیت مختلف حلقوں میں احساس محرومی بڑھتا جا رہا ہے اور یہ کیفیت خاموش کشمکش کو مزید گہرا کر رہی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ اختلافات اب صرف اعلیٰ قیادت تک محدود نہیں رہے۔ نچلی سطح کے دہشت گرد، مقامی کمانڈر اور عام طالبان بھی اس تقسیم کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ تنظیم کے اندر اعتماد، ایثار اور مشترکہ مقصد کی وہ فضا تقریباً ختم ہوتی دکھائی دیتی ہے جسے کبھی طالبان کی اصل طاقت سمجھا جاتا تھا۔ یہی اندرونی انتشار اب ایک ایسی دیمک بن چکا ہے جو خاموشی سے پوری عمارت کو چاٹ رہی ہے۔ اگر یہی صورتحال برقرار رہی تو یہ دراڑیں کسی بھی وقت ایک بڑے تصادم، بغاوت یا تقسیم میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ اس کے اثرات صرف افغانستان تک محدود نہیں رہیں گے بلکہ پورا خطہ ایک نئے عدم استحکام کی لپیٹ میں آ سکتا ہے۔ گروہ بندی سے ہٹ کر بھی دیکھا جائے تو عام طالبان میں بھی شدید مایوسی اور نفرت بڑھ رہی ہے، جس کئی وجوہات ہیں، جن میں سرفہرست تصفیہ کمیشن ہے۔

## طالبان تصفیہ کمیشن

افغان طالبان کے مختلف گروپوں سے تعلق رکھنے والے سینیئر ذمہ داران اور کمانڈروں سے ملاقاتوں کے دوران ایک ایسی حقیقت سامنے آئی جو بظاہر معمولی انتظامی معاملہ دکھائی دیتی ہے مگر درحقیقت طالبان کے اندر بڑھتی ہوئی تقسیم، نفرت اور بے اعتمادی کی بڑی وجوہات میں سے ایک بن چکی ہے۔ یہ معاملہ نام نہاد

"تصفیہ کمیشن" یا "سکروٹنی کمیشن" کا ہے جس نے طالبان کے اندر وہ زخم پیدا کیے ہیں جو وقت کے ساتھ مزید گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ طالبان کے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد قندھار کی مرکزی قیادت نے پورے نظام پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی کوشش شروع کی۔ اس مقصد کے لیے نہ صرف اہم عہدے اپنے قریبی لوگوں میں تقسیم کیے گئے بلکہ بڑی تعداد میں ایسے افراد کو بھی ''مجاہد'' قرار دے کر سرکاری ڈھانچے اور سیکیورٹی اداروں میں شامل کرنا شروع کر دیا گیا جن کا حقیقت میں طالبان کی 20 سالہ جنگ یا تحریک سے کوئی عملی تعلق نہیں تھا۔

ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو قندھاری قیادت کے رشتہ دار، قبیلہ دار یا ذاتی وفادار سمجھے جاتے تھے۔ انہیں نہ صرف سرکاری عہدے دیے گئے بلکہ مراعات، اسلحہ، اختیارات اور وسائل تک رسائی بھی فراہم کی گئی۔ یہ صورتحال پرانے اور حقیقی طالبان کے لیے شدید صدمے کا باعث بنی۔ وہ لوگ جنہوں نے برسوں پہاڑوں، غاروں اور دیہات میں جنگ لڑی، جیلیں کاٹیں، اپنے خاندان کھوئے اور مسلسل خطرات میں زندگی گزاری، اچانک خود کو ایسے لوگوں کے ماتحت پانے لگے جنہوں نے جنگ کا زمانہ گھروں یا بیرون ملک گزارا تھا۔ اقتدار میں آنے کے صرف ایک سال بعد ہی اقربا پروری، جعلی مجاہدین اور من پسند تقرریوں کے خلاف آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ یہ اعتراض صرف نچلی سطح تک محدود نہیں تھا بلکہ تقریباً تمام صوبوں سے تعلق رکھنے والے سینیئر طالبان رہنما بھی اس معاملے پر کھل کر ناراضی ظاہر کرنے لگے۔ ان کا کہنا تھا کہ طالبان کے نام پر ایک متوازی گروہ کھڑا کیا جا رہا ہے جس کا مقصد صرف قندھاری دھڑے کی عددی اور سیاسی طاقت میں اضافہ ہے۔ دوسری جانب حقانی گروپ اور دیگر حلقوں سے وابستہ بہت سے حقیقی ہشت گردوں کو یا تو نظر انداز کیا جا رہا تھا یا ان کی قربانیوں کو تسلیم ہی نہیں کیا جا رہا تھا۔ یہ تنازع اس قدر بڑھا کہ دسمبر 2022 میں شوریٰ کے اجلاسوں میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث آیا۔

بڑھتے ہوئے اعتراضات کے بعد ملا ہیبت اللہ اخوندزادہ نے قومی سطح پر ایک پانچ رکنی ''تصفیہ کمیشن'' قائم کیا جس کی سربراہی ملا یعقوب کو سونپی گئی۔ بظاہر اس کمیشن کا مقصد جعلی مجاہدین کی نشاندہی اور اصل طالبان کی تفریق تھا، مگر وقت گزرنے کے ساتھ یہی کمیشن اختلافات، انتقام اور توہین کا سب سے بڑا ذریعہ بنتا چلا گیا۔ اس کمیشن کے ذیلی ڈھانچے صوبائی اور ضلعی سطح تک قائم کیے گئے۔ طریقہ کار انتہائی سخت اور کئی طالبان کے نزدیک توہین آمیز تھا۔ ہر طالبان اہلکار کو طلب کیا جاتا اور اس سے کہا جاتا کہ وہ ثابت

کرے کہ وہ واقعی جنگ کے دوران طالبان کا حصہ رہا ہے۔اس کے لیے ہر شخص کو یہ تفصیل دینا پڑتی کہ وہ کس ''دلگئی'' یا گروپ سے وابستہ تھا، اس کا کمانڈر کون تھا اور اس نے کہاں کہاں جنگ میں حصہ لیا۔طالبان نے جنگ کے دوران چھوٹے چھوٹے گروپس بنا رکھے تھے جن میں باضابطہ منظور شدہ تعداد عموماً 25 افراد ہوتی تھی۔مرکز کی جانب سے اسی تعداد کا بجٹ دیا جاتا تھا، اگرچہ بعض کمانڈر اپنے وسائل سے مزید افراد بھی رکھتے تھے۔اب برسوں بعد ہر اہلکار کو اپنے پرانے گروپ لیڈر کو تلاش کرنا پڑتا تھا تاکہ وہ کمیشن کے سامنے حاضر ہو کر اس کی تصدیق کرے۔سب سے زیادہ توہین آمیز مرحلہ وہ سمجھا جاتا تھا جب کسی کمانڈر یا سپاہی کو مسجد میں بٹھا کر قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم دلائی جاتی کہ واقعی فلاں شخص اس کے گروپ کا حصہ تھا۔اگر کسی کے پاس کوئی پرانی تصویر، تحریری ثبوت یا جنگی ریکارڈ موجود ہوتا تو شاید قسم سے بچ جاتا، ورنہ اسے قسم اٹھانا پڑتی۔کئی پرانے طالبان اس عمل کو اپنی تذلیل سمجھتے تھے۔بعض نے تو یہاں تک کہا کہ انہوں نے بیس سال امریکی افواج سے جنگ کی مگر آج اپنے ہی لوگوں کے سامنے اپنے مسلمان اور مجاہد ہونے کا ثبوت دینا پڑ رہا ہے۔کئی طالبان اہلکاروں نے قسم اٹھانے کی اس ''ذلت'' کے بجائے برطرفی کو قبول کرنا بہتر سمجھا۔

متعدد مقامات پر اس کمیشن کی کارروائیوں کے دوران تلخ جھگڑے، دھمکیاں اور شدید کشیدگی کے واقعات بھی سامنے آئے۔طالبان کے مختلف حلقوں میں یہ تاثر پھیلتا گیا کہ تصفیہ کمیشن دراصل احتساب کا نہیں بلکہ سیاسی صف بندی اور مخالفین کو کمزور کرنے کا آلہ ہے۔اس حوالے سے سب سے بڑا اعتراض یہ اٹھا کہ جن لوگوں پر جعلی مجاہدین کو شامل کرنے کا الزام تھا، یعنی قندھاری دھڑے کے عناصر۔کمیشن نے کارروائی کا آغاز ان علاقوں سے کیا جو حقانی گروپ یا اس کے اتحادیوں کے مضبوط مراکز سمجھے جاتے تھے۔بعض اہم کمانڈروں کو بھی طلب کر کے ان سے قسم یا ثبوت مانگا گیا، جس سے شدید غصہ پیدا ہوا۔طالبان کے عام سپاہیوں سے لے کر درمیانی درجے کے کمانڈروں تک میں یہ احساس بڑھتا گیا کہ مرکز دانستہ طور پر مخصوص دھڑوں کو کمزور کرنا چاہتا ہے۔اعلیٰ سطح کے کئی طالبان کمانڈر بھی نجی محفلوں میں اس پورے عمل کو ''احمقانہ، توہین آمیز اور نفرت پیدا کرنے والا'' قرار دیتے رہے، مگر اس کے باوجود یہ سلسلہ جاری ہے، اب اس کی شدت کم ہو گئی ہے کیونکہ جو مقاصد حاصل کرنا تھے کر لئے گئے۔

آج بھی طالبان کے اندر یہ تاثر مضبوط ہے کہ ہیبت اللہ گروپ جب چاہتا ہے، تصفیہ کمیشن کو بطور ہتھیار

استعمال کر کے کسی بھی مخالف یا ناپسندیدہ شخص کو نشانہ بنا دیتا ہے۔ کسی کو مجاہد ہونے کا ثبوت مانگ کر دیوار سے لگا دیا جاتا ہے اور نتیجہ اکثر برطرفی، بے عزتی یا تنہائی کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طالبان کے اندر مرکزی قیادت کے خلاف غصہ، بداعتمادی اور ردعمل مسلسل بڑھ رہا ہے۔ وہ تنظیم جو کبھی مشترکہ نظریے، قربانی اور سخت تنظیمی نظم کی مثال سمجھی جاتی تھی، آج اندرونی تقسیم، ذاتی وفاداریوں اور اقتدار کی کشمکش میں الجھتی جا رہی ہے۔ تصفیہ کمیشن بظاہر ایک انتظامی عمل تھا مگر اس نے طالبان کے اندر وہ نفرتیں بو دی ہیں جو مستقبل میں کسی بڑے تصادم کی بنیاد بن سکتی ہیں۔

## اقربا پروری اور میرٹ کا قتل

طالبان کے مختلف حلقوں، دہشت گردوں، کمانڈروں، سرکاری محکموں اور حتیٰ کہ انٹیلی جنس اداروں سے وابستہ افراد میں اس وقت سب سے زیادہ عام شکایت اقربا پروری، سفارش اور میرٹ کے فقدان کی ہے۔ تقریباً ہر سطح پر یہ احساس پایا جاتا ہے کہ نظام اہلیت کے بجائے تعلقات کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ جس شخص کے پیچھے کوئی طاقتور کمانڈر، وزیر یا بااثر شخصیت کھڑی ہو، اس کے لیے ہر دروازہ کھل جاتا ہے جبکہ عام طالبان برسوں کی قربانیوں کے باوجود نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ طالبان کے اندر یہ جملہ اب ایک تلخ مذاق کی صورت اختیار کر چکا ہے کہ ''کسی بڑے کا خط لے آؤ تو ناجائز کام بھی جائز ہو جاتا ہے۔'' اس ایک جملے میں پورے نظام کی تصویر سمٹ آتی ہے۔ سرکاری عہدے، تقرریاں، تبادلے، مراعات اور اختیارات اکثر سفارش اور ذاتی تعلقات کی بنیاد پر تقسیم ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام طالبان کے اندر احساس محرومی مسلسل بڑھ رہا ہے۔

خود ملا خیر خواہ نے نجی نشستوں میں اس بات کا اعتراف کیا کہ موجودہ نظام کا سب سے بڑا مسئلہ اقربا پروری اور میرٹ سے ہٹ کر فیصلے کرنا ہے۔ انہوں نے کئی مثالیں دیتے ہوئے کہا کہ بعض لوگ ایسے اہم عہدوں پر بیٹھے ہیں جنہیں نہ انتظامی معاملات کا علم ہے اور نہ حکمرانی کا تجربہ، مگر چونکہ وہ کسی وزیر، کمانڈر یا طاقتور شخصیت کے دوست یا رشتہ دار ہیں اس لیے انہیں اہم ذمہ داریاں سونپ دی گئی ہیں۔ دوسری طرف ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنہوں نے برسوں جنگ لڑی، سختیاں برداشت کیں مگر آج انہیں صرف اس لیے نظر انداز کیا جا رہا ہے کہ ان کے پاس سفارش نہیں۔ یہ صورتحال صرف انتظامی کمزوری تک محدود نہیں رہی بلکہ اس نے تنظیم کے اندر نفرت، بداعتمادی اور تقسیم کو بھی بڑھا دیا ہے۔

عام طالبان سپاہی محسوس کرتے ہیں کہ اقتدار اور وسائل چند مخصوص خاندانوں اور گروہوں کے ہاتھوں میں سمٹتے جا رہے ہیں۔ جو لوگ سرکاری محکموں میں شامل ہو جاتے ہیں انہیں باقاعدہ تنخواہیں، مراعات اور سہولتیں ملتی ہیں جبکہ باقی طالبان مالی مشکلات، بے روزگاری اور محرومی کا شکار رہتے ہیں۔ اسی فرق نے نچلی سطح پر شدید بے چینی پیدا کر دی ہے۔ کئی طالبان یہ سوال کرتے نظر آتے ہیں کہ جنگ اور قربانی اگر سب نے دی تھی تو پھر فائدہ صرف چند لوگوں کو کیوں پہنچ رہا ہے۔ یہی احساس آہستہ آہستہ غصے اور نفرت میں بدلتا جا رہا ہے اور تنظیم کے اندر دراڑوں کو مزید گہرا کر رہا ہے۔

## عمومی نتیجہ اور بڑھتا ہوا خطرہ

مختلف ملاقاتوں، طویل گفتگوؤں اور طالبان کے مختلف دھڑوں سے وابستہ افراد کے خیالات سننے کے بعد مجموعی طور پر جو تصویر سامنے آتی ہے وہ انتہائی تشویشناک ہے۔ اندرونی اختلافات اب محض سیاسی چپقلش یا اقتدار کی محدود کشمکش نہیں رہے بلکہ رفتہ رفتہ ایک ایسے بحران کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں جو مستقبل میں نئی خانہ جنگی کی بنیاد بن سکتا ہے۔ خطرہ صرف افغانستان تک محدود نہیں بلکہ اس کے اثرات پورے خطے میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ طالبان کے اندر اس وقت سب سے زیادہ نمایاں چیز بڑھتی ہوئی محرومی اور ناانصافی کا احساس ہے۔ مختلف صوبوں، محکموں اور عسکری حلقوں سے تعلق رکھنے والے طالبان میں یہ جملے بار بار سننے کو ملتے ہیں کہ ''ہمارا حق چھین لیا گیا''، ''ہمیں انصاف نہیں مل رہا'' اور ''ہم نے یہ قربانیاں اس دن کے لیے نہیں دی تھیں۔'' یہ جملے وقتی غصے یا جذباتی ردعمل تک محدود نہیں بلکہ ایک گہری بے چینی کی علامت بنتے جا رہے ہیں۔

نچلی سطح کے دہشت گردوں سے لے کر درمیانی درجے کے کمانڈروں تک یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ اقتدار، وسائل اور اختیارات ایک محدود گروہ کے ہاتھوں میں مرتکز ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ کیفیت اس لیے بھی خطرناک ہے کہ طالبان کی پوری تحریک برسوں تک مشترکہ جدوجہد، قربانی اور مذہبی وابستگی کے تصور پر قائم رہی۔ مگر اب جب یہی لوگ خود کو نظر انداز، بے اختیار یا ذلیل محسوس کرتے ہیں تو ان کے اندر غصہ اور ردعمل فطری طور پر بڑھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف حلقوں میں خاموش ناراضی اب کھلے شکووں اور شدید اختلافات میں تبدیل ہو رہی ہے۔ بہت سے طالبان یہ سمجھتے ہیں کہ اگر موجودہ طرزِ حکمرانی، اقربا پروری، تصفیہ کمیشن جیسے اقدامات اور اختیارات کی غیر مساوی تقسیم جاری رہی تو اندرونی تصادم کو روکنا مشکل ہو جائے گا۔

یہ خوف بھی پایا جاتا ہے کہ اگر یہ نفرتیں مزید بڑھیں تو مختلف دھڑے ایک دوسرے کے خلاف کھل کر صف آراء ہو سکتے ہیں۔ افغانستان پہلے ہی کئی دہائیوں سے جنگ، انتشار اور خونریزی کا شکار رہا ہے۔ اگر طالبان کے اندر یہ تقسیم مزید گہری ہوئی تو یہ صرف ایک تنظیمی بحران نہیں رہے گا بلکہ پورے ملک کے امن و استحکام کو ہلا کر رکھ سکتا ہے۔ اس کے اثرات سرحدوں سے باہر بھی محسوس ہوں گے اور خطہ ایک نئی غیر یقینی صورتحال کی طرف بڑھ سکتا ہے۔

## 5 خاندانوں کا اثر ورسوخ

قندھاری گروپ اس وقت طالبان کی موجودہ حکومت میں اپنے اختیارات، اثر ورسوخ اور معاشی گرفت کو مزید مضبوط بنانے پر پوری طرح مرکوز دکھائی دیتا ہے۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد سے ریاستی اداروں، اہم وزارتوں، سکیورٹی ڈھانچے اور تجارتی معاہدوں میں اسی گروہ کا اثر نمایاں طور پر بڑھا ہے۔ طالبان کے مختلف حلقوں میں یہ تاثر عام ہے کہ حکومت رفتہ رفتہ ایک محدود دائرے میں سمٹتی جا رہی ہے جہاں فیصلے چند مخصوص خاندانوں اور شخصیات کے گرد گھومتے ہیں۔ اقربا پروری اب طالبان حکومت کا ایک مستقل اور کھلا مسئلہ بن چکی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا وزیر، گورنر یا طاقتور کمانڈر ہو جس نے اپنے قریبی رشتہ داروں، دوستوں اور وفاداروں کو سرکاری وسائل، عہدوں اور مراعات سے نہ نوازا ہو۔

تقریباً ہر وزارت میں یہی صورتحال دکھائی دیتی ہے کہ اہم پوسٹوں پر میرٹ یا صلاحیت کے بجائے ذاتی تعلقات کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ کئی طالبان کمانڈر نجی محفلوں میں یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ کرپشن کے اس نظام میں رشتہ داروں پر زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے کیونکہ وہ راز داری برقرار رکھتے ہیں اور مالی معاملات باہر نہیں آنے دیتے۔ طالبان کے اندر اس وقت چند ایسے خاندانوں کا تذکرہ عام ہے جن پر نہ صرف مالی کرپشن بلکہ اختیارات کے ارتکاز، سرکاری وسائل کے ناجائز استعمال اور ریاستی فیصلوں پر اثر انداز ہونے کے الزامات لگتے رہتے ہیں۔ ان خاندانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حکومت کے بڑے فیصلوں سے لے کر اہم معاشی معاملات تک ان کی مداخلت موجود ہوتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ اعتراضات صرف مخالف دھڑوں یا عام عوام تک محدود نہیں بلکہ خود قندھاری گروپ کے اندر بھی اس حوالے سے بے چینی پائی جاتی ہے، مگر طاقتور حلقوں کی پشت پناہی کے باعث کوئی کھل کر آواز اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں۔ طالبان کے اہم رہنما سراج حقانی بھی مختلف مواقع پر اس

صورتحال پر تنقید کر چکے ہیں۔ان کا کہنا رہا ہے کہ ''ہم طالبان خود اقربا پروری میں مبتلا ہو چکے ہیں، اسی وجہ سے عوامی مسائل حل نہیں ہو رہے۔'' یہ بیان دراصل طالبان کے اندر بڑھتی ہوئی تشویش کی عکاسی کرتا ہے۔

یہ بات اب افغانستان میں کھلا راز بن چکی ہے کہ کسی بھی بڑی غیر ملکی سرمایہ کاری، معدنی معاہدے یا تجارتی ڈیل کے لیے مخصوص شخصیات کے ذریعے گزرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ چاہے معاملہ نجی کمپنیوں کا ہو یا چین، روس اور یورپی یونین جیسے ممالک کا، معاملات شہاب الدین دلاور، ان کے بیٹے روح اللہ شہاب، ملا متقی یا ان

کے بھائی احمد نبی متقی کے ذریعے طے ہوتے ہیں۔ یہ صرف ایک مثال ہے، مگر اسی نوعیت کی شکایات طالبان حکومت کے مختلف شعبوں کے بارے میں مسلسل سننے کو ملتی ہیں۔ ویسے تو دسیوں خاندان ہیں، لیکن جو چار خاندان پورے سسٹم پر حاوی ہیں، ان میں سرفہرست ملا متقی کا خاندان۔

## 1۔۔ملا امیر خان متقی:

وزیر خارجہ ملا امیر متقی کا خاندان سب سے زیادہ با اثر ہے۔

امیر خان متقی وزیر خارجہ

محمد نبی متقی: حکومتی سیکریٹری

احمد اللہ متقی: وزارت اطلاعات میں ڈائریکٹر

عبداللہ متقی: وزارت تعلیم میں ڈائریکٹر

امان اللہ متقی: وار کمیشن کارکن

احمد نبی متقی، 5 بھائی حکومتی عہدوں پر ہیں اور چھٹا احمد نبی متقی حکومت میں تو شامل نہیں لیکن حکومتی امور میں اہم کردار ضرور ادا کر رہا ہے۔

متقی خاندان اس وقت طالبان حکومت کے ان با اثر حلقوں میں شمار کیا جاتا ہے جن کے بارے میں افغانستان کے سیاسی، تجارتی اور حکومتی حلقوں میں مسلسل بحث جاری رہتی ہے۔ پانچ بھائی براہ راست حکومتی عہدوں اور طاقت کے مراکز سے جڑے ہوئے ہیں جبکہ چھٹا بھائی احمد نبی متقی بظاہر حکومت کا حصہ نہ ہونے کے باوجود پس پردہ کئی اہم معاملات میں کردار ادا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ سرکاری طور پر اس کا طالبان حکومت سے کوئی تعلق ظاہر نہیں کیا جاتا، وہ زیادہ تر دبئی میں مقیم رہتا ہے اور گولڈن ویزہ

ہولڈر بھی بتایا جاتا ہے، مگر اس کے باوجود افغانستان کے اندر اس کے وسیع کاروباری اور معاشی مفادات موجود ہیں۔

احمد نبی متقی ان لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے جنہوں نے امریکی موجودگی کے دور میں بھی اپنے کاروباری نیٹ ورک کو محفوظ رکھا اور طالبان کے اقتدار میں آنے کے بعد ان میں مزید توسیع کی۔ افغانستان میں چلغوزے کی تجارت پر ایک طرح سے اس کی اجارہ داری کا تاثر پایا جاتا ہے جبکہ کوئلے کی برآمدات کے کاروبار میں بھی اس کا اثر و رسوخ بتایا جاتا ہے۔ تاہم اصل اہمیت ان مبینہ معاشی معاہدوں کی ہے جن کا تعلق افغانستان کے معدنی وسائل اور مائننگ سیکٹر سے جوڑا جاتا ہے۔

طالبان کے مختلف حلقوں میں یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ افغانستان میں ہونے والے متعدد معدنی اور سرمایہ کاری کے معاہدوں میں بعض طاقتور شخصیات کے حصے رکھے جاتے ہیں۔ وزیر خارجہ امیر خان متقی کے بارے میں بھی یہی تاثر موجود ہے کہ مختلف سرمایہ کاری معاہدوں میں ان کا غیر اعلانیہ حصہ رکھا جاتا ہے، مگر چونکہ طالبان کابینہ اور شوریٰ کے ارکان کے لیے باضابطہ کاروباری شراکت پر پابندی موجود ہے، اس لیے یہ حصص ان کے بھائی احمد نبی متقی کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔

طالبان کے اندر یہ جملہ اکثر سننے کو ملتا ہے کہ ''ایک بھائی حکومت میں ہوتا ہے اور دوسرا کاروبار سنبھالتا ہے۔'' متقی خاندان کے حوالے سے ایک اور سنگین الزام بھی افغانستان کے سیاسی حلقوں میں زیر بحث رہتا ہے۔ یہ معاملہ ان افغان سیاستدانوں، افسروں اور مالدار شہریوں سے متعلق ہے جو طالبان کے اقتدار میں آنے کے بعد ملک چھوڑ کر بیرون ملک منتقل ہو گئے تھے۔ طالبان کے ابتدائی دور میں مصالحتی کمیشن کی سربراہی امیر خان متقی کے پاس رہی اور کہا جاتا ہے کہ ملک چھوڑنے والے بااثر افغانوں کی تفصیلات اور فہرستیں بھی انہی کے پاس موجود تھیں۔ طالبان مخالف حلقوں اور بعض اندرونی ذرائع کا دعویٰ ہے کہ بعد میں یہ معلومات احمد نبی متقی کو منتقل کی گئیں جس کے بعد اس نے بیرون ملک مقیم افغان شخصیات سے رابطے شروع کیے۔ الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ انہیں افغانستان واپسی، تحفظ اور حکومتی انتقام سے بچانے کی یقین دہانیوں کے بدلے بھاری رقوم وصول کی جاتی رہیں۔ اگرچہ ان الزامات کی سرکاری سطح پر کبھی تصدیق نہیں ہوئی، مگر طالبان کے مختلف دھڑوں اور سیاسی حلقوں میں یہ بات مسلسل زیر بحث رہتی ہے۔

متقی برادران پر ایک اور حساس الزام بھی لگایا جاتا ہے جس نے طالبان کے اندر اختلافات کو مزید گہرا

کیا۔بعض طالبان حلقے اور اہم شخصیات یہ دعویٰ کرتی رہی ہیں کہ احمد نبی متقی کے امریکی اداروں اور انٹیلی جنس حلقوں سے رابطے موجود رہے ہیں۔اس پورے معاملے کی دلچسپ اور طالبان کے عامد ہشت گردوں کے لیے تکلیف دہ بات یہ سمجھی جاتی ہے کہ متقی خاندان کے بیشتر افراد کا کسی بھی مرحلے پر عملی جنگ، محاذ یا عسکری جدوجہد سے براہ راست تعلق نہیں رہا۔خود امیر خان متقی طالبان کی پوری جدوجہد میں نمایاں نظر آتے ہیں تاہم ان کے علاوہ باقی بھائیوں کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ انہوں نے جنگی دور پاکستان، دبئی اور قطر میں نسبتاً آرام دہ زندگی گزاری جبکہ آج اقتدار، کاروبار اور وسائل پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی جارہی ہے۔یہی چیز طالبان کی نچلی صفوں میں غصے، احساس محرومی اور بداعتمادی کو مزید بڑھارہی ہے۔

## 2۔شہاب الدین دلاور فیملی

شہاب الدین دلاور سربراہ افغانستان ریڈ کراس، سابق وزیر معدنیات

مغفور اللہ شہاب (بیٹا): ازبکستان میں سفیر

روح اللہ شہاب (بیٹا): نائب وزیر اعظم کے دفتر میں سینئر بیوروکریٹ

شمس الدین (داماد): کابل ڈیولپمنٹ ایجنسی میں ڈائریکٹر

معید اللہ احساس (بھتیجا): وزارت خارجہ میں مشیر

مولوی شہاب الدین دلاور طالبان کے اہم لیڈر ہیں، معتدل سمجھے جاتے ہیں، قطر مذاکرات میں بھی شامل رہے۔ملاعمر حکومت کے دوران پاکستان میں سفیر بھی رہے ہیں، اکوڑہ خٹک سے پڑھے اور بعد میں پڑھاتے بھی رہے ہیں۔موجودہ رجیم میں پہلے وزیر معدنیات بنائے گئے، جولائی 2024 میں انہیں وزارت سے ہٹا کر افغان ریڈ کریسنٹ سوسائٹی کے سربراہ بنادئے گئے، اس وقت افغان میڈیا نے بھی رپورٹ کیا تھا کہ موصوف پر کرپشن اور اقرباء پروری کے الزامات تھے، یعنی جہاں پوری حکومت ہی لوٹ مار میں لگی ہے، وہاں بھی انہیں کرپشن پر عہدے سے ہٹادیا گیا۔اب تازہ ترین الزام یہ ہے کہ موصوف نے اپنے محکمے افغان ریڈ کریسنٹ سوسائٹی میں اپنے علاقے لوگر سے اپنے خاندان کے کم از کم 22 افراد کو بھرتی کرچکے ہیں۔میرٹ نصرف رشتے داری ہے۔

## 3۔۔ملا یوسف وفا:

یوسف وفا گورنر بلخ ہیں ماضی میں یہ گورنر قندھار رہے ہیں، ان کا خاندان غیر رسمی تجارت یعنی سمگلنگ سے منسلک ہے۔امریکی انخلا کے دوران اس نے مختلف اسلحہ ڈپوؤں پر قبضہ کیا۔ اس کے قریبی افراد اہم سرکاری عہدوں پر موجود ہیں، جبکہ بعض کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ غیر قانونی اسلحہ اور وسائل پر اثر رکھتے ہیں۔

## 4۔۔ملا عمر کا خاندان:

ملا عمر نے اپنے دور میں خاندان کو حکومتی عہدوں سے دور رکھا تھا، لیکن اب ان کے بیٹے ملا یعقوب، بھائی ملا منان عمری اور دیگر رشتہ دار حکومتی معاملات میں اثر ورسوخ رکھتے ہیں۔

## 5۔۔وزیر صحت مولوی نور جلال جلالی

مئی 2024 سے وزیر صحت ہیں اس سے پہلے ڈپٹی وزیر داخلہ تھے۔ایک کزن مولوی نجیب اللہ حقانی وزیر شہری ترقیات وہاؤسنگ میں بیوروکریٹ ہیں، دوسری جانبوزارت صحت کے ہیڈکوارٹرز کو انہوں نے خاندانی آنگن میں بدل ڈالا ہے۔کم از کم تین بھتیجے ایک برادر نسبتی وزارت کے اہم ترین عہدوں پر بیٹھے ہیں، جن میں چیف آف سٹاف، ڈائریکٹر ہیونم رسوسز، ڈائریکٹر نارکوٹکس میڈیسنز، چیف آف ہیڈکوارٹرز کے عہدے شامل ہیں۔موصوف کے صاحبزادے کسی سرکاری عہدے پر تو نہیں، لیکن متقی کے چھوٹے بھائی کی طرح خاندان کی لوٹ مار کو ٹھکانے لگانے کا کام کرتے ہیں۔وزارت کے اندر 100 سے زائد رشتہ داروں اور اپنے ساتھیوں کو مختلف عہدوں پر تقرر کر رکھا ہے۔

## کرپشن کی کہانیاں

طالبان کے موجودہ حکومتی ڈھانچے کے بارے میں مختلف اندرونی ذرائع، مقامی مشاہدات اور ذمہ دار حلقوں سے حاصل ہونے والی معلومات ایک ایسی تصویر پیش کرتی ہیں جو بظاہر استحکام کے دعووں کے برعکس اندرونی کمزوریوں، بداعتمادی اور انتظامی بگاڑ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔مجموعی طور پر جو رجحان سامنے آرہا ہے وہ یہ ہے کہ ریاستی نظام کے اندر کرپشن اب ایک محدود یا وقتی مسئلہ نہیں رہا بلکہ ایک وسیع، مربوط اور بااثر نیٹ ورک کی شکل اختیار کر چکا ہے جو مختلف اداروں اور شعبوں میں اپنی جڑیں مضبوط کر رہا

ہے۔اندرونی سطح پر یہ تاثر بار بار دہرایا جاتا ہے کہ حکومتی ڈھانچے میں فیصلے اکثر میرٹ، تجربے یا ریاستی مفاد کے بجائے ذاتی تعلقات، گروہی وابستگیوں اور وفاداریوں کی بنیاد پر کیے جا رہے ہیں۔اس طرزِ عمل نے نہ صرف انتظامی معیار کو متاثر کیا ہے بلکہ ادارہ جاتی توازن کو بھی کمزور کر دیا ہے۔

معدنی وسائل، تجارتی راستے، سرکاری ٹھیکے اور بڑے اقتصادی معاہدے اب ایسے حساس شعبے بن چکے ہیں جہاں مفادات کی کشمکش واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔کئی ذرائع یہ نشاندہی کرتے ہیں کہ ریاستی وسائل کی تقسیم میں ایک واضح غیر مساوات پیدا ہو چکی ہے۔بعض مخصوص حلقے اور بااثر گروہ فیصلہ سازی کے عمل پر غیر معمولی اثر و رسوخ رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے مجموعی نظام میں شفافیت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ اسی کے نتیجے میں عام سطح پر یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ اقتدار اور وسائل چند محدود ہاتھوں میں سمٹ رہے ہیں جبکہ وسیع تر طبقہ محرومی کا شکار ہے۔طالبان کے اندرونی حلقوں میں یہ بات بھی تسلسل سے سننے کو ملتی ہے کہ موجودہ نظام میں وہ افراد زیادہ فائدہ اٹھا رہے ہیں جن کے تعلقات طاقتور مراکز سے جڑے ہوئے ہیں، جبکہ وہ دہشت گرد اور کارکن جنہوں نے برسوں سخت حالات میں جدوجہد کی، اکثر نظر انداز ہو رہے ہیں۔ اس احساسِ محرومی نے نچلی سطح پر بے چینی کو جنم دیا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔یہ بے چینی صرف جذباتی سطح تک محدود نہیں بلکہ بعض علاقوں میں یہ انتظامی اختلافات اور مقامی تنازعات کی شکل بھی اختیار کر رہی ہے۔

اندرونی ذرائع اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مالی بدعنوانی اور اختیارات کے ناجائز استعمال کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے۔اگرچہ اس حوالے سے سرکاری سطح پر واضح اعداد و شمار یا جامع رپورٹیں سامنے نہیں آتیں، لیکن مختلف سطحوں پر ہونے والی گفتگو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ بدعنوانی اب انتظامی ڈھانچے کے مختلف حصوں میں سرایت کر چکی ہے۔بعض سینئر افراد نجی محفلوں میں یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ دور میں مالی بے ضابطگیوں کا رجحان پہلے کے مقابلے میں زیادہ واضح ہے۔کابل، قندھار اور دیگر اہم مراکز میں یہ تاثر بھی مضبوط ہے کہ سرکاری تقرریاں اور اہم عہدوں پر تعیناتیاں اکثر ذاتی تعلقات اور سفارش کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔اس سے ایک ایسا ماحول پیدا ہوا ہے جس میں اہلیت اور کارکردگی کے بجائے وابستگی اور وفاداری زیادہ اہم سمجھی جانے لگی ہے۔نتیجتاً اداروں کی مجموعی کارکردگی متاثر ہو رہی ہے اور انتظامی نگرانی کا نظام کمزور پڑ رہا ہے۔

زمینوں کی الاٹمنٹ، تجارتی معاہدوں میں کمیشن، اور بعض علاقوں میں غیر قانونی معاشی سرگرمیوں کے بارے میں بھی شکایات سامنے آتی رہتی ہیں۔ اگرچہ ان الزامات کی مکمل تصدیق مشکل ہے، لیکن ان کا مسلسل ذکر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اعتماد کا بحران بڑھ رہا ہے۔ جب کسی نظام کے بارے میں شکوک عام ہو جائیں تو اس کی ساکھ خود بخود متاثر ہونے لگتی ہے، چاہے سرکاری سطح پر دعوے کچھ بھی ہوں۔ ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ احتساب اور نگرانی کے ادارے یا تو کمزور ہیں یا پھر ان کی فعالیت محدود دکھائی دیتی ہے۔ مختلف حلقوں میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ طاقت کے مراکز ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ کسی بھی سطح پر مکمل احتساب ممکن نہیں رہتا۔ ہر بااثر شخص کسی نہ کسی نیٹ ورک کا حصہ ہے، جس کی وجہ سے نظام کے اندر توازن قائم رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔

یہ صورتحال صرف انتظامی مسائل تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کے سماجی اور سیاسی اثرات بھی واضح ہونے لگے ہیں۔ عام شہریوں میں مایوسی بڑھ رہی ہے، جبکہ اندرونی سطح پر بداعتمادی ایک مستقل کیفیت اختیار کر چکی ہے۔ بعض علاقوں میں معمولی اختلافات بھی بڑے تنازعات میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو اس بات کی علامت ہے کہ ادارہ جاتی گرفت کمزور ہو رہی ہے۔ طالبان کے اندر موجود بعض افراد یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اگر یہی رجحان جاری رہا تو مستقبل میں یہ صورتحال مزید پیچیدہ ہو سکتی ہے۔ وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم، تقرریوں میں جانبداری اور مالی بے ضابطگیوں کا تسلسل نہ صرف انتظامی بحران کو بڑھا سکتا ہے بلکہ اندرونی سطح پر کشیدگی کو بھی جنم دے سکتا ہے۔ اس بات کو ایک ممکنہ بڑے بحران کے ابتدائی اشارے کے طور پر دیکھا جانا چاہئے۔ ان کے مطابق جب کسی نظام میں شفافیت کم ہو جائے، ادارے کمزور پڑ جائیں اور عوامی اعتماد متاثر ہونے لگے تو وہاں عدم استحکام کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ افغانستان جیسے ملک میں جہاں پہلے ہی طویل عرصے سے سیاسی اور سماجی پیچیدگیاں موجود رہی ہیں، ایسی صورتحال مزید حساسیت اختیار کر سکتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ نظام ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے جہاں داخلی اصلاحات، شفافیت اور میرٹ کی بحالی کے بغیر استحکام برقرار رکھنا ایک بڑا چیلنج بنتا جا رہا ہے۔ اگر ادارہ جاتی اصلاحات نہ کی گئیں تو اندرونی اختلافات اور بداعتمادی کا یہ دائرہ مزید وسیع ہو سکتا ہے، جس کے اثرات نہ صرف انتظامی سطح پر بلکہ پورے سماج اور خطے پر بھی مرتب ہونے کا خدشہ موجود ہے۔

## وزارت صحت میں لوٹ مار

طالبان کی وزارت صحت بدعنوانی، رشوت خوری اور اقربا پروری کی ایک بڑی اور بڑی اور بری مثال بن چکی ہے۔ مئی 2024 میں مولوی نور جلال جلالی کو وزیر مقرر کیا گیا تھا، وہ اس سے قبل نائب وزیر داخلہ تھے۔ ان کے آتے ہی، کرپشن کے جیسے دروازے کھل گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مارچ 2026 کے آخر میں طالبان انٹیلی جنس (ڈائریکٹوریٹ 08) نے وزارت صحت کے کئی افسروں کو گرفتار کرنا شروع کیا، جن میں وزیر صاحب کا برادر نسبتی حکمت اللہ حکمت اور بھتیجہ نوراللہ درویش (دستاویزات اور مواصلات کا سربراہ) بھی شامل تھا۔ موصوف فارمیسیوں اور دوائیوں کے ہول سیل ڈسٹری بیوٹرز کو اجازت نامے جاری کرنے کے بدلے رشوت لیتے تھے۔ فارمیسی کا پرمٹ 5 ہزار امریکی ڈالر میں ملتا تھا اور رشوت ڈالرز میں وصول کی جاتی تھی۔

4 اپریل 2026 کو طالبان انٹیلی جنس نے وزیر صحت مولوی نور جلال جلالی کے گھر پر چھاپہ مارا، اور وزیر کے رشتہ دار کئی اعلیٰ افسروں کو اٹھا لیا گیا۔ جن میں جہاں اس چھاپے کا مقصد وزیر سے براہ راست منسلک افراد کو گرفتار کرنا تھا جو مالی اور انتظامی بدعنوانی میں ملوث تھے، جن میں چیف آف سٹاف، سینئر مشیر، نارکوٹکس کنٹرول ہیڈ، ہیومن رسورسز ہیڈ، علاج معالجہ ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ، منصوبہ بندی اور دیگر شعبوں کے سربراہان شامل تھے۔ موصوف کا بیٹا بھی اس کرپشن میں شامل تھا، جو تر کی فرار ہو چکا ہے۔ اس پر فارماسیوٹیکل کمپنیوں سے 64 ہزار امریکی ڈالر اور کئی بلٹ پروف گاڑیاں رشوت میں لینے کا الزام ہے۔

وزارت کے اہم عہدے خاندانی رشتہ داروں کو دیے گئے تھے اور بین الاقوامی امداد پر چلنے والے صحت کے شعبے میں رشوت کا نیٹ ورک چل رہا تھا۔ کرپشن کی مالیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف ایک مشیر جس کا نام عبداللہ اسرائیل ہے، طالبان نے اسے خصوصی طور وزرت صحت میں مشیر لگایا گیا تھا اور تقرر کے خط میں لکھا گیا تھا کہ ''چونکہ موصوف امریکہ کی یہاں موجودگی کے دوران امریکیوں سے وابستہ رہے ہیں، اس لئے انہیں مشیر لگا دیا جائے، تاکہ وہ عالمی فنڈنگ حاصل کر سکیں۔'' اسی موصوف نے وزیر صحت کو درجنوں بکتر بند گاڑیاں رشوت میں وصول کر کے تحفہ میں دیں، جن میں سے 24 گاڑیاں مبینہ طور پر ذاتی کاروبار کے لیے استعمال کی گئیں یا کرائے پر دی گئی، پکڑی جا چکی ہیں۔ اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس مشیر خاص کی کرپشن کا اصل حجم کیا ہو سکتا ہے؟

اس میں سب سے دلچسپ اور شرمناک بات یہ ہے کرپشن ثابت ہوجانے اور مال برآمد ہوجانے کے باوجود صرف دو دن کے بعد تمام ملزمان کو باعزت بری کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ ملا ہیبت اللہ کے جنوری 2026 میں نافذ کئے گئے نئے قانون کے تحت کیا گیا، جس میں علما اور اشراف کو تعزیر یعنی سزا سے ماوریٰ قرار دے دیا گیا ہے۔

## وزارت معدنیات کرپشن کی کان

افغانستان میں معدنی وسائل کی کرپشن ایک طویل مدتی اور گہرا مسئلہ ہے، جو نہ صرف پرانے حکومتی دور میں بلکہ طالبان کے زیرِ انتظام بھی جاری ہے۔ طالبان کے اقتدار سنبھالنے سے صرف 2024 تک، 156 کمپنیوں کے ساتھ 205 سے زائد کانوں کے معاہدے کیے گئے۔ صرف ستمبر 2023 میں انہوں نے 6 عشاریہ 5 بلین ڈالر کے معاہدوں کا اعلان کیا گیا۔ اس وزارت میں کرپشن کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملا ہیبت اللہ نے کرپشن کی بنیاد پر سابق وزیر شہاب الدین دلاور کو وزارت سے ہٹایا اور کوئی دوسری وزارت دینے کے بجائے ہلال احمر کا سربراہ لگا دیا، یہ الگ بات کہ موصوف نے وہاں بھی اپنے ہی کرپشن کے ریکارڈ توڑ ڈالے۔

اندرونی تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق 14 کیسز چوری اور کرپشن کے ثابت ہوئے، لوٹ کی یہ رقم ہنڈی کے ذریعہ سے بیرون ملک منتقل کی گئی، جبکہ ایک ایک بڑی رقم وصول ہی دبئی میں ان کے بیٹے کے اکاؤنٹ میں کی گئی۔ اس رپورٹ کے مطابق صرف سمنگان میں دانِ طور اور گرمک اضلاع میں کوئلے کی کانوں سے حاصل ہونے والی آمدنی میں سے 25 ملین ڈالر چوری کیے گئے۔ ستمبر 2023 میں کرپشن کی یہ داستان سامنے آنے کے بعد ملا ہیبت اللہ نے اسی وزارت کے ایک افسر سیف اللہ طیب کو تحقیقات کا حکم دیا، جس نے صرف 10 دن میں ایک ہوشربا رپورٹ پیش کردی، وہ شائد سمجھا تھا کہ اس پر کوئی کارروائی ہوگی، لیکن دو سال بیت جانے کے باوجود ملا ہیبت اللہ نے کارروائی تو کیا کرنی تھی، رپورٹ ہی دفن کردی۔ فروری 2026 میں طالبان کی وزارت معدنیات کے چھ کان کنی ٹھیکوں کی اندرونی آڈٹ دستاویزات لیک ہوئی ہیں۔ بین الاقوامی معیار کے اس آڈٹ کے مطابق وزارت معدنیات میں کرپشن کا حجم تقریباً 5 عشاریہ 14 ارب افغانی لگایا جارہا ہے۔

طالبان ذرائع کے مطابق معدنیات کی وزارت طالبان حکومت میں سب سے زیادہ مالی فوائد والی

وزارتوں میں شمار ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے مختلف دھڑوں کے درمیان اس وزارت پر اثر ورسوخ کے لیے کشمکش موجود رہی۔ اہم کان کنی معاہدے مخصوص خاندانوں، بااثر کمانڈروں اور کاروباری نیٹ ورکس کے ذریعے تقسیم کیے جاتے تھے۔

## وزارت داخلہ میں لوٹ مار

2022 افغانستان کی وزارت داخلہ کے لیے وہ سال ثابت ہوا جب بدعنوانی نے ایک باقاعدہ اور منظم شکل اختیار کرنا شروع کر دی۔ سب سے نمایاں تبدیلی سرکاری ٹھیکوں کی تقسیم کے طریقہ کار میں آئی۔ ٹھیکے ریوڑیوں کی طرح قریبی رشتہ داروں، قبائلی ساتھیوں اور ان افراد کو دیے جانے لگے جو یہ ٹھیکے خرید سکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ادارے کے اندر ایک محدود حلقہ وسائل پر قابض ہو گیا، جبکہ دیگر اہلکار صرف عملدرآمد تک محدود ہو کر رہ گئے۔ اسی کے ساتھ ٹھیکوں کی مالیت میں غیر معمولی اضافہ دیکھنے میں آیا۔ کئی کیسز میں اصل ضرورت یا مارکیٹ ریٹ سے کہیں زیادہ قیمتیں ظاہر کی گئیں۔ یہ اضافہ محض کاغذی نہیں تھا بلکہ ایک طے شدہ طریقہ کار کے تحت کیا جاتا تھا، جس کے بعد اس اضافی رقم کا ایک حصہ واپس متعلقہ افسران یا نیٹ ورک کو دیا جاتا تھا۔ یوں کمیشن یا "کِک بیک" کا ایک غیر رسمی مگر مضبوط نظام قائم ہو گیا۔ اس نظام میں ٹھیکہ دار، درمیانی رابطہ کار اور فیصلہ ساز سب ایک زنجیر میں جڑے ہوتے ہیں۔ سپلائی چین بھی اس بدعنوانی سے محفوظ نہ رہ سکی۔ گاڑیوں، اسلحہ اور لاجسٹکس کے شعبوں میں کم معیار کے سامان کی مہنگی خریداری عام ہے۔ دوسری تبدیلی یہ سامنے آئی کہ خریداری کے بڑے فیصلے چند مخصوص افراد تک محدود کر دیے گئے، جن کا سرکاری اہلکار ہونا بھی ضروری نہیں تھا۔ 2023 میں وزارت داخلہ کے اندر ایندھن کی تقسیم سے متعلق بدعنوانی ایک منظم اور مالی طور پر بڑے اسکینڈل کی شکل اختیار کر گئی۔ اس مرحلے پر بدعنوانی محض بے ضابطگی نہیں رہی بلکہ ایک باقاعدہ نظام میں ڈھلتی دکھائی دی، جس میں سرکاری وسائل کو منظم طریقے سے ہدف بنایا گیا۔ سب سے نمایاں پہلو پولیس اور دیگر سکیورٹی یونٹس کے لیے مختص ایندھن میں بڑے پیمانے پر خرد برد تھا۔ بعض افسران اور ایندھن سپلائی کمپنیوں کے درمیان خفیہ مفاہمت کے شواہد بھی سامنے آئے۔ ایندھن سپلائی کے کم از کم 20 سے 30 فیصد ٹھیکے اب تک ایسے ہی غیر شفاف معاہدوں کے تحت چل رہے ہیں۔

## پاسپورٹ آفس کرپشن کا گڑھ

کرپشن کی دوڑ میں افغانستان کا پاسپورٹ آفس سب سے آگے ہے۔ یہ ادارہ نہ صرف عام شہریوں کے لیے دستاویزات کا ذریعہ ہے بلکہ اب جعلی پاسپورٹوں، رشوت اور دہشت گردوں کی سہولت کاری کا منظم مرکز بن چکا ہے۔ فروری 2025 میں سامنے آنے والا انکشاف اس بات کی واضح دلیل ہے کہ پاسپورٹ ڈپارٹمنٹ میں کرپشن اب کوئی چھوٹی بے ضابطگی نہیں رہی بلکہ ایک منظم، منافع بخش اور خطرناک دھندہ بن چکا ہے۔ یہ سکینڈل اس وقت کھلا جب افغان انٹیلی جنس ڈائریکٹوریٹ (جی ڈی آئی) اور وزارت داخلہ کی مشترکہ تحقیقات میں کابل اور مزار شریف کے پاسپورٹ دفاتر میں پاسپورٹ فروخت کیے جانے کا انکشاف ہوا۔ ابتدائی طور پر پاسپورٹ ڈپارٹمنٹ کے سربراہ عبدالکریم حسیب سمیت وزارت داخلہ اور خارجہ امور کے کئی اعلیٰ اہلکاروں کو رشوت اور بدعنوانی کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ ان پر غیر ملکی شہریوں کو جعلی افغان پاسپورٹ جاری کرنے کا سنگین الزام تھا۔ تاہم، صرف چند دن بعد ملا ہبت اللہ اخونزادہ کے دفتر کی براہ راست مداخلت پر تمام گرفتار افراد کو رہا کر دیا گیا۔ یہ واقعہ طالبان نظام میں احتساب کی کمزوری اور اعلیٰ قیادت کی مداخلت کی ایک واضح مثال بن گیا۔ ایک سینئر طالبان عہدیدار، جو نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بات کر رہے تھے، نے بتایا کہ ایک پاسپورٹ کی قیمت 2 ہزار امریکی ڈالر میں فروخت ہو رہی ہے۔ اس طرح صرف ایک سال کے اندر یہ دھندہ 20 ملین امریکی ڈالر سے زیادہ کا بن چکا ہے۔ یہ رقم براہ راست پاسپورٹ دفاتر سے نکل کر اعلیٰ طالبان اہلکاروں کے ذاتی نیٹ ورک تک پہنچ رہی ہے۔ یہ کرپشن صرف کابل کے مرکزی دفتر تک محدود نہیں بلکہ مزار شریف، ننگرہار اور ہرات کے پاسپورٹ دفاتر میں بھی مکمل طور پر فعال ہے۔ ہر دفتر میں ایک الگ الگ نیٹ ورک کام کر رہا ہے جو رشوت، جعلسازی اور دستاویزات کی تبدیلی پر مبنی ہے۔ پچھلے تین سالوں میں پاسپورٹ آفس میں بدعنوانی کے الزام میں لاتعداد ملازمین کو نوکری سے نکالا جا چکا ہے۔ فروری 2026 میں ہی پانچ خواتین اور دو مردوں کو بغیر مکمل تحقیقات کے برطرف کر دیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہماری معتبر ذرائع کے مطابق اصل کرپشن اعلیٰ طالبان اہلکار خود کر رہے ہیں، مگر اسے بہانہ بنا کر غیر پشتون (خاص طور پر ہزارہ اور تاجک) ملازمین کو بغیر کسی جواز کے نوکریوں سے نکالا جا رہا ہے۔ یہ ایک سوچی سمجھی حکمت عملی لگتی ہے جس میں کرپشن کا الزام لگا کر نسلی بنیاد پر صفائی کی جا رہی ہے۔ پشتون اہلکاروں کو تحفظ دیا جا رہا ہے جبکہ غیر پشتون ملازمین کو نشانہ بنایا

جارہا ہے۔اس سے نہ صرف دفتر میں نسلی تقسیم بڑھ رہی ہے بلکہ کرپشن کا ماحول بھی مزید سازگار ہوتا جارہا ہے۔جب ملازمین کو پتہ چل جاتا ہے کہ نوکری محفوظ نہیں تو وہ رشوت لینے میں زیادہ تیار ہوجاتے ہیں۔یہ سکینڈل صرف اندرونِ ملک تک محدود نہیں۔سورسز کا دعویٰ ہے کہ افغانستان سے باہر قونصل خانوں سے بھی لاتعداد لوگوں کو افغان پاسپورٹ جاری کیے گئے جن کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔پاسپورٹ آفس میں کرپشن کا ماڈل اب ایک منظم نیٹ ورک کی شکل اختیار کرچکا ہے۔رشوت، جعلسازی اور دہشت گردوں کی سہولت کاری ایک ساتھ چل رہی ہے۔یہ کرپشن آسان اس لئے ہے کہ طالبان کا پاسپورٹ نظام کمپیوٹرائزڈ نہیں ہے، ریکارڈ کو تبدیل کرنا یا تلف کرنا بہت آسان ہے۔

فروری 2025 کا یہ انکشاف طالبان حکومت کی شفافیت اور احتساب کے دعووں کو ایک بار پھر کھوکھلا ثابت کرتا ہے۔جب پاسپورٹ جیسا حساس ادارہ کرپشن کا گڑھ بن جائے تو اس کا اثر نہ صرف افغان عوام پر پڑتا ہے بلکہ پوری دنیا کی سلامتی متاثر ہوتی ہے۔پاسپورٹ آفس کی یہ کرپشن طالبان نظام کی ایک بڑی حقیقت کو سامنے لاتی ہے۔اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے بدعنوانی ختم کرنے کا دعویٰ کیا تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ کرپشن نے صرف شکل بدل لی ہے۔اب یہ خاندانی نیٹ ورکس، نسلی تعصب اور اعلیٰ عہدوں پر بیٹھے لوگوں کے ذاتی مفادات کی شکل اختیار کرچکی ہے۔پاسپورٹ آفس اس کا سب سے واضح اور خطرناک مثال ہے جہاں رشوت کا کاروبار کھلے عام چل رہا ہے۔اس صورتحال میں افغان عوام کے لیے پاسپورٹ حاصل کرنا نہ صرف مہنگا بلکہ خطرناک بھی ہوگیا ہے۔جو لوگ قانونی طریقے سے پاسپورٹ حاصل کرتے ہیں انہیں بھی مشکوک نظروں سے دیکھا جارہا ہے۔دوسری طرف جعلی پاسپورٹ والے لوگ آزادانہ سفر کررہے ہیں۔یہ ایک ایسا نظام ہے جو نہ صرف اندرونی طور پر کمزور ہے بلکہ بیرونی دنیا کے لیے بھی سنگین خطرہ بن چکا ہے۔طالبان قیادت اگر واقعی بدعنوانی ختم کرنا چاہتی ہے تو سب سے پہلے پاسپورٹ آفس کو نشانہ بنانا ہوگا۔ریکارڈ کو مکمل طور پر ڈیجیٹل بنانا، نسلی تعصب ختم کرنا، اعلیٰ اہلکاروں کا احتساب کرنا اور قونصل خانوں پر سخت نگرانی کرنا ناگزیر ہے۔ورنہ یہ کرپشن کا گڑھ نہ صرف طالبان حکومت کی ساکھ تباہ کرے گا بلکہ پورے افغانستان کو عالمی تنہائی کی طرف دھکیل دے گا۔

## وزیرِ انصاف، انصاف کا قاتل:

طالبان کے وزیرِ انصاف عبدالحکیم شرعی انصاف کی فراہمی کے بجائے ناانصافی اور اختیارات کے غلط

استعمال کی علامت بن چکے ہیں۔ طاقت کا ناجائز استعمال، عدلیہ میں بدعنوانی، انتظامی ناانصافی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ان کی شناخت بن چکی ہیں۔ گزشتہ چار برسوں کے دوران انہوں نے 700 سے زائد ملازمین کو برطرف کیا، سرکاری و نجی جائیدادوں پر قبضے کیے اور اپنے قریبی ساتھیوں اور خاندان کے افراد کو اہم عہدوں اور مراعات سے نوازا۔ ان برطرفیوں میں بڑی تعداد غیر پشتون اور مذہبی و لسانی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے ملازمین کی تھی، جنہیں حکومتی پالیسیوں، سوشل میڈیا سرگرمیوں اور "عدم وفاداری" جیسے الزامات کی بنیاد پر ہٹایا گیا۔

شرعی نے ملازمین کے موبائل فون ضبط کیے، سوشل میڈیا اکاؤنٹس کی جانچ پڑتال کی، اور اس بنیاد پر تجربہ کار عملے کی جگہ دینی مدارس کے طلبہ کو تعینات کیا، جن میں اکثریت پشتون پس منظر کی ہے۔ برطرف ملازمین کی سروس فائلیں بھی ان کے قبضے میں رکھی جاتی ہیں تاکہ انہیں مستقل دباؤ میں رکھا جاسکے۔

شرعی نے ذاتی مفادات کے تحفظ کے لیے اپنے ذاتی مویشی خانے میں ایئر کنڈیشنر نصب کروایا اور وزارت کے سبزہ زاروں کو اسی مقصد کے لیے مختص کر دیا۔ یہ اقدامات اختیارات کے ناجائز استعمال اور سرکاری وسائل کے غلط استعمال کی واضح مثالیں ہیں، جنہوں نے انتظامی اور عدالتی نظام پر منفی اثرات مرتب کیے۔

یہ بھی اطلاعات ہیں کہ انہوں نے اراضی پر قبضہ روکنے کے لیے قائم کمیشن کو وزارت کا درجہ دے کر اس کے اختیارات کو ذاتی مفاد اور رشوت ستانی کے لیے استعمال کیا۔ ایک ہی وقت میں وہ دو وزارتوں کے اختیارات استعمال کرتے ہیں اور اپنے قریبی افراد کو اہم عہدوں پر فائز رکھتے ہیں، جس سے ادارہ جاتی شفافیت متاثر ہوئی ہے۔ ان کے اقدامات صرف انتظامی سطح تک محدود نہیں رہے بلکہ عدالتی نظام میں بھی مداخلت کی گئی۔ ان کے دور میں غیر قانونی گرفتاریوں، مقدمات میں سیاسی مداخلت اور عدالتی فیصلوں میں تعصب کے متعدد واقعات رپورٹ ہوئے۔ خاص طور پر ایک واقعے میں ایک نجی حراستی مرکز قائم کیا گیا جہاں شہریوں کو بغیر عدالتی حکم کے قید رکھا گیا، جو بنیادی انسانی حقوق اور عدالتی شفافیت کے لیے سنگین خطرہ ہے۔ عدلیہ میں امتیازی سلوک بھی عام ہو چکا ہے، جہاں غیر پشتون اور اقلیتی گروہ، خصوصاً شیعہ اور ہزارہ برادری، عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ عدالتی کارروائیوں میں شفافیت کی کمی نے نسلی اور مذہبی تعصب کے خدشات کو مزید بڑھا دیا ہے۔

طالبان کی عدلیہ کے اعلیٰ عہدوں، بشمول چیف جسٹس عبدالحکیم حقانی، کے فیصلوں پر بھی سیاسی اثر ورسوخ اور طاقتور گروہوں کے حق میں جھکاؤ کے الزامات بڑھ رہے ہیں۔ انصاف کے نفاذ کے بجائے اکثر فیصلے سیاسی دباؤ، ذاتی مفادات اور غیر شفاف عمل کے تحت کیے جا رہے ہیں، جس سے افغانستان کے عدالتی نظام کی بنیادیں کمزور ہو رہی ہیں۔

## وزیر تعلیم کا کارنامہ

6 اپریل کو سامنے آنے والی ایک رپورٹ نے افغان طالبان حکومت کے اندر طاقت، مفاد اور جائیداد کے تنازعات کے حوالے سے ایک اور سنگین بحث کو جنم دیا۔ یہ معاملہ بظاہر ایک کاروباری تنازع کے طور پر شروع ہوا، مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس نے ریاستی طاقت کے استعمال، جائیدادوں کی منتقلی اور بااثر شخصیات کے کردار کے حوالے سے کئی سوالات کھڑے کر دیے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق طالبان کے خوف اور دباؤ کے باعث ملک چھوڑنے والے بعض مالدار افغان شہریوں کو بعد میں مختلف اوقات میں ''واپسی اور تحفظ'' کی یقین دہانیوں کے ذریعے افغانستان واپس لایا گیا۔ تاہم واپس آنے والے بعض افراد کا دعویٰ ہے کہ انہیں قانونی تحفظ دینے کے بجائے ان کی جائیدادوں اور کاروبار پر دباؤ ڈال کر قبضہ کیا گیا۔

اسی سلسلے کی تازہ مثال آریانہ گروپ کے حوالے سے سامنے آنے والا معاملہ ہے۔ آریانہ گروپ کے سربراہ عبدالحق دانشمل نے ایک ویڈیو کے ذریعہ سے الزام عائد کیا، جس کی کابل سے ہمارے سورسز نے تصدیق کی ہے کہ آریانہ پرائیویٹ یونیورسٹی، اس کی مختلف برانچز اور آریانہ دانشمل ہسپتال کو ایک منظم منصوبے کے تحت ان سے چھین لیا گیا۔ ان کے مطابق اس پورے عمل میں وزیرِ اعلیٰ تعلیم ملا ندا محمد ندیم کا کردار شامل ہے، جو ملا ہبت اللہ کے داماد ہیں۔ یہ کارروائی کسی باقاعدہ عدالتی عمل کے بجائے انتظامی دباؤ اور زبردستی کے ذریعے انجام دی گئی۔ اس پورے نظام کو چلانے کے لیے مولوی سمیع اللہ سعید نامی شخص کو انتظامی سربراہ یا منیجر کے طور پر تعینات کیا گیا، جس نے اداروں کا کنٹرول سنبھالنے کے بعد اثاثوں کی منتقلی اور انتظامی فیصلوں میں بنیادی تبدیلیاں کیں۔ عبدالحق دانشمل کے مطابق اس عمل کے دوران یونیورسٹی اور ہسپتال کے کروڑوں افغانی مالیت کے اثاثے غیر شفاف طریقے سے منتقل کیے گئے اور اصل مالکان کو ان کے جائز حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ عبدالحق دانشمل کو افغانستان واپسی کے لیے طالبان کے رابطہ کمیشن کے ذریعے لایا گیا تھا، جس میں انہیں تحفظ اور قانونی انصاف کی یقین دہانی کرائی گئی تھی اور اس

کے بدلے بھاری رقم بھی وصول کی گئی۔ تاہم واپسی کے بعد ان پر مختلف نوعیت کے دباؤ ڈالے گئے اور ان کے خلاف ایک مبینہ جعلی مقدمہ بھی بنایا گیا، جس کے بعد ان کے کاروباری اثاثے ان کے کنٹرول سے نکل کر نئے انتظامی ڈھانچے کے حوالے کر دیے گئے۔

یہ معاملہ صرف ایک فرد یا ایک کاروباری ادارے تک محدود نہیں سمجھا جا رہا بلکہ اسے افغانستان میں جائیدادوں کی ملکیت، قانونی تحفظ اور ریاستی طاقت کے استعمال کے وسیع تر مسئلے سے جوڑا جا رہا ہے۔ مختلف حلقوں میں یہ بحث بھی جاری ہے کہ آیا واپسی کے وعدوں اور قانونی تحفظ کی یقین دہانیوں پر عملدرآمد واقعی شفاف طریقے سے ہو رہا ہے یا نہیں۔ افغانستان کے کاروباری اور سماجی حلقوں میں اس واقعے نے ایک بار پھر یہ سوال کھڑا کر دیا ہے کہ سرمایہ کاری اور نجی ملکیت کے تحفظ کا نظام کس حد تک مستحکم ہے۔

آریانہ گروپ سے متعلق یہ تنازع اسی بڑے تناظر کا حصہ سمجھا جا رہا ہے جس میں افغانستان کے اندر طاقت، معیشت اور قانونی ڈھانچے کے درمیان توازن ایک مسلسل چیلنج کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہ معاملہ اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ نجی شعبہ، تعلیمی ادارے اور صحت کے نظام جیسے حساس شعبے بھی اب ان تنازعات سے محفوظ نہیں رہے۔ مجموعی طور پر یہ واقعہ ایک ایسے ماحول کی عکاسی کرتا ہے جہاں قانونی عمل، انتظامی فیصلے اور طاقت کے استعمال کے درمیان واضح حدیں کمزور پڑتی نظر آتی ہیں، اور یہی صورتحال مستقبل میں مزید پیچیدہ معاشی اور سیاسی سوالات کو جنم دے سکتی ہے۔

## طالبان میں دھڑے بندی، تصادم کا خطرہ

طالبان کی صفوں میں اس وقت اندرونی تقسیم ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جہاں اسے محض تنظیمی اختلاف یا معمول کی سیاسی کشمکش قرار دینا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ زمینی حقائق اور مختلف حلقوں سے ملنے والی معلومات کے مطابق یہ تقسیم اب صرف قندھاری اور حقانی گروپوں تک محدود نہیں رہی بلکہ اس میں دیگر علاقائی، قبائلی اور انتظامی دھڑے بھی شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ تاہم سب سے زیادہ حساس اور فیصلہ کن تنازع اب بھی انہی دو بڑے مراکزِ طاقت کے درمیان موجود اختلافات ہیں۔ قندھار اور حقانی نیٹ ورک کے درمیان یہ کشیدگی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی ہے۔ ابتدا میں اسے محض پالیسی اختلافات یا انتظامی معاملات کی حد تک دیکھا جاتا رہا، مگر اب یہ صورتحال ایک ایسی کشمکش میں تبدیل ہو چکی ہے جس میں اختیارات کی تقسیم، ریاستی وسائل پر کنٹرول، اہم تقرریاں اور سیاسی اثر و رسوخ بنیادی تنازع کی شکل

اختیار کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طالبان کے اندرونی ڈھانچے میں اعتماد کا عنصر کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ نچلی سطح پر صورتحال مزید حساس دکھائی دیتی ہے۔ مختلف صوبوں، یونٹوں اور عسکری حلقوں سے تعلق رکھنے والے عام طالبان اور درمیانی درجے کے کمانڈرز میں بے چینی واضح طور پر بڑھ رہی ہے۔ بعض مقامات پر یہ بے چینی کھلی ناراضی اور گروہی جھگڑوں کی شکل بھی اختیار کر چکی ہے۔

بعض چھوٹے انتظامی تنازعات بھی اب بڑے اختلافات میں تبدیل ہو جاتے ہیں کیونکہ ہر گروہ اپنے اوپر ہونے والے مبینہ ظلم یا نظر انداز کیے جانے کے احساس میں مبتلا ہے۔ اندرونی سطح پر یہ تاثر بھی مضبوط ہوتا جا رہا ہے کہ موجودہ اختلافات کا حل تلاش کرنا آسان نہیں ہوگا۔ بعض مبصرین اور اندرونی حلقے یہ رائے رکھتے ہیں کہ طاقت کی موجودہ تقسیم اور باہمی عدم اعتماد اتنا گہرا ہو چکا ہے کہ فوری مفاہمت کے امکانات محدود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ اسے ایک ایسے بحران کے طور پر دیکھتے ہیں جو وقت کے ساتھ مزید شدت اختیار کر سکتا ہے۔ اس صورتحال کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یہ تقسیم صرف سیاسی یا عسکری نوعیت کی نہیں رہی بلکہ اس کے اثرات سماجی اور معاشی سطح تک بھی پہنچ چکے ہیں۔ مختلف علاقوں میں وسائل کی تقسیم، سرکاری نوکریوں، تجارتی مواقع اور انتظامی فیصلوں پر بھی اس کے اثرات محسوس کیے جا رہے ہیں۔ اس سے عام شہریوں کے ساتھ ساتھ خود طالبان کے اندر موجود نچلے درجے کے افراد بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ خطے کی مجموعی صورتحال کے تناظر میں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ افغانستان میں کسی بھی اندرونی کشمکش کے اثرات سرحدوں سے باہر تک پہنچ سکتے ہیں۔ جغرافیائی اور سیاسی لحاظ سے یہ خطہ پہلے ہی حساس ہے، اس لیے اندرونی عدم استحکام کا بڑھنا پڑوسی ممالک کے لیے بھی تشویش کا باعث بن سکتا ہے۔

موجودہ تقسیم کو صرف داخلی مسئلہ نہیں بلکہ علاقائی سلامتی سے منسلک معاملہ ہے۔ قندھار اور حقانی گروپوں کے درمیان تنازع کی بنیادی جڑ کو اگر دیکھا جائے تو اس میں طاقت کے توازن، جنگ کے دوران حاصل کیے گئے اثر و رسوخ، اور موجودہ حکومت میں ''فتح کے کریڈٹ'' پر دعووں کا مسئلہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر گروہ یہ سمجھتا ہے کہ اقتدار کے قیام میں اس کا کردار زیادہ اہم تھا، اس لیے فیصلہ سازی میں بھی اس کا حصہ زیادہ ہونا چاہیے۔ یہی سوچ مشترکہ نظم کو کمزور کر رہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ اختلافات بند کمروں کی بحثوں سے نکل کر کھلے اعتراضات اور بعض اوقات سخت موقف تک پہنچ چکا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ طالبان کے اندر موجود یہ تقسیم ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جہاں اس کے

اثرات صرف تنظیمی سطح تک محدود نہیں رہیں گے۔ اگر اعتماد کی بحالی اور طاقت کی متوازن تقسیم کا کوئی راستہ نہ نکلا تو یہ صورتحال مستقبل میں مزید پیچیدہ ہو سکتی ہے اور اس کے اثرات پورے افغانستان اور خطے پر پڑ سکتے ہیں۔

## قندھاری حقانی گروپ

ماضی کی قندھار اور پکتیا کی پرانی تقسیم ایک بار پھر نئی شکل میں سامنے آ چکی ہے، اگرچہ نام بدل گئے ہیں۔ پکتیا سے جڑا ہوا دھڑا اب حقانی نیٹ ورک کے نام سے پہچانا جاتا ہے، جبکہ قندھار سے وابستہ قبائل اور قیادت قندھاری طالبان کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ تقسیم اب محض تاریخی حوالہ نہیں رہی بلکہ موجودہ سیاسی اور انتظامی ڈھانچے میں واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ صورتحال اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ عام طالبان اہلکار بھی اس گروہی تقسیم کے اثر سے محفوظ نہیں رہے۔ مختلف معاملات میں فیصلے اور ترجیحات اکثر ذاتی یا گروہی وابستگی کی بنیاد پر دیکھی جاتی ہیں، جس سے ادارہ جاتی غیر جانبداری کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس تقسیم کی ایک بڑی وجہ قندھار گروپ کی جانب سے ریاستی طاقت اور اہم فیصلوں پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کی کوششیں سمجھی جاتی ہیں۔ اختلاف رائے رکھنے والے عناصر کو فیصلہ سازی اور تنظیمی عمل سے دور رکھنے کی پالیسی نے اندرونی فاصلے مزید بڑھا دیے ہیں۔ نتیجتاً اعتماد کی فضا متاثر ہوئی ہے اور مختلف سطحوں پر گروہی کشمکش نے جگہ بنا لی ہے، جس کے اثرات تنظیمی ہم آہنگی پر بھی پڑ رہے ہیں۔

## قندھار گروپ کا کردار:

طالبان تحریک کا آغاز قندھار کے علاقوں سے ہوا، اس لیے ابتدائی دور میں قیادت، تنظیمی ڈھانچہ اور فیصلہ سازی کا مرکز بھی زیادہ تر قندھار ہی رہا۔ اسی مرحلے میں وہ بنیادی قیادت سامنے آئی جس نے بعد میں تحریک کو ایک منظم عسکری اور سیاسی قوت میں تبدیل کیا۔ قندھاری قبائل کی اس برتری نے ابتدائی تنظیمی مزاج اور فیصلہ سازی کے انداز کو بھی واضح طور پر متاثر کیا۔ بعد ازاں تحریک کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ پکتیا اور دیگر مشرقی علاقوں سے تعلق رکھنے والے گروہ بھی اس میں شامل ہوتے گئے۔ انہی میں سے جلال الدین حقانی اور ان کے ساتھی ایک اہم دھڑے کے طور پر سامنے آئے۔

حقانی گروپ کی شمولیت کے وقت جو ابتدائی سیاسی اور تنظیمی سمجھوتہ سامنے آیا، اس میں یہ اصول بھی شامل

بتایا جاتا ہے کہ نظام کسی ایک قبیلے یا گروہ کی اجارہ داری کے بجائے شورائی بنیادوں پر چلایا جائے گا اور بنیادی مقصد شریعت کے نفاذ کو قرار دیا گیا تھا۔اس ابتدائی معاہدے کے تحت طالبان کے پہلے دور میں نسبتاً توازن برقرار رہا۔مختلف گروہوں کے درمیان اختلافات کے باوجود ایک مشترکہ حکمت عملی موجود تھی، خصوصاً امریکہ کے خلاف مزاحمتی دور میں یہ دونوں بڑے دھڑے ایک دوسرے کے ساتھ منسلک اور مربوط دکھائی دیتے تھے۔اس عرصے میں یہ تاثر بھی قائم ہوا کہ داخلی تقسیم کمزور پڑ چکی ہے اور تنظیم ایک متحد ڈھانچے کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

تاہم اگست 2021 میں کابل پر دوبارہ کنٹرول کے بعد صورتحال میں نمایاں تبدیلی دیکھنے میں آئی۔اقتدار کے دوبارہ قیام کے بعد ریاستی ڈھانچے کی تشکیل، اہم عہدوں کی تقسیم اور پالیسی سازی کے مراحل میں قندھار سے تعلق رکھنے والی قیادت کا اثر ورسوخ زیادہ نمایاں ہونے لگا۔یہی وہ مرحلہ تھا جہاں پرانی داخلی تقسیم دوبارہ ابھرنا شروع ہوئی۔

ابتدائی طور پر یہ اختلافات خاموش سطح پر رہے، مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ انتظامی فیصلوں، تقرریوں اور وسائل کی تقسیم تک پھیل گئے۔قندھاری گروپ کی پالیسیوں کو بعض حلقے مرکزی کنٹرول کی طرف جھکاؤ کے طور پر دیکھنے لگے، جبکہ حقانی نیٹ ورک اور اس سے منسلک حلقوں میں یہ احساس بڑھنے لگا کہ فیصلہ سازی میں توازن برقرار نہیں رکھا جا رہا۔ہر گزرتا دن ان اختلافات میں اضافے کا اشارہ دیتا رہا۔ اندرونی سطح پر اعتماد کا وہ پرانا توازن جو جنگی دور میں موجود تھا، رفتہ رفتہ کمزور ہوتا گیا۔مختلف گروہوں کے درمیان رابطہ اور ہم آہنگی میں کمی نے اس تقسیم کو مزید واضح کر دیا۔

نتیجتاً آج صورتحال یہ ہے کہ پرانی قندھار اور پکتیا کی تقسیم ایک نئی شکل میں دوبارہ سامنے آ چکی ہے۔ اگرچہ اس کے نام اور عنوان بدل چکے ہیں، لیکن اس کی بنیادی ساخت اور اثرات اب بھی طالبان کے اندرونی نظام پر محسوس کیے جا رہے ہیں۔

## پہلا تصادم

یہ تنازعہ 15 اگست 2021 کو کابل پر کنٹرول کے ٹھیک تیسرے دن شروع ہو گیا تھا۔جب طالبان کی شوریٰ عالی اور شوریٰ نظامی کے مشترکہ اجلاس میں اقتدار کا نقشہ اور اختیارات کی تقسیم ہو رہی تھی، قندھار گروپ نے روز اول ہی حقانیوں کو اہم عہدوں سے دور رکھنے کی کوشش کر دی تھی۔طالبان میں ہیبت اللہ

کے بعد سب سے اہم لیڈر ہونے کی وجہ سے سراج الدین حقانی سمجھتے تھے کہ وزارت عظمیٰ ان کا حق ہے، لیکن جب یہ تجویز اس اجلاس میں آئی تو قندھاریوں کی بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ ہیبت اللہ اجلاس میں موجود نہیں تھے، قندھار سے آن لائن شریک تھے، وہ خاموش رہے، لیکن ملا امیر خان متقی، ملا عبدالسلام حنفی، ملا محمد علی حنفی عرف ملا شیریں، گل آغا اسحاق زئی، ملا برادر اور دیگر قندھاریوں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ دلیل یہ دی کہ طالبان کی بنیاد قندھاریوں نے رکھی تھی لہٰذا وزیر اعظم قندھاریوں کا ہوگا، دوسری دلیل یہ تھی کہ جنگ میدان میں لڑنے والوں نے نہیں جیتی، یہ فتح مذاکرات کرنے والی ٹیم نے حاصل کی ہے، جو قندھاریوں پر مشتمل تھی۔ بحث بڑھی اور عالمی میڈیا میں ملا برادر اور سراج کے چچا خلیل حقانی کے درمیان ہاتھا پائی کی خبر بھی سامنے آ گئی، جو کہ غلط نہیں تھی۔ معاملہ بحث تک رہتا تو ٹھیک تھا لیکن شوریٰ میں چونکہ قندھاریوں کی اکثریت تھی اور ملا ہیبت اللہ بھی ان کے ساتھ تھے، تو ایسا بندوبست کیا گیا کہ حقانی گروپ کی ہر طاقتور وزارت میں نائب وزیر متعصب قسم کا قندھاری لگا دیا گیا، اور اس کی اختیارات وزیر سے زیادہ رکھ دیئے گئے۔ جس کی وجہ سے حقانی گروپ کے وزرا عضو معطل بن کر رہ گئے۔

## حکومت، اقتدار اور اختیار کی جنگ

عہدوں کی تقسیم اور حکومت کے قیام کے بعد بھی طالبان کے دونوں بڑے دھڑوں کے درمیان کھینچا تانی کسی نہ کسی شکل میں برقرار رہی ہے۔ قندھاری گروپ پر یہ تاثر مضبوط ہوتا جا رہا ہے کہ وہ ریاستی ڈھانچے میں اپنا اثر و رسوخ مزید مستحکم کرنے اور دیگر گروہوں خصوصاً حقانی نیٹ ورک کو بتدریج محدود کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کشمکش نے حکومتی فیصلوں اور انتظامی توازن کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال حالیہ واقعات کے تناظر میں دیکھی جاتی ہے، جہاں عہدوں کی تقسیم اور کوٹے کے نظام میں مسلسل تبدیلیاں سامنے آئیں۔ دسمبر 2024 میں وزیر برائے مہاجرین خلیل حقانی کے قتل کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنے کے لیے حقانی گروپ کے کوٹے پر تعینات نائب وزیر اعظم مولوی عبدالکبیر کو وزارت مہاجرین کا قلمدان سونپ دیا گیا۔ یہ اقدام بظاہر انتظامی ضرورت کے طور پر پیش کیا گیا، تاہم اندرونی حلقوں میں اسے طاقت کے توازن میں تبدیلی کے طور پر دیکھا گیا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد وہ نائب وزیر اعظم کا عہدہ، جو حقانی گروپ کو تقسیم اقتدار کے کوٹے میں دیا گیا تھا، اسے ختم کر دیا گیا۔ اس فیصلے نے پورے افغانستان میں یہ پیغام دیا کہ اقتدار اور طاقت کی تقسیم کا فارمولا ختم کر دیا گیا ہے۔

بڑھتی ہوئی بے اعتمادی اوت اختلافات کے باعث سراج الدین حقانی دسمبر 2024 میں ناراض ہوکر ابو ظہبی جا بیٹھا، کابل میں ذبیح اللہ مجاہد بار بار اس کے استعفے کی تردید کرتا رہا۔ بعدازاں مارچ 2025 کے آخر میں اس کی افغانستان واپسی ہوئی، تاہم واپسی کے باوجود ان کی سیاسی اور انتظامی موجودگی پہلے جیسی واضح نظر نہیں آتی۔ حکومتی ڈھانچے کا حصہ ہونے کے باوجود وہ فیصلہ سازی کے مرکزی عمل میں کہیں دکھائی نہیں دیتے، واپس پہنچ کر بھی سراج نے وزارت داخلہ کا کنٹرول نہیں سنبھالا تھا بلکہ حکمت یار، حامد کرزئی اور دگر مخالفین سے ملاقاتیں کیں، جس سے یہ تاثر پیدا ہو کہ وہ رجیم چینج کے کسی فارمولے پر کام کر رہے ہیں ۔ یہ صورتحال اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ طالبان کے اندرونی توازن میں ایک مسلسل تبدیلی جاری ہے، جہاں مختلف گروہوں کے درمیان اعتماد اور اختیارات کی تقسیم ایک نازک مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔

## تصادم کا خطرہ اور تیاریاں

حقیقت یہ ہے کہ قندھاری اور حقانی دونوں ہی جانتے ہیں کہ ان کے درمیان تصادم ناگزیر ہو چکا ہے اور دونوں ہی اس کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ قندھاری غیر ملکی حمایت اور وسائل پر کنٹرول بڑھا رہے ہیں۔ ہر صنعت میں ان کا حصہ رکھا جا رہا ہے اور الزام ہے کہ یہ پیسہ بیرون ملک منتقل کر رہے ہیں تا کہ تصادم کی صورت وسائل دستیاب رہیں۔

دوسری جانب ہر فوجی عہدے پر اپنے بندے لا رہے ہیں تا کہ سرکاری اسلحہ اور فوجی وسائل ان کے کنٹرول میں رہیں، حد تو یہ کہ ستمبر میں پاکستان کے ساتھ سرحدی تنازعہ کے دوران بھی پاکستانی سرحد کے قریب تعینات حقانی گروپ کے وفادار افسروں کو یہ الزام لگا کر نکال دیا گیا یا تبادلہ کر دیا گیا کہ انہوں نے پاکستان کے خلاف جنگ درست طریقے سے نہیں لڑی۔ ان پر الزام ہے کہ یہ اپنا پیسہ بیرون ملک منتقل کر رہے ہیں تا کہ آنے والے وقت میں اگر لڑائی ہوتی ہے تو انہیں وسائل کی کمی درپیش نہ ہو۔ دوسرا الزام ان پر یہ ہے کہ ہر جنگی یا فوجی پوسٹ پر یہ اپنے بندوں کو لا رہے ہیں تا کہ کسی تصادم کی صورت ان کا کنٹرول مستحکم رہے۔ دوسری جانب حقانی گروپ بھی خاموشی سے پوری طرح سے تیاری کر رہا ہے، جس میں ایک جانب اسلحہ جمع کرنا، اسے ضائع ہونے سے بچانا، زیادہ سے زیادہ امریکی اور جدید اسلحہ کنٹرول میں کرنے کی کوشش شامل ہے تو دوسری جانب وہ اپنی بیس بڑھا رہا ہے۔ سراج ہر اس بندے کے پاس جا رہا ہے یا

اسے بلا رہا ہے، جو اہم ہے اور اسے قندھار گروپ سے کوئی شکایت ہے۔ مطلب یہ کہ جہاں قندھاری گروپ مال جمع کر رہا ہے، حقانی گروپ اپنی لابنگ اور بیس بڑھا رہا ہے، اس وقت قریباً پورا مشرقی افغانستان سراج کے ساتھ ہے، یہاں تک کہ ماضی میں قندھار گروپ کا حصہ رہنے والی صوبہ غور، ہلمند اور جوزجان کی طالبان قیادت اس کے ساتھ آ چکی ہے۔ سراج کی کوشش ہے کہ تصادم اگر سیاسی ہو اور پرامن ہو تو بھی اس کے پاس زیادہ سے زیادہ آبادی کی حمایت ہو، اگر فیصلہ تنظیم کی بنیاد پر ہو تو بھی اس کے حامیوں کی تعداد زیادہ ہونی چاہیے اور جنگ لڑی جائے تو بھی وہ بھاری رہے۔

## سراج حقانی اور ہیبت اللہ کے درمیان تازہ ترین کشیدگی:

یکم اکتوبر 2025 کو قندھار میں سراج الدین حقانی اور ملا ہیبت اللہ کے درمیان ایک اہم ملاقات ہوئی۔ اس میں سراج نے مصالحت اور اطاعت کی پیشکش کے ساتھ پانچ شرائط پیش کیں، جن میں اختیارات کی بحالی، خواتین کی تعلیم، اور سابق معاہدوں پر عمل شامل تھا۔ ملا ہیبت اللہ نے ان شرائط کو مسترد کرتے ہوئے سخت ردعمل دیا اور سراج کو "پاکستان کا ایجنٹ" قرار دیا۔ مذاکرات انتہائی تلخ ماحول میں ختم ہوئے۔ بعد ازاں بلخ کے گورنر ملا یوسف وفا اور سراج کے درمیان بھی سخت جملوں کا تبادلہ ہوا، جس کے بعد صورتحال مزید کشیدہ ہو گئی۔ اس کے بعد سراج حقانی نے واضح کر دیا کہ وہ کسی صورت استعفیٰ نہیں دیں گے، بلکہ اگر انہیں ہٹایا گیا تو وہ اسے کھلی مزاحمت کے طور پر لیں گے۔ اندرونی اختلافات، طاقت کی کشمکش، اور خاندانی اثر و رسوخ نے صورتحال کو انتہائی حساس بنا دیا ہے۔ موجودہ حالات میں طالبان کے اندر تصادم کے امکانات بڑھتے جا رہے ہیں اور اگر یہ کشیدگی جاری رہی تو یہ ایک بڑے سیاسی یا عسکری بحران کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔

## کھلا تصادم اور بڑھتی ہوئی کشیدگی:

حقانی اور قندھاری دھڑے براہِ راست آمنے سامنے آ گئے ہیں۔ 9 اکتوبر 2025 کو طالبان کی پاکستانی سرحد پر دہشت گردی اور اس کے جوابی اقدامات کی وجہ سے قندھاری اور حقانی گروپ میں تقسیم مزید بڑھ گئی اور یہ لڑائی شدت اختیار کر گئی۔ اس کے نتیجے میں حقانی نیٹ ورک اور قندھار گروپ کھل کر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ گئے ہیں، اور طالبان کے اندرونی انتشار کی حقیقت روز بروز

واضح تر ہوتی جارہی ہے۔

قندھاریوں نے الزام لگایا ہے کہ پاکستان کی جوابی کارروائی کے دوران بعض کمانڈروں نے غداری کی اور پاکستان کے خلاف کارروائی میں زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی۔ قندھاریوں کے مطابق جن کمانڈروں نے کم دلچسپی دکھائی ان میں خوست کور کا نائب کمانڈر ملا شریف اللہ حقانی، پکتیا کا مقامی کمانڈر ملا پہلوان اور ہلمند میں مولوی رئیس ملا زادہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ 13 دوسرے اور تیسرے درجے کے کمانڈرز پر بھی جنگ میں شرکت سے انکار کا الزام لگا کر انہیں برطرف کر دیا گیا ہے۔

## فتح کے کریڈٹ کا تنازع

حقانیوں اور قندھاریوں کے درمیان کابل کی فتح کا کریڈٹ بھی وجہ تنازعہ ہے، اس سلسلہ میں تازہ ترین جھگڑا 12 اکتوبر 2025 کو ہوا جب ملا ہبیت اللہ کے داماد اور وزیر برائے اعلیٰ تعلیم ملا ندیم ندا نے کابل میں ایک جلسے میں سراج حقانی کو ہدف تنقید بنایا اور خود کو "فاتحِ کابل" قرار دیا۔ اس کے جواب میں سراج نے 13 اکتوبر سے پکتیا اور پکتیکا کے دورے شروع کر دیے۔ ان دوروں کے دوران انہوں نے عوامی ملاقاتوں میں حکومت پر شدید تنقید کی، اور اپنے لوگوں کو عام عوام سے گھل مل جانے کی ہدایات دیں۔

14 اکتوبر کو پکتیا کے دورے کے دوران عوامی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے بغیر نام لیے ملا ندیم ندا اور ملا متقی کو کھل کر للکارا۔ سراج نے طنزیہ انداز میں کہا: "دو دن پہلے ایک اجنبی نے خود کو فاتحِ کابل کہا ہے، کچھ وقت پہلے بھی ایک اور خود کو فاتحِ کابل بتا رہا تھا۔ ان سے پوچھو کہ فاتحین کو خود کو بتانا پڑتا ہے یا تاریخ بتاتی ہے؟ یہ بتائیں کہ جنگ کے دوران کہاں تھے؟ سوویت یونین توڑنے اور امریکہ بھگانے کی باتیں کرنے والوں کا جہاد میں حصہ کیا ہے؟ وہ غرور میں ہیں کیونکہ جہاد کیے بغیر حکومت میں بیٹھے ہیں۔ یاد رکھو، اس سے پہلے بھی بہت سے طاقتور آئے تھے، ہم نے اپنے ہاتھوں سے انہیں تباہ کیا، تم بھی نہیں رہو گے۔ افغان جانتے ہیں جہاد کس نے کیا اور عیاشیاں کون کرتا رہا۔ تم لوگ یا تو امریکیوں سے معاہدے کر کے قندھار میں تھے یا پاکستان میں چھپے ہوئے تھے، اکثر قطر اور دبئی میں تھے۔ ایسی حرکت نہ کرو کہ اقتدار تم سے چھن جائے۔ تم سے زیادہ طاقتور بھی گرے ہیں، تمہارا انجام بھی وہی ہو سکتا ہے۔ تم کون ہوتے ہو؟ تمہاری بیٹیاں قطر میں پڑھ رہی تھیں اور یہاں افغان بچیاں تعلیم سے محروم ہیں۔ تیسرے درجے کے کمانڈر اعلیٰ عہدوں پر پہنچ گئے، ہم اپنے شہداء کی توہین برداشت نہیں کریں گے۔" سراج کا یہ

بیان قندھاری دھڑے کے لیے کھلی وارننگ سمجھا جارہا ہے۔

## خانہ جنگی کا خطرہ

دونوں گروپوں کے درمیان کشیدگی بڑھ رہی ہے، ملا ہیبت اللہ پاکستان کے ساتھ کشیدگی کو اپنی حمائت بڑھانے کے لئے استعمال کر رہا ہے،لیکن یہ صورتحال زیادہ چل نہیں سکتی ۔کسی بھی لمحے باہمی تصادم کا دھماکہ ہوسکتا ہے۔وزیر داخلہ سراج الدین حقانی اور سپریم لیڈر ملاہبت اللہ کے درمیان ایک سال سے زیادہ عرصے سے چلا آرہا تنازعہ اب نازک موڑ پر پہنچ گیا ہے۔

ان دونوں کے درمیان 2024 میں القاعدہ کی ثالثی سمیت کئی مصالحتی کوششیں ناکام ہوچکی ہیں، بنیادی وجہ ہیبت اللہ کا اقتدار پر مکمل کنٹرول کا جنون ہے، دوسری جانب تنازعہ بڑھانے میں بلخ کے گورنر ملا یوسف وفا اور چیف جسٹس حکیم اللہ جیسے لوگ اپنے ذاتی مفادات کے لیے کردار ادا کر رہے ہیں۔آخری امید طالبان کے قیام سے موجود سینئر شوریٰ ارکان پر تھی، جنہوں نے ملاقات تو کروائی،لیکن وہ بھی ثالثی نہ کر سکے لہٰذا اب تصادم ناگزیر نظر آرہا ہے اور اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے طالبان گروپس کی دہشت گرد پراکسیز میں نئی صف بندی شروع ہوچکی ہے۔افغان طالبان کے مختلف دھڑوں اور شخصیات کے درمیان کشیدگی کے خانہ جنگی یا پراکسی جنگ کی صورت اختیار کرنے کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔حقانی اور قندھاری دونوں بڑے دھڑوں کے حامی دہشت گرد گروپس نے ایک دوسرے کو جنگ اور قتل کی دھمکیاں دینے کا سلسلہ شروع کردیا ہے۔ایک جانب افغانستان میں جی ڈی آئی کی قیادت میں تمام دہشت گرد تنظیموں پر مشتمل مشترکہ دہشت گرد فورس قائم کی جارہی ہے تو دوسری جانب دہشت گردوں کے درمیان بنتے بگڑتے اتحاد پورے خطے کے لئے نئی خانہ جنگی کی وارننگ بن چکے ہیں۔دہشت گردوں کی نئی صف بندی اور ایک دوسرے کے خلاف اعلانات دراصل افغان طالبان کے مختلف دھڑوں اور شخصیات کے درمیان پراکسی وار ہے۔

سورسز نے انکشاف کیا گیا ہے کہ پاکستانی بارڈر کے ساتھ مغربی افغانستان میں دہشت تنظیموں کی نئی صف بندی باہمی قتل وغارت کی صورت اختیار کر رہی ہے۔جنہیں افغان حکومت کے بعض عناصر پروکسیز کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔سورسز کا دعویٰ ہے کہ ٹی ٹی پی اور جی ڈی آئی سے رجسٹرڈ داعش گروپوں کے درمیان تعاون کے مقابلے میں ایک دوسرا اتحاد تیزی سے سامنے آیا ہے، جس میں دہشت گرد تنظیم اتحاد

الجہادین پاکستان (آئی ایم پی) کو القاعدہ برصغیر نے اپنے نیٹ ورک کے حصے کے طور پر تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا ہے، جبکہ ٹی ٹی پی سے الگ ہونے والا دہشت گرد دھڑا جماعۃ الاحرار اور ٹی ٹی پی کے نام نہاد سیاسی کمشن کا سربراہ پرانا دہشت گرد مولوی فقیر محمد بھی ٹی ٹی پی کو چھوڑ کر اس اتحاد میں شامل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ القاعدہ برصغیر کی جانب سے آئی ایم پی کو اپنے نیٹ ورک میں شامل کرنے کے لئے 15 فروری 2026 کو کئے گئے اعلان کے بعد جماعۃ الاحرار نے اپنے 18 فروری کے اعلامیہ میں کہا ہے کہ وہ گل بہادر اور لشکر اسلام کو دشمن خیال نہیں کرتے۔

القاعدہ برصغیر نے اپنے جریدے ''غزوہ ہند'' کے مارچ 2026 کے شمارے میں جاری کردہ ایک انفو گراف میں اتحاد المجاہدین (IMP) کی پاکستان میں دہشت گردی کو اپنی ذیلی تنظیم کی کارروائیوں کے طور پر شامل کیا تھا۔ بعد ازاں 15 فروری کو القاعدہ برصغیر نے اپنے آفیشل میڈیا الصباح سے باقاعدہ طور پر آئی ایم پی کو اپنے ذیلی نیٹ ورک کے طور پر تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا ہے، القاعدہ برصغیر نے اپنے نیٹ ورک میں جن دیگر تنظیموں کے نام شامل کئے ہیں، ان میں صومالیہ میں الشباب اور JNIM بھی شامل ہیں ۔15 فروری کے اعلامیہ میں کہا گیا ہے کہ اس کی ذیلی تنظیموں کا یہ نیٹ ورک نظریاتی ہم آہنگی کا اظہار نہیں بلکہ مشترکہ مقاصد اور دہشت گردی میں باہمی تعاون پر مشتمل ہے۔

اتحاد المجاہدین پاکستان (IMP) کے نام سے دہشت گردوں کا اتحاد اپریل 2025 میں قائم کیا گیا تھا، جس میں حافظ گل بہادر گروپ (HBG)، لشکر اسلام (Lel) اور ایک نئی دہشت گرد تنظیم حرکۃ انقلاب اسلامی پاکستان (HIIP) شامل ہیں۔ حرکۃ انقلاب اسلامی پاکستان (HIIP) بنیادی طور پر القاعدہ اور داعش سے منحرف پاکستانی دہشت گردوں کا ایک گروپ تھا، جو داعش کے معروف دہشت گرد غازی شہاب الدین کی قیادت میں مارچ 2025 میں سامنے آیا تھا، جس میں کمانڈر محمد عاصم عرف ابو عثمان، راشد علی باجوڑی عرف ابو محمد اور ڈاکٹر عمر حیدر عرف ڈاکٹر صاحب اور کمانڈر فریداور کزئی شامل تھے، اس دہشت گرد گروپ کی اس وقت کل تعداد 40 سے 50 کے درمیان تھی، اور ان میں اورکزئی اور باجوڑ کے وہ دہشت گرد شامل تھے، جو ایمن الظواہری کے یہاں قیام کے دوران حنفی سے سلفی ہوئے اور بعض القاعدہ اور بعض داعش میں چلے گئے، اور بعد میں الگ ہو گئے تھے۔ آئی ایم پی نامی اس دہشت گردوں کے اتحاد کی خاص اہمیت یہ ہے کہ اسے ٹی ٹی پی کے خلاف قائم کیا گیا تھا۔ اب ایک جانب القاعدہ برصغیر اس

اتحاد کو اپنا چکی ہے تو دوسری جانب جماعۃ الاحرار بھی ان کے قریب آ چکی ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق ٹی ٹی پی کا اہم لیڈر مولوی فقیر محمد بھی ٹی ٹی پی سے راستے جدا کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے، وہ بھی آئی ایم پی کے ساتھ اتحاد کر کے، القاعدہ برصغیر کے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہے۔ آئی ایم پی نے اپنے میڈیا ونگ کا نام ''صدائے غزوۃ الہند'' رکھا ہے جبکہ ترجمان محمود الحسن نامی دہشت گرد ہے، جس کا تعلق گل بہادر گروپ سے ہے۔ اس نئی صف بندی کے دوران ٹی ٹی پی کی جانب سے مخالف دہشت گرد گروپوں کو غدار قرار دے کر ان کے لوگوں کے قتل کا اعلان ایک نئے خطرے کی گھنٹی ہے۔

ماضی میں یہ دہشت گرد تنظیمیں خفیہ طور پر ایک دوسرے کے قتل میں ملوث رہی ہیں، لیکن تسلیم نہیں کرتی تھیں لیکن اب ٹی ٹی پی نے کھل کر مخالفین کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ جو بھی اسے چھوڑ کر جائے گا، اسے قتل کر دیا جائے گا۔ انہی دنوں قبل ٹی ٹی پی کے نائب امیر مفتی برجان نے اپنی صفوں سے علیحدگی اختیار کرنے والے دہشت گرد گروہوں کے خلاف 'قتل کا حکم' جاری کرتے ہوئے انہیں نام نہاد جہاد کے راستے میں رکاوٹ قرار دے دیا ہے۔ افغانستان کے صوبہ کنہڑ میں اپنے دہشت گردوں کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے مفتی برجان نے واضح کیا کہ ٹی ٹی پی کی قیادت نے ایک نیا فتویٰ جاری کیا ہے، جس کے تحت تنظیم کے نظم وضبط سے ہٹ کر کسی بھی دوسرے گروہ کے ساتھ کام کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہوگی۔ انہوں نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ جو بھی متوازی نظام قائم کرے گا، اسے قتل کر دیا جائے گا۔

مفتی برجان نے اپنے خطاب میں ''جماعت الاحرار'' کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے انہی ''فسادی'' گروہ قرار دیا اور الزام عائد کیا کہ جماعت الاحرار نے قبائلی علاقوں میں فساد پھیلایا ہے اور اب وہ ان کے نام نہاد جہاد کے راستے میں رکاوٹ بن رہے ہیں، لہٰذا ان کا قتل شرعی طور پر روا ہے۔ سورسز کے مطابق ٹی ٹی پی اس سے قبل القاعدہ برصغیر کے خلاف بھی اسی نوعیت کا فتویٰ جاری کر چکی ہے۔ ٹی ٹی پی کے نائب امیر نے یہ انکشاف بھی کیا کہ حال ہی میں حافظ گل بہادر گروپ میں شامل ہونے والے متعدد افراد کو تنظیم کی جانب سے عبرت کا نشانہ بناتے ہوئے قتل کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے دہشت گردوں کو متنبہ کیا کہ کسی بھی قسم کی علیحدہ سرگرمی یا الگ ڈھانچہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ سورسز کے مطابق ٹی ٹی پی کی جانب سے جاری کردہ یہ حالیہ فتویٰ اور بیانات تنظیم کے اندر بڑھتے ہوئے شدید انتشار اور مختلف شدت پسند گروہوں کے درمیان

وسائل اور اثر ورسوخ کی جنگ کو ظاہر کرتے ہیں۔

یہ صورتحال باجوڑ اور سوات جیسے علاقوں سے نئے گروپس کی جماعت الاحرار میں شمولیت اور القاعدہ برصغیر کے آئی ایم پی کے ساتھ اتحاد کے بعد پیدا ہوئی ہے، جس نے ٹی ٹی پی کی مرکزی قیادت کے لیے بقاء کا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ سورسز کے مطابق 12 فروری کو وزیرستان میں کھانے میں زہر دے کر جس ٹی ٹی پی دہشت گرد عطاء اللہ کو ہلاک کیا گیا تھا، ٹی ٹی پی نے تسلیم کیا ہے کہ اسے بھی نور ولی کے حکم کر زہر دیا گیا تھا، اسی طرح شمالی وزیرستان میں نامعلوم افراد کی فائرنگ سے مارے جانے والے دہشت گرد رحیم شاہ کو بھی ٹی ٹی پی نے قتل کیا تھا۔

دوسری جانب گل بہادر گروپ اور جماعۃ الاحرار نے بھی ٹی ٹی پی کے خلاف جوابی کارروائیوں کا اعلان کر دیا ہے۔ سورس کا دعویٰ ہے کہ دونوں دہشت گرد گروہوں کو افغان انٹیلی جنس اور افغان طالبان قیادت کے مختلف لیڈروں کی سرپرستی حاصل ہے، اور یہ صورتحال افغانستان میں خانہ جنگی کا آغاز بن سکتی ہے۔ جماعت الاحرار کے ترجمان اسد منصور نے جوابی بیان میں انتباہ کیا ہے کہ ان کے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی کا سخت جواب دیا جائے گا۔ اس نے الزام لگایا کہ جماعت الاحرار کے بانی عمر خالد خراسانی کو بھی نور ولی نے قتل کروایا تھا۔

سورسز کا دعویٰ ہے کہ دہشت گردوں کی نئی گروپنگ اور ایک دوسرے کے خلاف اعلانات دراصل افغان طالبان کے مختلف دھڑوں اور شخصیات کے درمیان پراکسی وار ہے، جس میں دونوں بڑے دھڑے خود سامنے آنے کے بجائے، اپنے حامی دہشت گردوں کے ذریعہ سے مغربی افغانستان میں پاکستان سرحد کے قریب اپنا کنٹرول قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سورسز کا دعویٰ ہے کہ ٹی ٹی پی اور داعش کے جی ڈی آئی سے رجسٹرڈ گروپ کا اتحاد ثابت کرتا ہے کہ یہ دھڑا قندھاریوں کے مفادات کا تحفظ کر رہا ہے، جبکہ گل بہادر کے حقانیوں کے ساتھ تعلقات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔

## شمالی افغانستان کا فیصلہ کن کردار:

یہ سوال انتہائی اہم ہے کہ کسی بھی سیاسی یا مسلح تصادم کی صورت میں شمالی افغانستان کس کے ساتھ ہوگا۔ مشاہدات اور ملاقاتوں کی بنیاد پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ شمالی افغانستان کا رجحان زیادہ تر سراج الدین حقانی کی طرف ہے۔ یہ بلاوجہ نہیں ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شمال میں قندھاری گروپ سے تاریخی

نفرت موجود ہے، کیونکہ قندھاریوں نے ہمیشہ شمال پر قبضہ اور غصب کرنے کی کوشش کی، اس بار اقتدار سے قبل اس کے ازالہ کا وعدہ تھا مگر عملی صورت وہی رہی، بلکہ اس سے بھی بدتر ہوگئی، جس کی وجہ سے شمال والوں کو قندھاریوں کی پالیسیوں سے شکایات کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی ہیں۔ سراج کی جانب سے نسبتاً بہتر رویہ رابطہ کاری اور لابنگ اپنا کام دکھا رہی ہے، جس کا نتیجہ یہ دکھائی دے رہا ہے دونوں میں سے کسی ایک کا ساتھ دینے کا ماملہ آیا تو شمال سے تعلق رکھنے والے طالبان سراج کا ساتھ دے سکتے ہیں۔

## ابراھیم صدر گروپ

بظاہر قندھاری گروپ ایک اتحاد ہے، لیکن اس کے اندر بھی کم از کم دو دھڑے ایسے ہیں جو قندھاری گروپ کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اپنی قیادت کو چیلنج کر رہے ہیں، اس کا ایک موثر دھڑا ابراھیم صدر کی قیادت میں خود کو ایرانی لابی کہلوانا پسند کرتا ہے۔ امریکہ کی افغانستان میں موجود رہنے والے طالبان کماں ڈر اپنی الگ شناخت قائم کر چکے ہیں، یہ حقانیوں کی طرح کھل کر ہیبت اللہ کو چلینج تو نہیں کرتے، لیکن اس کے فرمانبردار بھی نہیں، صرف پالیسی اور مفادات نے انہیں اکٹھا کر رکھا ہے۔ اس گروپ میں قندھار گروپ کے چار طاقتور کمانڈر شامل ہیں۔

ان افراد کو طالبان کے ابتدائی دور میں وزراء کی پہلی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ بعد میں ایران کی باقاعدہ لابنگ کے نتیجے میں انہیں عہدے دیے گئے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایران کو یہ پیغام دیا جائے کہ ان کی شمولیت ایران کے اثر ورسوخ کا نتیجہ ہے۔ اس کے نتیجے میں ایران اور طالبان کے تعلقات ماضی کی کشیدگی کے بجائے نسبتاً تعاون کی سمت میں چلے گئے۔ اس گروپ کا سربراہ ملا ابراہیم صدر ہے۔ سوویت جنگ کے بعد چار سدہ آیا اور ایک مدرسے میں تدریس کرتا رہا۔ 2016 میں ملا منصور کی ڈرون حملے میں ہلاکت کے بعد یہ پاکستان سے دور ہو کر ایران چلا گیا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا۔

## ملا عبدالقیوم ذاکر:

ملا عبدالقیوم ذاکر نائب وزیر دفاع ہے اور ایران نواز لابی کا مضبوط حصہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ پاکستان مخالف سرگرمیوں کی حمایت اور سرپرستی کرتا ہے۔ اسی بلاک میں حاجی نجیب اللہ اور پیر آغا بھی شامل رہے ہیں۔ یہ تمام افراد طالبان حکومت کے اندر ایران نواز یا ایران سے قریبی تعلق رکھنے والے کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

## کابل گروپ

قندھار گروپ میں دوسرا طاقتور گروپ جو پالیسیوں میں قندھار قیادت کو چیلنج کر رہا ہے وہ کابل گروپ ہے۔ یہ گروپ طالبان کی موجودہ ساخت میں ایک الگ سوچ اور عملی حکمت عملی کا نمائندہ ہے جو قندھار کے نظریاتی مرکز کی سخت گیر پالیسیوں سے مختلف راستہ اپنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ قندھار جہاں فیصلہ سازی کا حتمی مرکز سمجھا جاتا ہے، وہاں کابل گروپ روزمرہ حکمرانی، معاشی دباؤ اور بین الاقوامی تنہائی سے نمٹنے کے لیے لچکدار رویہ اختیار کرنے پر زور دیتا ہے۔ یہ دونوں گروپس کے درمیان فاصلہ صرف جغرافیائی نہیں بلکہ فکری اور عملی بھی ہے، جو طالبان کی اندرونی سیاست کو پیچیدہ بلکہ کمزور بناتا جا رہا ہے۔

کابل گروپ کے اہم ارکان میں امیر خان متقی، ملا عبدالغنی برادر، شیر محمد عباس ستانکزئی اور سہیل شاہین جیسے رہنما شامل ہیں۔ ان میں سے عباس ستنکزئی ہیبت اللہ پر تنقید میں ریڈ لائن کراس کر جانے کے سبب خود ساختہ جلاوطنی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ قندھار گروپ میں ہمارے کچھ دوستوں کا دعویٰ ہے کہ عباس ستنکزئی کے خلاف کارروائی اور اس کا فرار دراصل قندھار گروپ کی قیادت کی حکمت عملی تھی جس کے تحت وہ کابل گروپ کی ہیبت اللہ کی پالیسیوں میں مداخلت اور اس کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کو روکنا چاہتا تھا، اس مقصد کی خاطر دوسروں کے مقابلے میں کمزور پش منظر کے عباس ستنکزئی کو نشان عبرت بنا کر دوسروں کو ان کی حد میں رہنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔

کابل گروپ ان لیڈروں پر مشتمل ہے، جو عالمی رابطوں میں ہیں، کیونکہ یہ لوگ زیادہ تر دوحہ کے سیاسی دفتر سے وابستہ رہے ہیں اور 2021 کے بعد حکومت سنبھالنے کے عمل میں عملی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ ان کی ترجیحات ریاست کی استحکام، معاشی بحالی اور عالمی سطح پر تسلیم شدگی حاصل کرنے پر مرکوز ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر طالبان ایک نظریاتی تحریک کی بجائے ایک فعال ریاست کی حیثیت سے کام کریں تو بین الاقوامی امداد، تجارت اور سفارتی روابط ضروری ہیں۔ اسی لیے ان کا نقطہ نظر نسبتاً عملی ہے اور وہ وقتاً فوقتاً نرم بیانات جاری کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ چونکہ ان کے مفادات، مقاصد اور لوٹ مار انہیں مجبور کرتے ہیں کہ ہیبت اللہ سے اختلاف کرتے ہوئے بھی اس کے ساتھ رہیں، لیکن ان دونوں گروپس کے درمیان کشمکش بڑھ رہی ہے۔ دوسری جانب کئی اشوز پر ان کی سوچ حقانی گروپ کے قریب ہے، لیکن اپنے علاقائی تعصب اور گروپنگ کی وجہ سے یہ اس کے ساتھ کرنے سے گریزاں ہیں، جن پالیسیوں پر ان کا

قندھاریوں سے اختلاف اور حقانیوں سے اتفاق ہے ان مین خاص طور پر خواتین کی تعلیم، انسانی حقوق اور عالمی تعاون اہم ہے۔

اس گروپ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قندھار کی قیادت کی پالیسیوں سے کو براہ راست چیلنج نہیں کرتے بلکہ اندرونی طور پر اختلافات کا اظہار کرتے ہوئے بھی نظام کو چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا قندھار گروپ سے بنیادی اختلاف تین اہم پوائنٹس پر ہے۔ پہلا، ریاست کے تصور پر۔ قندھار گروپ (جس کی قیادت ہیبت اللہ اخوندزادہ، ملا محمد یعقوب اور عبدالحق وثیق جیسے فیلڈ کمانڈرز کر رہے ہیں) طالبان کو ایک نظریاتی تحریک سمجھتا ہے جسے کسی بھی قیمت پر اپنی اصل شکل میں برقرار رکھنا ضروری ہے۔ جبکہ کابل گروپ اسے ایک ریاست کے طور پر دیکھتا ہے جس کے تقاضے لچک، سفارت کاری اور عملی فیصلے مانگتے ہیں۔ دوسرا اختلاف عالمی تعلقات پر ہے۔ کابل گروپ بین الاقوامی تنہائی کو ختم کرنے کے لیے نرم رویہ اختیار کرتا ہے اور امداد و تسلیم شدگی کی تلاش میں رہتا ہے، جبکہ قندھار گروپ بیرونی دباؤ کو جارحیت سمجھ کر اسے رد کر دیتا ہے۔ تیسرا اور سب سے نمایاں اختلاف خواتین کی تعلیم اور حقوق، میڈیا کنٹرول اور سول سوسائٹی کی پالیسیوں پر ہے۔ کابل گروپ ان مسائل پر محدود لچک دکھاتا ہے تاکہ عالمی برادری کا دباؤ کم ہو، مگر قندھار کی قیادت سخت پابندیاں جاری رکھنے پر اصرار کرتی ہے۔ کابل گروپ کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بیرون ملک اپنے مفادات کے لئے خود کو ماڈرن دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن دوسری جانب اندرون ملک ان کے مفادات قندھار کی سخت گیر، متشدد قیادت سے منسلک ہیں لہٰذا وہ ان کے بھی ساتھ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسے سیاسی منافقت کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

شہاب الدین دلاور جیسے کچھ شخصیات ان دونوں گروپس کے درمیان پل کا کردار ادا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ وہ ماضی میں مذاکراتی عمل اور سفارتی سرگرمیوں کا حصہ رہے ہیں، اس لیے دونوں اطراف سے بات کر سکتے ہیں۔ تاہم ان کی پوزیشن بھی غیر یقینی ہے کیونکہ اول وہ کرپشن میں بہت آگے جا چکے ہیں، دوسرے یہ کہ سخت گیر حلقوں کے نزدیک وہ زیادہ لچکدار سمجھے جاتے ہیں جبکہ عملی حلقوں کے لیے ان کے پاس فیصلہ کن اختیار نہیں۔ یہ اندرونی تقسیم اقتدار، ترجیحات اور ریاست کے تصور پر مبنی ہے جو 2021 کے بعد مزید گہری ہوگئی ہے۔ قندھار کا طاقت کا توازن اب بھی غالب ہے اور فیصلہ سازی کا مرکز وہیں ہے، مگر کابل گروپ کی عملی ذمہ داریاں اسے ایک اہم چیلنجر بنا رہی ہیں۔ اگر یہ تضاد حل نہ ہوا تو طالبان کی

پالیسیوں میں تسلسل برقرار نہیں رہے گا، فیصلے غیر متوقع ہوتے رہیں گے اور عالمی سطح پر ان کا مؤقف غیر واضح رہے گا۔ نتیجتاً حکومت کا استحکام متاثر ہوگا اور معاشی بحران مزید گہرا ہوتا جائے گا۔

طالبان کی یہ دوہری ساخت ان کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ کابل گروپ اگرچہ طاقتور ہے مگر اس کے پاس حتمی اختیار نہیں، جبکہ قندھار گروپ اختیار رکھنے کے باوجود عملی حکمرانی کی پیچیدگیوں سے دور ہے۔ یہ خلا وقت کے ساتھ زیادہ نمایاں ہوتا جا رہا ہے اور مستقبل میں طالبان حکومت کے لیے سنگین بحران پیدا کر سکتا ہے۔

## نسلی و علاقائی تقسیم

افغان طالبان میں صرف قندھاریوں اور حقانی گروپ کی ہی تقسیم نہیں بلکہ تقسیم کے کئی اور دائرے بھی پیدا ہو چکے ہیں۔ جن میں حقانی قندھار جتنا ہی خطرناک تنازعہ پشتون اور نان پشتون طالبان کی تقسیم ہے۔ اس تنازعہ کا پس منظر یہ ہے کہ طالبان اپنی تشکیل کے وقت سے ہی ایک پشتون مرکزیت کی تحریک رہی ہے، مگر ملا عمر نے شریعت کی پاسداری کا راستہ اختیار کرتے ہوئے ان تنازعات کو کنٹرول کیا۔ لیکن موجودہ رجیم شریعت کے بجائے نسل پرستی کو پالیسی کے طور پر اختیار کیے ہوئے ہے، لہٰذا ہیبت اللہ اس تقسیم کو استعمال کر رہا ہے اور ملا عمر کا فلسفہ شاید ان کے ساتھ ہی دفن کر دیا گیا ہے۔ نان پشتون ارکان کو تنظیم میں کم اہمیت دی جا رہی ہے اور انہیں اہم عہدوں سے دور رکھا جا رہا ہے۔ خاص طور پر شمالی صوبوں میں جہاں تاجک، ازبک اور ہزارہ آبادی زیادہ ہے، وہاں چن چن کر متعصب پشتون افسران کی تعیناتی سے مقامی سطح پر نفرت پھیل رہی ہے۔

جس کی سب سے بڑی مثال گورنر بلخ ملا یوسف وفا ہے۔ یہ قندھاری ہے اور ایک انتہا درجے کا متعصب پشتون قبائلی ہے۔ اس کا تعلق ملا ہیبت اللہ کے قبیلے نورزئی سے ہے۔ وہ صرف بلخ کا گورنر ہی نہیں بلکہ اس کے صوبے میں ہر اہم عہدہ پشتونوں کے پاس ہے جبکہ شمال کے لوگوں کو چن چن کر غیر اہم عہدوں پر منتقل کیا جا رہا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ طالبان کا آرمی چیف قاری فصیح الدین فطرت، جس نے کابل اور پنج شیر پر قبضے میں اہم کردار ادا کیا، نان پشتون ہونے کی وجہ سے اپنی سکیورٹی ٹیم کے انتخاب کے لیے بھی قندھار سیکریٹریٹ کا محتاج ہے۔ وہ ملا ہیبت اللہ سے ملاقات کے لیے ہفتوں قندھار میں بیٹھا رہتا ہے۔

2024 سے ایک پالیسی کے تحت طالبان کی صفوں میں غیر پشتون طالبان کو غیر مسلح کرنے اور غیر اہم

پوسٹوں پر لگانے کا سلسلہ جاری ہے، اس پالیسی کے تحت بے شمار لوگوں کو غیر مسلح کیا گیا۔ جن میں صلاح الدین ایوبی گروپ سب سے اہم اور طاقتور گروپ ہے، اور اب طالبان کو انہی پالیسیوں کی وجہ سے ترک کر چکا ہے۔ یہ تنازع صرف نسلی نہیں بلکہ علاقائی بھی ہے، کیونکہ قندھار کی قیادت صرف شمالی افغانستان کو ہی نہیں بلکہ قندھار اور ہلمند کے سوا دیگر پشتون صوبوں کو بھی اپنے ذاتی تسلط میں رکھنا چاہتی ہے۔ اس کی وجہ سے کئی صوبوں میں نان پشتون اور غیر قندھاری طالبان بغاوت کی طرف مائل ہو رہے ہیں، اور شمال میں طالبان کی ان پالیسیوں سے نیشنل ریزسٹنس فرنٹ (این آر ایف) اور افغانستان فریڈم فرنٹ (اے ایف ایف) جیسی طالبان مخالف تنظیمیں فائدہ اٹھا رہی ہیں۔

## پشتون نان پشتون لڑائی

طالبان میں پشتون اور غیر پشتون کی باہمی لڑائی اور اختلافات اس حد تک بڑھ چکے ہیں کہ اب ایک دوسرے کی گرفتاریوں اور حملوں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ گزشتہ ایک ہفتے کے دوران تین ایسے واقعات پیش آئے ہیں جو طالبان کے اندرونی تناؤ کو واضح کرتے ہیں۔ 17 نومبر 2025 کو صوبہ بغلان کے ضلع فرنگ کے طالبان ضلعی سربراہ شبیر احمد کو طالبان انٹیلی جنس نے ان کے گھر سے گرفتار کر لیا۔ ذرائع کے مطابق شبیر احمد کو ان کے کزن اور بیٹے سمیت حراست میں لیا گیا، اور دو دن کی تفتیش کے بعد تینوں کو ضلع فرنگ سے منتقل کر کے بغلان کے صوبائی انٹیلی جنس ڈائریکٹوریٹ بھیج دیا گیا۔ یہ گرفتاری طالبان کے اندر نسلی اختلافات، خصوصاً پشتون اور تاجک/ ہزارہ تقسیم، کے باعث عمل میں آئی۔ شبیر احمد، جو پشتون ہونے کے باوجود مقامی سطح پر بااثر سمجھے جاتے تھے، پر الزام ہے کہ وہ مقامی تاجک دھڑوں سے روابط رکھتے تھے۔ ذرائع کے مطابق وہ مقامی وسائل، خاص طور پر سرکاری زمین، کو قندھار اور ہلمند سے تعلق رکھنے والے طالبان کمانڈروں کو دینے کی مخالفت کر رہے تھے۔ شبیر احمد پر مخالف گروہوں سے رابطوں اور وسائل کی تقسیم میں بدعنوانی کے الزامات بھی عائد کیے گئے ہیں۔ ذرائع کے مطابق انہیں ان کے گاؤں خوست (ضلع فرنگ) سے گرفتار کیا گیا۔ ان پر امیر المومنین کے احکامات کی خلاف ورزی کے تحت غداری اور بغاوت کے مقدمات چلائے جائیں گے۔

طالبان رہنما ہبت اللہ اخوندزادہ نے جون 2025 میں ایک حکم جاری کیا تھا جس میں ان کے احکامات کی نافرمانی کو ریاست کے خلاف غداری اور بغاوت قرار دیا گیا، اور ایسے تمام مقدمات کو فوجی عدالتوں میں

چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔اسی طرح صوبہ فراہ میں طالبان کے محکمہ شماریات کے صوبائی سربراہ مسنا بلوچ پر حملہ کیا گیا۔ یہ حملہ ان کے صوبائی دفتر کے قریب اس وقت ہوا جب وہ ایک میٹنگ سے باہر آ رہے تھے۔مسنا بلوچ زخمی ہوئے جبکہ حملہ آور فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ذرائع کے مطابق یہ حملہ طالبان کے ایک اندرونی دھڑے کی کارستانی تھی جوان کی تقرری سے ناخوش تھا۔مسنا بلوچ مقامی بلوچ قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اور انہیں 2024 میں محکمہ شماریات میں تعینات کیا گیا تھا، جو وسائل کی نگرانی کرتا ہے۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ صوبائی جی ڈی آئی افسر مولوی برکت اللہ صدیقی اور فراہ میں تعینات طالبان کی فوجی یونٹ کے کمانڈر مولوی نصیب اللہ اس تقرری کے مخالف تھے۔اسی مخالفت کے باعث مارچ 2025 میں مسنا بلوچ کو کابل منتقل کر دیا گیا، تاہم مقامی بلوچ قبائل کے شدید احتجاج کے بعد انہیں دوبارہ ان کے عہدے پر بحال کرنا پڑا۔اگست 2025 سے مسنا بلوچ اور مولوی برکت اللہ کے درمیان امدادی وسائل کی تقسیم پر شدید اختلافات دوبارہ پیدا ہو گئے۔نومبر کے پہلے ہفتے میں گورنر آفس میں ہونے والی ایک میٹنگ کے دوران دونوں کے درمیان ہاتھا پائی کی اطلاعات بھی سامنے آئیں۔

## شمال ہاتھ سے نکل رہا ہے

شمالی افغانستان میں خانہ جنگی کے خطرات میں اضافہ ہو گیا ہے، جہاں افغان طالبان کے اندر پشتون اور ازبک دھڑوں کے درمیان اختلافات انتہائی شدت اختیار کر چکے ہیں۔صورتحال 2023 دسمبر کے بعد اس وقت خراب ہونا شروع ہوئی جب ملا ہیبت اللہ نے کنج عافیت سے نکل کر حکومت، اقتدار اور اختیار پر مکمل کنٹرول کا فیصلہ کیا اور پہلے قدم کے طور پر ردعمل سے بچنے کی خاطر طالبان فورس میں تمام غیر پشتون لوگوں کو غیر مسلح کرنے اور انہیں کسی بھی سطح پر کمانڈ سے الگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں تک کہ آرمی چیف قاری فصیح الدین فطرت سے اس کے اپنے گارڈز منتخب کرنے کا اختیار بھی واپس لے لیا گیا۔صورتحال اس وقت مزید خراب ہوئی جب سینئر طالبان کمانڈر قاری صلاح الدین ایوبی جیسے اور عوام میں مقبول کمانڈروں کو بھی توہین آمیز طریقے سے غیر مسلح کرنے کی کوشش کی گئی، جس پر صلاح الدین نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور اب ازبک طالبان قیادت کے ساتھ مل کر ایک بڑے اقدام کی تیاری کر رہے ہیں۔حالانکہ صلاح الدین ایوبی وہ کمانڈر تھا، جس نے قاری فصیح الدین سے مل کر شمالی افغانستان میں طالبان کو مستحکم کیا، ورنہ شمال میں طالبان ملا عمر کے دور میں بھی ٹک نہیں سکے تھے۔ یہ صلاح الدین ایوبی ہی

تھے، جن کی محنت سے شمال میں طالبان کا وجود قبول کیا گیا۔ لیکن اسی صلاح الدین ایوبی کی تذلیل کرتے ہوئے یہ تک نہیں سوچا گیا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوسکتا۔ حالانکہ شمال میں طالبان کو متحرک کرنے کا فیصلہ کرتے وقت ملا ہیبت اللہ اور شمال کی طالبان قیادت یعنی صلاح الدین اور قاری فصیح کے ساتھ ایک معاہدہ کیا گیا تھا کہ اقتدار میں آنے کے بعد انہیں برابری کی حیثیت دی جائے گی، لیکن جیسے ہی طاقت میں آئے انہوں نے اپنے روایتی قندھاری طریقے شروع کر دیئے۔

ذرائع کے مطابق برطرف کماں ڈر ہی بغاوت کی تیاری نہیں رکر ہے بلکہ طالبان قیادت میں اہم عہدوں پر فائز ازبک کمانڈروں نے مشترکہ لائحہ عمل کے لیے رابطے مکمل کر لیے ہیں اور مناسب وقت پر کوئی بڑا اعلان سامنے آ سکتا ہے۔ یہ ساری صورتحال قاری صلاح الدین کے ساتھ مبینہ توہین آمیز رویے کے بعد پیدا ہوئی۔ ایک قریبی ذریعے کے مطابق قاری صلاح الدین نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ بھی طالبان قیادت میں موجود اپنے ازبک ساتھیوں کے مشورے سے ہی کیا تھا، جس میں سرفہرست نائب وزیر اعظم ملا عبدالسلام حنفی، آرمی چیف قاری فصیح الدین فطرت اور ایک منحرف طالبان رہنما مخدوم عالم کی مشاورت سے کیا۔

صلاح الدین کے قریبی ذریعے کے مطابق کابل فتح کے بعد پشتون قیادت، خاص طور پر قندھار گروپ، کا رویہ توہین آمیز ہو گیا تھا۔ ان کے مطابق توقع تھی کہ ملا ہیبت اللہ اس صورتحال کا نوٹس لیں گے، مگر ایک سال گزرنے کے باوجود وعدے پورے نہیں ہوئے، جس کے باعث ازبک طالبان اپنی حکمت عملی خود بنانے پر مجبور ہیں۔ ایک سوال پر قاری فصیح الدین نے تصدیق کی کہ وہ متعدد آپشنز پر کام کر رہے ہیں اور تمام ازبک کمانڈر ایک متفقہ فیصلہ کریں گے۔ ان کے مطابق اب مزید پشتون طالبان کی ''غلامی'' میں رہنا ضروری نہیں۔

ذرائع کے مطابق نائب وزیر اعظم ملا عبدالسلام حنفی اور آرمی چیف قاری فصیح الدین مکمل طور پر قاری صلاح الدین کے ساتھ ہیں اور مسلسل مشاورت جاری ہے۔ حکومت چھوڑنے کے بعد قاری صلاح الدین نے 2022 اور 2023 میں طالبان سے الگ ہونے والے یا نکالے گئے ازبک کمانڈروں سے بھی رابطے شروع کیے ہیں، جو ان کی حمایت کے لیے تیار ہیں۔ اس گروہ میں اہم نام مخدوم عالم ربانی (عرف ملا رومی) کا ہے، جو طالبان کے ابتدائی دور میں فاریاب میں اہم کمانڈر تھے۔ انہوں نے فاریاب،

جوزجان، سمنگان اور بلخ میں طالبان کی پیش قدمی میں اہم کردار ادا کیا، لیکن حکومت بننے کے بعد انہیں اہم عہدہ دینے کے بجائے غیر مؤثر کر دیا گیا۔ احتجاج پر انہیں جنوری 2022 میں گرفتار کیا گیا اور جولائی 2023 میں رہا کیا گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے علاقے فاریاب میں مقیم رہے اور اب دوبارہ متحرک ہیں۔

اسی طرح ایک اور کمانڈر قاری وقاص، جو 2022 میں طالبان سے الگ ہو کر این آر ایف میں شامل ہوئے تھے، بھی قاری صلاح الدین سے رابطے میں ہیں۔ وہ بدخشاں کے علاقے تگاب میں طالبان ریڈ یونٹ کے کمانڈر رہ چکے ہیں۔ گرفتاری کی کوشش کے دوران انہوں نے بغاوت کی اور بعد میں این آر ایف میں شامل ہو گئے۔ ذرائع کے مطابق عبدالحمید خراسانی، جو پنجشیر میں بدری فورس کے کمانڈر رہ چکے ہیں، بھی قاری صلاح الدین کے ساتھ رابطے میں ہیں اور طالبان کے خلاف ممکنہ کارروائی کے لیے تیار ہیں۔ اطلاعات کے مطابق ازبک کمانڈرز کے اندر اور باہر دونوں جگہ رابطے تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ قاری صلاح الدین ان کی جانب سے این آر ایف کے ساتھ تاجکستان میں، اور مشرقی افغانستان میں نئی تنظیم "جماعت الرباط" کے ساتھ بھی رابطے میں ہیں، اور مستقبل کے حوالے سے مشاورت جاری ہے۔

ذرائع یہ بھی بتاتے ہیں کہ ملا عبدالسلام حنفی اور قاری فصیح الدین ایک تجویز پر کام کر رہے ہیں کہ ازبک طالبان کا ایک الگ دھڑا تشکیل دیا جائے، جبکہ صلاح الدین اور دیگر کمانڈر انتقامی کارروائی کے حق میں ہیں اور چاہتے ہیں کہ سب ایک ہی فیصلہ کریں۔ یہ صورتحال طالبان حکومت کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ نائب وزیر اعظم اور آرمی چیف جیسے اہم عہدوں پر فائز افراد کا باغی کمانڈروں سے رابطہ اس بات کی علامت ہے کہ اندرونی اعتماد بری طرح متاثر ہو چکا ہے۔ اگر ازبک دھڑا واقعی الگ راستہ اختیار کرتا ہے تو یہ طالبان ڈھانچے کے لیے پہلا بڑا جھٹکا ہوگا، جو شمالی افغانستان میں اس کی گرفت کو کمزور کر سکتا ہے۔ قندھاری قیادت کی جانب سے اس معاملے کو سنجیدگی سے نہ لینا صورتحال کو مزید خراب کر سکتا ہے۔

اگر یہ اختلافات مزید بڑھتے ہیں تو شمالی افغانستان میں خانہ جنگی کا خطرہ واضح ہو جائے گا۔ بعض حلقوں کے مطابق اگر یہ گروہ کھل کر طالبان کے خلاف کھڑے ہوتے ہیں تو پرانی جہادی قیادت، جو اب مختلف ممالک میں موجود ہے، بھی اس عمل میں شامل ہو سکتی ہے۔

# بغاوت پھیل رہی ہے

ملا ہیبت اللہ کی نسل پرستی اور مطلق العنان بادشاہت کا نتیجہ یہ ہے کہ افغانستان میں اب بغاوت پھیلنے لگی ہے، حسب توقع ملا ہیبت اللہ کے خلاف پہلا نعرہ خود طالبان کی صفوں سے بلند ہوا ہے۔ دکھائی یہ دیتا ہے کہ اس بار بھی شاید طالبان کو اقتدار سے بے دخل کرنے کا آغاز شمال سے ہی ہوگا۔ وہاں طالبان کے غیر پشتون کمانڈروں میں بغاوت پہلے سے موجود ہے، لیکن بدخشاں کے ضلع جرم کے کمانڈر مولوی ضابط کریم نے پہلی چوٹ لگا دی ہے، یہ ایک اہم پیش رفت ہے۔ طالبان کے ایک مقامی غیر پشتون کمانڈر ضابط کریم نے طالبان سے منحرف ہو کر بغاوت کا اعلان کر دیا ہے اور اپنے 30 مسلح ساتھیوں کے ساتھ پہاڑوں میں چلا گیا، اس کے ساتھ طالبان کا ایک مکمل یونٹ بھی بغاوت کر چکا ہے، جبکہ دارۂ خستک سے تعلق رکھنے والے اس کمانڈر نے طالبان کے خلاف باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا، طالبان نے اس صورتحال کے جواب میں صوبائی مرکز اور ضلع برک سے اضافی نفری علاقے کی جانب روانہ کی اس سے قبل اکتوبر 2025 میں بھی اسی علاقے میں ایک کمانڈر عبدالرحمٰن عمار نے بھی بغاوت کی تھی، لیکن اسے دھوکے سے گرفتار کر لیا گیا تھا، جس کی وجہ سے اس بار ہونے والی بغاوت کو بات چیت سے کنٹرول کرنا ممکن نہیں ہو سکا اور کمانڈر مولوی ضابط کریم نے خراسان لبریشن موومنٹ کے نام سے ایک تنظیم کا بھی اعلان کر دیا ہے۔

ضابط کریم کے پاس ابھی نفری کم ہے، لیکن مقامی شہریوں کی حمایت سے اس نے 10 مئی کو بدخشاں کے ارگو اور شیکی اضلاع پر کنٹرول حاصل کر لیا، جہاں سے طالبان کو فرار ہونا پڑا، اسے جلد یہ قبضہ چھوڑنا پڑا، لیکن یہ طالبان کے اس رجیم کے دوران پہلا وقعہ ہے کہ انہیں دو دن تک دو اضلاع پر قبضہ برداشت کرنا پڑا، یقینی سی بات ہے کہ ضابط کریم اس فورس کے ساتھ طالبان سے اپنا علاقہ آزاد نہیں کروا سکے گا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ بغاوت کا آغاز ہے، جسے سوشل میڈیا پر خوش آمدید کہا گیا ہے، عالمی حمایت کے مطالبات بلند ہو رہے ہیں۔ نیشنل ریزسٹنس فرنٹ (NRF)، نے ان مبینہ فتوحات پر جشن منایا۔ طالبان مخالف گروپس سے منسلک متعدد سوشل میڈیا اکاؤنٹس اسے طالبان کی علاقائی بالادستی کے لیے ایک بڑا دھچکا قرار دیا۔ اسے افغانستان میں منظم طالبان مخالف مزاحمت کے دوبارہ ابھرنے کا اشارہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تنازع کے مستقبل کے اثرات پڑوسی ممالک کے ردعمل پر منحصر

ہوں گے۔ بین الاقوامی طاقتوں کی شمولیت بدخشاں کی صورتحال کو بدل سکتی ہے۔

## طالبان کے خلاف مضبوط ہوتی ہوئی مزاحمت

طالبان کی نسل پرستی، وعدہ خلافی اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم نے افغانستان کے اندر پہلے سے موجود سیاسی اور سماجی خلیج کو مزید گہرا کر دیا ہے۔ یہی وہ ماحول ہے جس میں طالبان مخالف دو بڑی تنظیمیں نیشنل ریزسٹنس فرنٹ (این آر ایف) اور افغان فریڈم فرنٹ (اے ایف ایف) تیزی سے ابھری ہیں۔ دونوں گروپ اب صرف مزاحمتی آواز نہیں رہے بلکہ کئی علاقوں میں طالبان کے لیے ایک مستقل چیلنج اور سیکیورٹی دباؤ کی علامت بن چکے ہیں۔

بدخشان میں جاری سونے کی کانوں پر قبضے کی جنگ ہیبت اللہ رجیم کے انجام کا آغاز بنتی دکھائی دے رہی ہے، جہاں بغاوت اس حد پھیل چکی ہے کہ طالبان کے اپنے ہی دھڑے ایک دوسرے کے مقابل ہیں اور ہیبت اللہ سیکریٹیریٹ عقل سے ماوریٰ فیصلے کر کے اپنی ہی حکومت کو انجام تک پہنچانے کے درپے ہے۔ سونے کی ہوس نے یوں قندھاریوں کی عقل پر پردے ڈال رکھے ہیں کہ انہیں اپنا انجام بھی دکھائی نہیں دے رہا۔

یہاں چند باتیں واضح ہیں اول یہ کہ بغاوت طالبان کے اندر سے ہو رہی ہے، کوئی باہر سے نہیں آیا، وہی لوگ جو کل تک شریعت اور اسلام کے نام پر ایکسپلائٹ ہوئے اور طالبان کی صفوں میں شامل ہو کر شمال پر ان کے قبضے کی وجہ بنے وہی اب ان کی نسل پرستی اور قبضہ گیری کو دیکھتے ہوئے ان کے مقابل آن کھڑے ہوئے ہیں۔ تقدس کا لبادہ تار تار ہو چکا ہے، اور اب انتقام کا دور شروع ہونے جا رہا ہے۔

دوسری بات یہ کہ لوگوں نے سبق سیکھا ہے، عبدالرحمٰن حماد نے مذاکرات کی غلطی کی گرفتار ہوا، لیکن اس گرفتاری نے قندھاریوں کو اعتبار ختم کر دیا ہے اور اب ضابط کریم ان پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس کی اسی بات نے اس کی حمائت بڑھا دی ہے اور لوگ اس کے ساتھ جڑنا شروع ہو چکے ہیں، یہاں تک کہ این آر ایف اور اے ایف ایف نے بھی اس کی حمائت کا اعلان کر دیا ہے اور بدخشاں سے طالبان کو نکالنے کی جنگ چھیڑ دی ہے، جو خلاف توقع اس تیزی سے پھیل رہی ہے، جیسے تیز ہوا سے جنگل کی آگ پھیلتی ہے، اس پھیلاؤ میں بنیادی کردار خود قندھاری ادا کر رہے ہیں۔

## قندھاری وفود مذاکرات میں ناکام

اس بغاوت کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ ضابط کریم سے مذاکرات کے لئے طالبان حکومت نے دو وفود بھیجے ایک کی قیادت چیف جسٹس عبدالحکیم حقانی اور دوسرے کی قیادت نائب وزیراعظم ملاعبدالغنی برادر کر رہے تھے، تاہم ضابط کریم جو نئی تنظیم خراسان فریڈم موومنٹ کے نام سے طالبان کے خلاف جنگ شروع کر چکے ہیں، نے مذاکرات سے انکار کر دیا ہے اور طالبان حکومت کو تین نکاتی چارٹر آف ڈیمانڈ بھیجا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ:

اول۔ فوری طور پر طالبان فورسز بدخشان سے نکل جائیں،

دوم۔سونے کی تمام کانیں مقامی لوگوں کے حوالے کی جائیں،

سوم۔پوست کی فصل کو تباہ کرنا بند کر دیا جائے۔

## افغانستان میں علیحدگی کی تحاریک شروع:

طالبان کے اقتدار سنبھالنے کے تقریباً پانچ سال بعد افغانستان میں قومی اتحاد کی بجائے نسلی اور علاقائی تقسیم کے دراڑیں کھلنے لگی ہیں۔خاص طور پر شمالی اور وسطی علاقوں میں، جہاں ازبک، ترکمان، تاجک اور ہزارہ برادریاں بڑی تعداد میں آباد ہیں، طالبان کی سخت گیر، پشتون نواز، لوٹ مار اور نسلی تعصب پر مبنی پالیسیوں نے لوگوں میں شدید ناامیدی اور غم وغصہ پیدا کر دیا ہے۔نتیجتاً افغان تاریخ میں پہلی بار منظم علیحدگی پسند آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔افغان شہری اب کھلے عام یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ ایک ساتھ رہنا نہیں چاہتے اور الگ علاقائی وطن بنانا چاہتے ہیں۔اس صورتحال کی سب سے بڑی مثال دو اہم تحریکوں کی صورت میں سامنے آئی ہے۔

### جنوبی ترکستان کا مطالبہ

ایک طرف جنرل عبدالرشید دوستم کی قیادت والی ازبک اور ترکمان برادری سے وابستہ حلقوں نے جنوبی ترکستان کا مطالبہ کیا ہے، جبکہ دوسری طرف شیعہ ہزارہ رہنما استاد محمد محقق نے ہزارستان کے قیام کا اعلان کیا ہے۔ یہ دونوں تحریکیں طالبان کی لوٹ مار، نسلی تعصب اور وسائل غصب کرنے والی پالیسیوں کا براہ راست نتیجہ ہیں۔جنوبی ترکستان کی تحریک کا تعلق شمالی صوبوں جیسے جوزجان، فاریاب، سرِ پل، بلخ اور

بادغیس سے ہے، جہاں ترکی زبان بولنے والی ازبک اور ترکمان آبادی غالب ہے۔ جنرل عبدالرشید دوستم، جو طویل عرصے سے شمالی افغانستان میں ازبک برادری کے سب سے بااثر رہنما رہے ہیں، طالبان کے دور میں جلاوطنی میں ہیں اور ان کے حامیوں نے واضح کیا ہے کہ وہ پشتونوں کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے۔ ان کی پارٹی جنبش ملی اسلامی نے الگ جنوبی ترکستان کے قیام کا نعرہ بلند کیا ہے۔ تحریک کے حامیوں کا کہنا ہے کہ طالبان نے شمالی علاقوں کی زرخیز زمینیں اور وسائل کو پشتون قبائلیوں اور طالبان حامیوں کے حوالے کر دیے ہیں۔ مقامی ازبک اور ترکمان کسانوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کیا جا رہا ہے، جبکہ انتظامی عہدوں پر غیر مقامی پشتون افسران کو تعینات کیا جا رہا ہے۔ یہ لوٹ مار اور نسلی تعصب ہی ہے جس نے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ اب الگ وفاقی یا علیحدہ علاقے کا مطالبہ کریں۔ اس تحریک کی قیادت رشید دوستم کا بیٹا یا رمحمد دوستم کر رہا ہے۔

## امارت اسلامیہ ہزارستان کا نعرہ

دوسری جانب استاد محمد محقق، جو حزب وحدت کے اہم رہنما ہیں، نے ہزارستان کا مطالبہ کیا ہے۔ بامیان، دایکندی، غزنی کے ہزارہ جات اور مہدی علاقوں کو الگ خودمختار علاقہ بنانے کا یہ مطالبہ طالبان کی شیعہ مخالف پالیسیوں کا ردعمل ہے۔ طالبان نے شیعہ پرسنل سٹیٹس لا کو نظرانداز کر کے پورے ملک میں حنفی فقہ نافذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ شیعہ علما کو متعہ نکاح جیسے مذہبی معاملات پر پابند کیا جا رہا ہے، انہیں حراست میں لیا جا رہا ہے اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ حالیہ واقعات میں شیعہ عالم حسین دادشریفی کے ساتھ پیش آنے والا سلوک اسی پالیسی کا حصہ ہے۔ زمینوں کی ضبطی اور معاشی وسائل پر قبضہ طالبان کی لوٹ مار کی واضح مثالیں ہیں۔ طالبان کی پالیسیاں بنیادی طور پر تین چیزوں پر مبنی ہیں جو ان علیحدگی پسند آوازوں کی جڑ ہیں۔

1۔۔ سب سے پہلے نسلی تعصب، جس کے تحت غیر پشتون برادریوں کو حکومت کے اعلیٰ عہدوں سے مکمل طور پر خارج رکھا گیا ہے۔

2۔۔ دوسرا وسائل کی لوٹ مار، جس میں شمالی اور وسطی علاقوں کی زرعی زمینیں، معدنی وسائل اور پانی کے ذخائر کو طالبان حامی پشتون گروہوں کے حوالے کیا جا رہا ہے۔

3۔ تیسرا مذہبی دباؤ، جس میں شیعہ برادری کو ان کے فقہی عقائد کے مطابق زندگی گزارنے سے روکا جا رہا ہے۔

یہ سب عوامل مل کر ایک ایسا ماحول پیدا کر رہے ہیں جہاں لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ مرکزی حکومت ان کے حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتی، بلکہ خود ان پر زیادتی کر رہی ہے۔ افغانستان کی تاریخ میں یہ ایک خطرناک موڑ ہے۔ پچھلے تمام ادوار میں نسلی تناؤ ضرور موجود رہا مگر کوئی بڑا سیاسی رہنما یا برادری الگ وطن کا مطالبہ کرنے کی ہمت نہیں کر پائی تھی۔ طالبان کی پالیسیوں نے پہلی بار یہ حد عبور کر دی ہے۔ اگر انہوں نے فوری طور پر اپنا رویہ نہ بدلا، نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے حقوق کا احترام نہ کیا، اور لوٹ مار بند نہ کی تو ملک کی سالمیت مزید خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ شمالی اور وسطی افغانستان میں بڑھتی ہوئی یہ آوازیں اب صرف احتجاج کی نہیں بلکہ علیحدگی کی طرف جا رہی ہیں، جو پورے ملک کے لیے ایک سنگین چیلنج ہے۔ یہ صورتحال طالبان کے لیے ایک وارننگ ہے کہ جبر، تعصب اور لوٹ مار سے کوئی ملک نہیں چل سکتا۔ اگر اقلیتوں کے جائز مطالبات کو نظر انداز کیا گیا تو افغانستان کی تقسیم کا خطرہ حقیقت بن سکتا ہے۔

## این آر ایف کا پس منظر اور ارتقاء

افغانستان کی حالیہ تاریخ میں این آر ایف ایک ایسی تحریک کے طور پر سامنے آئی جس نے طالبان کے اقتدار کے بعد مزاحمت کو دوبارہ منظم کرنے کی کوشش کی۔ اگست 2021 میں جب طالبان نے امریکی انخلا کے بعد کابل پر کنٹرول حاصل کیا تو بہت سے مبصرین نے یہ سمجھا کہ اب منظم مزاحمت کا دور ختم ہو چکا ہے۔ لیکن افغانستان کی سیاست ہمیشہ اس مفروضے کو غلط ثابت کرتی رہی ہے کہ یہاں طاقت کا مکمل تسلط ممکن ہے۔ این آر ایف کی قیادت احمد مسعود کر رہے ہیں، جو مشہور مزاحمتی رہنما احمد شاہ مسعود کے صاحبزادے ہیں۔ احمد شاہ مسعود افغانستان کی سیاسی تاریخ میں ''شیرِ پنجشیر'' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

2021 کے بعد سابق افغان فوج، انٹیلی جنس اہلکاروں اور خصوصی دستوں کے کئی عناصر پنجشیر اور اندراب جیسے علاقوں میں جمع ہونے لگے۔ یہی عناصر بعد میں این آر ایف کا حصہ بنے۔ ابتدا میں پنجشیر میں شدید جھڑپیں ہوئیں۔ طالبان نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے وادی پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا ہے، جبکہ این آر ایف نے اعلان کیا کہ مزاحمت جاری رہے گی۔

## تنظیمی ڈھانچہ اور حکمت عملی

این آر ایف خود کو ایک قومی مزاحمتی تحریک کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ افغانستان میں

ایک کثیر النسلی، نمائندہ اور جمہوری نظام چاہتا ہے۔ تنظیم طالبان کے یک جماعتی اور سخت کنٹرول والے نظام کی مخالفت کرتی ہے۔ این آر ایف کی بنیاد زیادہ تر شمالی افغانستان، خصوصاً تاجک اکثریتی علاقوں پر ہے۔ اسے شمالی اتحاد کی نئی شکل کہا جا سکتا ہے۔ اس کی سرگرمیاں زیادہ تر گوریلا طرز جنگ پر مبنی ہیں، جس میں اچانک حملے، پہاڑی علاقوں کا استعمال اور چھوٹے یونٹوں کی کارروائیاں شامل ہیں۔ مئی 2026 کے دوسرے ہفتے میں اس نے پنجشیر میں ایک شاندار جنگ لڑ کر بتا دیا ہے کہ مستقبل میں اس سے نمٹنا آسان نہ ہوگا۔

## عسکری سرگرمیاں اور پھیلاؤ

2022 سے 2025 کے دوران این آر ایف نے سینکڑوں چھوٹے بڑے حملوں کی ذمہ داری قبول کی۔ ان میں طالبان چوکیوں پر حملے، سیکیورٹی قافلوں پر گھات، انٹیلی جنس اہلکاروں کو نشانہ بنانا اور بعض علاقوں میں وقتی کنٹرول حاصل کرنا شامل ہے۔ یہ سرگرمیاں بنیادی طور پر بغلان، تخار، بدخشاں، قندوز، پروان اور اندراب وادی میں رپورٹ ہوتی رہی ہیں۔ پنجشیر اب بھی علامتی اور اسٹریٹجک مرکز سمجھا جاتا ہے۔ این آر ایف کے ابھار کی ایک بڑی وجہ طالبان کی داخلی پالیسیاں ہیں۔ قندھار میں طاقت کے ارتکاز، محدود سیاسی شراکت، خواتین کی تعلیم پر پابندی، میڈیا پر کنٹرول اور سابق حکومت سے وابستہ افراد کے خلاف کارروائیوں نے شمالی علاقوں میں ناراضی کو بڑھایا ہے۔

خاص طور پر تاجک، ازبک اور ہزارہ آبادی والے علاقوں میں یہ احساس بڑھا کہ انہیں سیاسی طور پر نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ یہی ناراضی بعض جگہوں پر این آر ایف کے لیے خاموش حمایت میں بدل گئی۔ اندراب اور پنجشیر میں طالبان کی سخت سیکیورٹی کارروائیوں، تلاشی مہمات، گرفتاریوں اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے الزامات نے بھی صورتحال کو مزید کشیدہ کیا۔

## معاشی بحران اور سماجی اثرات

افغانستان کی خراب معاشی صورتحال بھی مزاحمت کے پھیلاؤ کا اہم سبب ہے۔ بین الاقوامی امداد میں کمی، بینکاری نظام کی کمزوری، بے روزگاری اور غربت نے نوجوان نسل میں مایوسی پیدا کی ہے۔ اس ماحول میں حکومت مخالف جذبات کو مزید تقویت ملی۔

## عسکری حکمت عملی اور چیلنجز

این آر ایف نے صرف زمینی محاذ پر نہیں بلکہ معلوماتی جنگ میں بھی سرگرمی دکھائی ہے۔ سوشل میڈیا پر تنظیم اپنے حملوں کی ویڈیوز، بیانات اور تصاویر جاری کرتی ہے تاکہ یہ تاثر برقرار رہے کہ مزاحمت ختم نہیں ہوئی۔ طالبان بھی اسی طرز پر اپنی کارروائیوں کی ویڈیوز اور بیانات جاری کرتے ہیں، جس سے ایک مستقل بیانیاتی جنگ جاری رہتی ہے۔ این آر ایف کی حکمت عملی بنیادی طور پر گوریلا جنگ پر مبنی ہے۔ سابق فوجی اہلکاروں کی شمولیت نے اس کی صلاحیت میں کچھ اضافہ کیا ہے، لیکن اسے کئی بڑے چیلنجز درپیش ہیں۔ وسائل کی کمی، محدود اسلحہ، کمزور تنظیمی ڈھانچہ اور پورے افغانستان میں ایک متحد سیاسی پلیٹ فارم کی کمی اس کی بڑی کمزوریاں ہیں۔

این آر ایف افغانستان میں اس حقیقت کی علامت ہے کہ طالبان کا اقتدار اگرچہ مضبوط ہے، لیکن مکمل طور پر بلا مقابلہ نہیں۔ شمالی افغانستان کی تاریخی مزاحمتی روایت، نسلی تقسیم، سیاسی عدم شمولیت اور معاشی دباؤ نے ایک ایسا ماحول پیدا کیا ہے جس میں محدود مگر مسلسل مزاحمت جاری ہے۔ یہ تحریک اس وقت طالبان کے لیے فوری خطرہ نہیں، لیکن یہ ایک واضح اشارہ ہے کہ افغانستان میں سیاسی استحکام ابھی مکمل طور پر قائم نہیں ہوا۔

## افغانستان فریڈم فرنٹ (اے ایف ایف)

افغانستان میں طالبان حکومت کے خلاف سرگرم مزاحمتی گروہوں میں افغانستان فریڈم فرنٹ (اے ایف ایف) ایک نسبتاً نئی مگر تیزی سے سامنے آنے والی تنظیم ہے۔ اگست 2021 میں طالبان کے دوبارہ اقتدار میں آنے کے بعد جب سابق افغان حکومت مکمل طور پر ختم ہوگئی، تو بہت سے تجزیہ کاروں نے سمجھا کہ منظم مزاحمت کا باب بند ہو چکا ہے۔ مگر زمینی حقیقت اس کے برعکس نکلی۔ افغانستان میں وقت کے ساتھ ساتھ مختلف چھوٹے مزاحمتی نیٹ ورک ابھرنے لگے، جن میں سے ایک اہم نام افغانستان فریڈم فرنٹ ہے۔ یہ تنظیم بنیادی طور پر سابق افغان نیشنل آرمی، اسپیشل فورسز، انٹیلی جنس اہلکاروں اور طالبان مخالف کمانڈرز پر مشتمل سمجھی جاتی ہے۔ اس کے اندر وہ عناصر شامل ہیں جو ماضی میں امریکی اور نیٹو فورسز کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ اسی وجہ سے اس کی کارروائیوں کو بعض مبصرین زیادہ پیشہ ورانہ اور منظم نوعیت کا قرار دیتے ہیں۔ افغانستان فریڈم فرنٹ کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ وہ افغانستان میں ایک ''جامع اور نمائندہ

سیاسی نظام‘‘ کے لیے مزاحمت کر رہی ہے۔ تاہم عملی طور پر اس کی پہچان زیادہ تر عسکری کارروائیوں تک محدود ہے۔ یہ تنظیم خود کو صرف ایک عسکری گروہ نہیں بلکہ ایک قومی مزاحمتی تحریک کے طور پر پیش کرتی ہے، لیکن اس کا مرکزی ڈھانچہ زیادہ تر خفیہ نیٹ ورک کی صورت میں کام کرتا ہے۔ سابق حکومت کے ایک اہم کردار جنرل سمیع سعادت کے بانی اور سربراہ ہیں۔

طالبان کے اقتدار میں آنے کے بعد ہزاروں سابق سیکورٹی اہلکار یا تو ملک سے باہر چلے گئے یا زیرِ زمین چلے گئے۔ انہی میں سے کچھ نے مختلف علاقوں میں چھوٹے نیٹ ورک قائم کیے جنہوں نے بعد میں افغانستان فریڈم فرنٹ کی شکل اختیار کی۔ اس تنظیم کی سرگرمیوں کا مرکز زیادہ تر کابل، پروان، کاپیسا، بغلان، تخار اور پنجشیر جیسے علاقے رہے ہیں۔

افغانستان فریڈم فرنٹ نے 2022 سے 2025 کے دوران متعدد حملوں کی ذمہ داری قبول کی۔ ان کارروائیوں میں طالبان کی چیک پوسٹوں پر حملے، سیکورٹی اہلکاروں کو نشانہ بنانا، گھات لگا کر کارروائیاں اور محدود نوعیت کے دھماکے شامل ہیں۔ اگرچہ ان دعوؤں کی مکمل آزاد تصدیق مشکل ہے، لیکن مختلف ذرائع یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ افغانستان میں طالبان مخالف گوریلا سرگرمیاں مسلسل جاری ہیں۔

اس تنظیم کی ایک اہم خصوصیت اس کا خفیہ انداز ہے۔ اس کے پاس کوئی واضح سیاسی قیادت یا کھلا ڈھانچہ موجود نہیں۔ اسی وجہ سے اسے بعض تجزیہ کار ’’شیڈو ریزسٹنس نیٹ ورک‘‘ بھی کہتے ہیں۔ تنظیم اپنی کارروائیوں کے بعد مختصر بیانات جاری کرتی ہے، لیکن قیادت، فنڈنگ اور تنظیمی ڈھانچے کی تفصیلات محدود رہتی ہیں۔

افغانستان فریڈم فرنٹ کے ابھرنے کی ایک بڑی وجہ طالبان کی موجودہ حکومتی پالیسیوں کو سمجھا جاتا ہے۔ خواتین کی تعلیم پر پابندیاں، سیاسی جماعتوں کی غیر موجودگی، میڈیا پر سخت کنٹرول اور سابق ریاستی اہلکاروں کے خلاف کارروائیوں نے معاشرے کے بعض طبقات میں ناراضی پیدا کی۔ یہی ناراضی بعض علاقوں میں مزاحمتی گروہوں کے لیے خاموش حمایت یا ہمدردی کی شکل اختیار کرتی ہے۔

نسلی اور علاقائی تناؤ بھی ایک اہم عنصر ہے۔ افغانستان ایک کثیر النسلی ملک ہے جہاں پشتون، تاجک، ازبک اور ہزارہ بڑی آبادی رکھتے ہیں۔ بعض غیر پشتون علاقوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ سیاسی طاقت محدود حلقے تک سمٹ گئی ہے۔ اسی احساس نے مزاحمتی بیانیے کو کچھ علاقوں میں جگہ دی۔

طالبان نے ان نیٹ ورکس کے خلاف مختلف علاقوں میں کارروائیاں کیں، سرچ آپریشنز کیے اور متعدد

افراد کی گرفتاریوں کا دعویٰ کیا۔ دوسری طرف انسانی حقوق کی بعض رپورٹس میں ان کارروائیوں پر سوالات بھی اٹھائے گئے۔ طالبان ان الزامات کو مسترد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کارروائیاں صرف مسلح عناصر کے خلاف کی جاتی ہیں۔ افغانستان فریڈم فرنٹ اور این آر ایف) کے درمیان بھی فرق پایا جاتا ہے۔ این آر ایف نسبتاً زیادہ سیاسی شناخت اور تاریخی پس منظر رکھتی ہے، جبکہ افغانستان فریڈم فرنٹ زیادہ خفیہ اور نیٹ ورک طرز کی تنظیم سمجھی جاتی ہے۔ دونوں کا مقصد طالبان کی حکومت کو چیلنج کرنا ہے، مگر طریقہ کار مختلف ہے۔

مستقبل کے حوالے سے ماہرین کی رائے مختلف ہے۔ کچھ کے مطابق اگر طالبان نے سیاسی شمولیت، معاشی بہتری اور سماجی نرمی اختیار نہ کی تو مزاحمتی گروہوں کے لیے مزید جگہ پیدا ہو سکتی ہے۔ جبکہ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ جب تک ان گروہوں کو وسیع عوامی حمایت نہیں ملتی، وہ طالبان کے لیے محدود سکیورٹی چیلنج سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔

مختصر یہ کہ افغانستان فریڈم فرنٹ افغانستان میں طالبان مخالف مزاحمت کی ایک ابھرتی ہوئی شکل ہے۔ اس کی طاقت اسلحے سے زیادہ اس سیاسی اور سماجی ماحول میں ہے جو افغانستان میں موجود ناراضی، بے چینی اور عدم اعتماد کو ظاہر کرتا ہے۔ افغانستان میں اصل سوال یہی ہے کہ آیا یہ ملک ایک بار پھر استحکام کی طرف جائے گا یا مزاحمت کے نئے سلسلے جنم لیتے رہیں گے۔

---

# باب سوم

## مطلق العنان بادشاہت:

طالبان ایک لشکر کی طرح کام کرتے ہیں، کوئی تنظیمی ڈھانچہ یا کمانڈ سٹرکچر نہیں ہے، امیر اور اس کے نیچے شوریٰ عالی اور شوریٰ نظامی یعنی عسکری کام کرتی ہیں۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ دونوں طرح کی شوریٰ امیر کی منتخب کردہ ہوتی ہیں لیکن ہمیشہ سے ایسی صورتحال نہیں تھی، اس کا ایک سسٹم تھا، اب وہ نہیں رہا۔ طالبان کا نظام دلگئی یعنی گروپس کے مجموعہ کی طرح کام کرتا ہے جس میں ہر کمانڈر کا اپنا ایک عسکری گروہ ہوتا ہے جس کی مہارت اور حجم ہی اس لیڈر یا کمانڈر کی حیثیت کا تعین کرتا ہے۔ ان میں سے بڑے گروپس کے لیڈر یا ان کے مقرر کردہ نمائندے دونوں طرح کی شوریٰ کے رکن بنائے جاتے تھے۔ امیر کا اپنا عسکری گروپ طالبان کی اندرونی انتظامی فورس کے طور پر کام کرتا تھا، تنظیم کو متحد رکھنا اور امیر کے احکامات کی تعمیل کروانا

امیر کے اپنے گروپ کا کام ہے۔اس نظام کے تحت ملا عمر کا بھی اپنا ایک عسکری گروپ تھا جو صرف اس سے وفادار تھا۔ بعد میں امیر بننے والے ملا اختر منصور کا بھی اپنا ایک گروپ موجود تھا جو طالبان کے اندرونی سسٹم کو چلانے کا ذمہ دار تھا۔2016 میں ملا منصور کے بعد امارت کا تنازع اس حد تک بڑھ گیا کہ طالبان کی تقسیم کا خطرہ پیدا ہو گیا جس پر ہمدرد عناصر کے مشورے پر ملا ہیبت اللہ کو اس لئے امیر بنایا گیا تھا کہ یہ غیر عسکری آدمی ہیں، ان کا اپنا کوئی گروپ بھی نہیں یعنی ان کا کوئی مفاد ہی نہیں۔ جب سوال یہ آیا کہ جب ان کا کوئی محاذ یعنی مسلح گروپ ہی نہیں تو معاملات کیسے چلائیں گے ملا ہیبت اللہ نے اس وقت کی شوریٰ سے ایک معاہدہ کیا اور حلف لیا کہ وہ اپنا کوئی عسکری گروپ قائم نہیں کریں گے تا کہ غیر جانبداری قائم رہے، انہوں نے اس موقع پر تمام گروپس نے حلف لیا کہ وہ ان کی غیر مشروط اطاعت کریں گے۔

یہ نظام 2021 میں طالبان کی فتح تک اسی طرح جاری رہا۔حکومت قائم ہونے کے بعد انتظامی طور پر کمزور، کم گو بلکہ گوشہ نشین اور قوت فیصلہ سے محروم امیر ملا ہیبت اللہ نے اپنے لئے عین و مینا کے بنگلوں پر قبضے کو ہی حکومت سمجھ لیا تو تمام گروپس بھی لوٹ مار اور مفادات کی دوڑ میں آزاد ہو گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جگہ جگہ اختلافات پیدا ہوئے، لوگوں نے کئی جگہ امارت کے احکامات ماننے سے انکار کر دیا تو ملا ہیبت اللہ نے اپریل 2022 میں شوریٰ کا اجلاس بلایا، اس کے سامنے ساری صورتحال رکھی، سب سے اطاعت کا یقین دلایا مگر نتیجہ صفر رہا بلکہ بغاوتیں اور تقسیم مزید بڑھ گئی، موصوف کو خود چونکہ مدرسہ میں پڑھانے کے سوا کوئی تجربہ نہیں تھا۔کبھی کسی گروپ کی کمان کی نہ ہی جہاد میں عملی طور پر کبھی شریک ہوئے، لہٰذا یہ صورتحال ان کے لئے ناقابل فہم تھی۔دوسری جانب جن ہمدرد ہاتھوں نے قبائے سکندری پہنائی تھی وہ بھی دستیاب نہ تھے، ایسے میں بجائے اس کے کہ حقانی اور قندھاری گروپ کی قیادت کو بٹھا کر مشورہ کرتے، آسان راستہ یہ اختیار کیا کہ مولوی ندا محمد ندیم اور یوسف وفا پر انحصار کیا، اول الذکر کی واحد خوبی یہ ہے کہ وہ ملا ہیبت اللہ کا داماد ہے اور موخر الذکر سمگلنگ کا وسیع تجربہ اور ہیبت اللہ کا سیکیورٹی گارڈ ہونے کے سوا کوئی خوبی نہیں رکھتے اور اسی خوبی کی بنا پر گورنر قندھار بھی بنائے گئے۔ان دونوں کی مشاورت سے انہوں نے ملک بھر میں اپنے ذاتی وفادار لوگوں کو عہدوں پر مقرر کرنا شروع کر دیا تا کہ کنٹرول ان کے ہاتھ میں رہے اور یہ لوگ ان سے وفادار ہوں گے تو کنٹرول میں رہیں گے۔

اس فیصلے کی مزاحمت دوسرے گروپس کی جانب سے سامنے آئی جس نے حالات کو مزید بگاڑ دیا کیونکہ جن

لوگوں کا تقرر کیا جا رہا تھا، ان کی سپورٹ میں بھی ملا ہیبت اللہ کے حکم کے سوا کوئی طاقت نہیں تھی۔ اس پر انہی دو لوگوں کے مشورے پر پہلے انہوں نے دوسروں کو کنٹرول کرنے کی خاطر ملک بھر میں "خصوصی یونٹ" کے نام پر اپنے وفاداروں کا گروہ کو منظم کرنے کی کوشش کی، جو ناکام رہی۔ اس پر انہوں نے فروری 2023 میں ایک بار پھر شوریٰ کا اجلاس بلایا اور تمام ارکان شوریٰ کو حکم دیا کہ اپنے اپنے عسکری گروپس تحلیل کر دیں، کسی ایک نے بھی اس حکم کو سنجیدہ نہیں لیا۔

## آمریت کا سفر

یہ وقت تھا جب القاعدہ ان کے رابطے میں آئی، ہماری اطلاع کے مطابق القاعدہ کے ایما پر طالبان میں موجود القاعدہ لیڈروں کے ایک وفد نے ملا ہیبت اللہ سے پہلی ملاقات قریباً جولائی 2023 میں کی۔ ان میں اس وقت گورنر ہلمند اب قندھار کے پولیس چیف ملا عبدالاحد طالب اور ڈپٹی انٹیلی جنس چیف ملا تاج میر جواد اور دیگر شامل تھے، انہوں نے اس ناکامی کو دیکھا محسوس کیا اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہیبت اللہ کی مدد کو پہنچے۔ یہاں سے ملا ہیبت اللہ کا وہ سفر شروع ہوا جس نے انہیں مذہب کے لبادے میں ''مطلق العنان بادشاہت'' کی راہ دکھائی۔ القاعدہ اور ہیبت اللہ دونوں ہی ایک دوسرے کے بارے میں محتاط تھے لیکن بار بار ملاقاتوں اور ہیبت اللہ کو درست وقت پر درست مشورہ دینے کے بے لوث عمل نے ہیبت اللہ کا اعتماد بحال کیا اور 2023 کے آخر میں سیف العدل سے ملاقات کی جبکہ اس کے ایک ماہ بعد حمزہ بن لادن بھی ملاقات کے لئے آئے۔

## پہلا قدم

القاعدہ کی مضبوط حمایت اور مشاورت مل جانے کے بعد ہیبت اللہ نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی خاطر قدم آگے بڑھانے اور 18 مئی 2024 کو کابل جا پہنچے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک ملا ہیبت اللہ خلوص نیت سے صرف معاملات کو کنٹرول کرنے کی کوشش میں تھے، انہیں باور کروایا گیا کہ بڑھتی ہوئی گروہ بندی، بداعتمادی اور تقسیم کو کنٹرول کرنے کی خاطر انہیں گوشہ عافیت سے نکلنا ہوگا اور معاملات سنبھالنے کے لیے متحرک ہونا پڑے گا۔

ہیبت اللہ کا یہ اپنے اقتدار کو سنبھالنے کی خاطر پہلا بڑا قدم تھا جس کے بارے میں کئی طرح کی باتیں سامنے

آئیں لیکن اس کے بعد اقتدار پر اپنی شخصی گرفت مکمل کر لینے تک جس طرح سے انہوں نے ایک ایک قدم ناپ تول کر رکھا، اس کا جائزہ لیا جائے تو یہ ایک ایسی حکمت عملی دکھائی دیتی ہے جس کا ایک ایک قدم سوچا سمجھا اور طے شدہ تھا، جس میں ممکنہ ردعمل کو کاؤنٹر کرتے ہوئے مرحلہ وار اپنی گرفت مستحکم کرنے کا پورا منصوبہ دکھائی دیتا ہے، جس میں سب کے مفادات کو نقصان پہنچا لیکن کوئی چوں تک نہ کر سکا۔ اس قدر منظم پیش رفت مدرسے کے اس کم گو بلکہ مردم بیزار استاد کی نہیں ہو سکتی جو ابھی چند ماہ قبل ملک بھر میں پھیلی انارکی اور چھینا جھپٹی کو ختم کرنے کے لئے کوئی راستہ نہیں پا رہا تھا۔ اس سب کے پیچھے القاعدہ کے شاطر دماغ بیٹھے ہوئے تھے، جنہوں نے پہلے دو سال تک ہیبت اللہ کی پالیسیوں اور شخصیت کا مطالعہ کیا، طالبان میں اپنے دوستوں کو منظم اور غیر محسوس انداز میں اچھے عہدوں پر پہنچایا اور جب ملا ہیبت اللہ حالات کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہو گیا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک ایسے اقتدار کا راستہ دکھایا جس میں اسے شوریٰ اور کابینہ جیسے جھنجھٹ سے کامل آزادی دلوا کر بادشاہ بنا دیا گیا۔

ہیبت اللہ کی یہ پہلی رونمائی ایک ڈرامائی اقدام تھا، انہوں نے جمعہ کی نماز قندھار میں پڑھائی اور ہفتے کی شام بغیر کسی پیشگی شیڈول کے اپنی سیکیورٹی اور ملا شیرین کے ہمراہ کابل پہنچ گئے، جہاں انہوں نے ''ارگ'' (صدارتی محل) میں قیام کیا۔ ابتدائی دو دن انفرادی ملاقاتیں کیں اور منگل کو ملک بھر سے بلائے گئے منتخب علماء سے تفصیلی نشست کی۔ ان علماء کو سرکاری نظام کے بجائے ایک غیر رسمی رابطہ نیٹ ورک کے ذریعے بلایا گیا۔ اس سارے عمل کی خاص بات یہ تھی کہ کسی حکومتی اہلکار کو پیشگی اطلاع نہ تھی۔ یہ تمام بندوبست حکومت سے قبل جنگ کے دوران اختیار کردہ خصوصی تنظیمی مواصلاتی ذرائع سے کیا گیا۔ ان علماء میں طالبان کی مرکزی قیادت یا شوریٰ کے اراکین شامل نہیں تھے۔ یہ ملاقات عصر کی نماز کے بعد شروع ہوئی، علماء نے وہیں کھانا کھایا اور گفتگو رات گئے تک جاری رہی۔ کسی وزیر، افسر یا حتیٰ کہ صدارتی عملے کو بھی اس میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ حیرت انگیز طور پر وزیر داخلہ اور حقانی گروہ کے سربراہ ملا سراج الدین حقانی جو زیادہ وقت اپنے گھر خوست میں گزارتے تھے، وہ اچانک بدھ کے روز کابل پہنچے۔ پہلی بار شہر کی سیکیورٹی کا جائزہ لیا اور ہدایات جاری کیں۔

جمعرات کو وہ فجر سے پہلے "ارگ" (صدارتی محل) پہنچے، جہاں 24 گھنٹے کے نوٹس پر بلائی گئی گورنروں اور پولیس سربراہان کی میٹنگ فجر کے بعد منعقد ہوئی۔ اس اجلاس میں ملا سراج واحد وزیر تھے جو شریک

ہوئے اوران کی شرکت وزیر داخلہ کے بجائے نائب امیر کی حیثیت سے تھی۔ نائب وزیر داخلہ ملا ابراہیم اس میٹنگ میں شامل نہیں تھے اور نہ ہی کسی دوسرے وزیر کو بلایا گیا حالانکہ کابل میں اس وقت تقریباً 15 اہم رہنما موجود تھے جن میں ملا حسن اخوند، ملا کبیر، ملا یعقوب، ملا خیر اللہ خیر خواہ اور ملا برادر شامل تھے۔ اس سے یہ تاثر لیا گیا کہ شاید قندھاریوں میں گھرے ملا ہیبت اللہ حقانیوں سے ہاتھ ملانا چاہتے ہیں لیکن بعد میں ثابت ہوا کہ اصل قصہ یہ تھا کہ چونکہ یہ مشورہ القاعدہ کا تھا لہذا سراج حقانی کو اسی لئے اس موقع پر ساتھ لیا گیا لیکن ہیبت اللہ کے قریبی حلقوں کے بقول وہ قندھاریوں کو میسیج دینا چاہتے تھے کہ اگر وہ اس کا ساتھ نہیں دیں گے تو وہ ان کے مخالف سے ہاتھ ملاتے دیر نہیں لگائے گا، بعد کے اقدامات نے ثابت کیا کہ قندھاریوں نے یہ پیغام درست طور پر سمجھا اور ہیبت اللہ کی مطلق العنانیت میں اس کا ساتھ دیا اور اس کے ذریعہ سے اپنے مفادات پورے کئے۔

ملا ہیبت اللہ کا یہ سفر ایک غیر متوقع پیش رفت تھی جس نے سب کو چونکا کر رکھ دیا کیونکہ اس سے پہلے ملا ہیبت اللہ خود کو قندھار تک محدود رکھے ہوئے تھے حتیٰ کہ سراج حقانی جیسے رہنما بھی ان سے ملاقات کے لیے قندھار گروپ بلکہ یوسف وفا کی اجازت کے محتاج تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری فصیح الدین فطرت کو ایک ہفتہ انتظار کے باوجود ملاقات نہ مل سکی۔ ملا ہیبت اللہ تک تمام رسائی قندھار گروہ کے کنٹرول میں تھی اور ملا یوسف وفا کی اجازت کے بغیر کوئی ان تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس محدود رسانی نے طالبان کے اندر گروہ بندی کو جنم دیا جس کے نتیجے میں شمالی افغانستان میں بغاوت جیسے حالات پیدا ہوئے جبکہ ننگرہار اور ہرات میں احتجاج بھی سامنے آئے۔ اس غیر متوقع دورہ کابل کے بعد ملا ہیبت اللہ کی اتھارٹی جس کا پہلے وجود ہی نہ تھا، وہ محسوس کی جانے لگی۔

## دوسرا قدم:

دوسرا قدم انہوں نے ٹھیک دو مہینے بعد 18 جولائی کو اٹھایا اور کابل پہنچ کر ارگ میں سکیورٹی سیٹ اپ کا اجلاس بلالیا، جس میں وزیر دفاع ملا محمد یعقوب، وزیر داخلہ سراج الدین حقانی اور انٹیلی جنس چیف ملا عبدالحق واثق شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں انہوں نے ملک کے سکیورٹی سیٹ اپ کا کنٹرول مکمل طور پر خود سنبھال لیا۔ حکم جاری کر دیا وزارت دفاع، وزارت داخلہ اور انٹیلی جنس حکام براہ راست ملا ہیبت اللہ کے سامنے جوابدہ ہوں گے، سکیورٹی سیٹ اپ کی میٹنگز بلانے کا اختیار بھی وزیر اعظم سے لے لیا گیا ہے۔

اس اجلاس کے صرف ایک ہفتے بعد ایک نیا حکم نامہ جاری کیا گیا جس میں وزرا کو بھی سائیڈ لائن کر دیا اور حکم جاری کر دیا کہ ان تینوں سیکیورٹی سے متعلق وزارتوں میں تقرر و تبادلے سے لے کر ہر فیصلہ اور ہر معاملہ ملا ہیبت اللہ کے قندھار سیکریٹریٹ کو منتقل کر دیا گیا۔ اس حکم نامے کے مطابق اہلکاروں کو اسلحہ جاری کرنے کا اختیار بھی وزیر سے لے لیا گیا، تمام افسران کو احکامات کے لئے قندھار سیکریٹریٹ سے رجوع کرنے کا حکم بھی اسی حکم نامے میں شامل تھا یعنی جن سے ردِعمل کا خطرہ تھا، اس پورے سسٹم کو ہی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ 18 جولائی کا اجلاس وزیر اعظم کی اس شکایت کے جواب میں بلایا گیا تھا کہ وزیرِ داخلہ اور وزیرِ دفاع وزیر اعظم کی جانب سے بلائے گئے اجلاسوں میں شریک نہیں ہوتے اور اس کے احکامات کو نظر انداز کرتے ہیں یعنی وزیر اعظم اپنی رٹ منوانا چاہتے تھے، جواب میں سب کچھ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

## تیسرا قدم

اسی ماہ ایک اور حکم نامہ سامنے آیا، یہ حکم نامہ دراصل اقتدار اور اختیار کے تسلط کو مکمل کرنے کی خاطر تھا، سیکیورٹی کے بعد معیشت کو بھی اپنے کنٹرول میں لے لیا گیا۔ اس حکم نامے کے تحت ملا ہیبت اللہ اخوندزادہ نے افغانستان کے مالی امور پر براہِ راست کنٹرول حاصل کر لیا۔ تمام مالی اختیارات قندھار سیکریٹریٹ منتقل کر دیئے گئے۔ وزارتِ خزانہ کو عملاً پسِ پشت ڈال دیا گیا اور فیصلہ سازی کو اپنے ہاتھ میں مرکوز کر لیا۔ قندھار سیکریٹریٹ میں ایک مالیات کا دفتر قائم کیا گیا، جہاں سے قومی بجٹ اور آمدنی کی نگرانی شروع کر دی گئی۔ وہ دن اور آج کا دن وزیرِ خزانہ کو کسی رسمی اجلاس میں مدعو تک نہیں کیا گیا۔ وزارت نے حالیہ عرصے میں صرف کسٹمز اور محدود نوعیت کے منصوبوں کی معمولی معلومات جاری کی ہیں جبکہ قومی آمدنی اور بجٹ کی تفصیلات منظرِ عام پر نہیں آئیں، نہ ہی کبھی سالانہ قومی بجٹ جاری کیا گیا۔ تمام چھوٹے بڑے مالی فیصلے اب قندھار سے کیے جا رہے ہیں جس سے طاقت کا ارتکاز بڑھا اور طالبان کے اندرونی اختلافات میں اضافہ ہوا۔

## استبدادِ مکمل

بات صرف سیکیورٹی اور خزانے تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ 26 اکتوبر کو ایک تفصیلی فرمان جاری کیا گیا جس

میں وزارتِ خارجہ، داخلہ، دفاع، انٹیلی جنس اور معدنیات سمیت میں تمام وزارتوں کے ہر طرح کے اختیارات قندھار سیکرٹریٹ کو منتقل کر دیئے گئے۔ وزارتِ داخلہ، دفاع اور انٹیلی جنس کے پاس صرف اسلحہ اور گولہ بارود کے ڈپوؤں کی دیکھ بھال رہ گئی تھی، اس حکم نامے میں یہ بھی قندھار ہیبت اللہ کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ حکم نامے میں کہا گیا کہ کسی وزارت کا حکم اس حوالے سے قابلِ عمل نہیں ہوگا۔ اسی حکم نامے کے تحت کسی بھی وزارت میں بڑے پیمانے کی خرید و فروخت، دفتری امور، اثاثہ جات کا ریکارڈ، اور کسی بھی سطح کے تبادلے اور تقرریاں بھی اب وزرا کے بجائے براہِ راست ملا ہیبت اللہ کے دفتر سے منظور ہوں گی۔ اسی حکم نامے کے تحت تمام وزرا اور محکموں کو پابند کر دیا گیا کہ وہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ملا ہیبت اللہ سیکرٹریٹ سے تحریری اجازت لیں گے، کسی بھی وزیر یا افسر کو کسی بھی خریداری، تقرر و تبادلہ اور کسی بھی معاہدے سے پہلے ہیبت اللہ سیکرٹریٹ سے تحریری پیشگی اجازت لینا ہوگی۔ ایک شق کے مطابق کسی بھی سرکاری ملاقات میں ہیبت اللہ سیکرٹریٹ کے نمائندے کی موجودگی لازم ہوگی، غیر ملکیوں کے معاملہ میں کسی نجی ملاقات میں بھی ہیبت اللہ سیکرٹریٹ سے پیشگی منظوری اور نمائندگی لازم کر دی گئی۔

چوتھا حکم نامہ 3 دسمبر 2024 کو جاری کیا گیا، جس کے تحت ملا ہیبت اللہ نے تمام سرکاری اہلکاروں، بشمول GDI، وزارت داخلہ اور وزارت خارجہ کے افسران کو بغیر پیشگی اجازت بیرون ملک سفر سے روک دیا۔ الزام یہ لگایا گیا کہ بعض افراد بیرون ملک جا کر افغانستان کے دشمن خفیہ اداروں سے رابطے رکھتے ہیں، خصوصاً دبئی جا کر رقم اور ہدایات وصول کرتے ہیں۔

## ہیبت اللہ کی ذاتی فورس

2023 کے آغاز میں ملا ہیبت اللہ نے ایرانی پاسداران انقلاب کے طرز پر ایک ذاتی فورس بنانے کی خواہش ظاہر کی، جسے کئی ماہ تک زیرالتوا رکھنے کے بعد شوریٰ نے طویل مشاورت کے بعد اکتوبر میں منظور کیا۔ اس مقصد کے لیے اس وقت کے گورنر ہلمند اور القاعدہ کی شوریٰ کے رکن ملا عبدالاحد طالب کو ذمہ داری سونپ دی گئی۔ ابتدائی طور پر 400 ملین افغانی فنڈ بھی مختص کیا گیا۔ تاہم داخلی اختلافات کے باعث یہ منصوبہ تعطل کا شکار رہا کیونکہ حقانی اور قندھاری گروپ نہیں چاہتے تھے کہ ملا ہیبت اللہ غیر معمولی طاقت حاصل کریں۔ جون 2024 میں شوریٰ میں معاملہ پھر زیر بحث آیا، شوریٰ نے پھر چکر بازی کی اور ملا ہیبت اللہ کا ذاتی فورس کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

اکتوبر 2024 میں تمام وزارتوں کے اختیارات اپنے ذات میں منتقل کر لینے اور منوا لینے کے بعد ملا ہیبت اللہ کو ذاتی فورس کی منظوری کے لئے شوریٰ کی ضرورت ہی نہیں رہی لہٰذا انہوں نے دسمبر 2024 میں ایک حکم نامہ جاری کیا اور بدری فورس جسے بعد میں البدر کور 313 کا سرکاری نام دیا گیا تھا، اسے امیر المومنین کی فورس قرار دے دیا اور اس کا مکمل اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا، اب یہ ایک خصوصی فورس ہے جو براہ راست ملا ہیبت اللہ کو جواب دہ ہے اور پورے ملک میں کسی بھی نوعیت کا آپریشن کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ اسی حکم نامے کی دوسری شق کے تحت ملک کے تمام ہوائی اڈوں، سرحدی راستوں، ملک بھر کی تمام اہم تنصیبات کابل اور قندھار کی سکیورٹی بھی اسی فورس کو سونپ دی گئی۔

ملا ہیبت اللہ نے اس فورس کے ذریعے عملی طور پر ملک کا سب سے بڑا عسکری اثاثہ اپنے ہاتھ میں لے کر نہ صرف اپنی رٹ مضبوط کر لی بلکہ اقتدار پر اپنا تسلط مکمل کر لیا۔ اس فورس کا پہلا ملا عبدالاحد طالب کو مقرر کیا گیا جو براہ راست ملا ہیبت اللہ کو رپورٹ کرتے تھے، ان کے نائب کے طور پر عبدالحفیظ حافظ کو مقرر کیا گیا، بعد میں ملا طالب کو قندھار کا پولیس چیف لگا دیا گیا اور کور کی کمان بھی ہیبت اللہ سیکرٹریٹ کے سپرد کر دی گئی۔ اس کا پہلا ہیڈ کوارٹرز بگرام میں تھا بعد میں قندھار منتقل کر دیا گیا، کابل کی ملٹری اکیڈمی بھی اسی کے کنٹرول میں ہے۔ البدر فورس پاسداران انقلاب کی طرز پر ایک خود مختار فورس ہے جس کا اپنا انٹیلی جنس سسٹم ہے، ہیبت اللہ کے حکم پر گرفتاریوں، تفتیش سمیت ہر طرح کے اختیارات حاصل ہیں۔ ملک کے تمام اسلحہ ڈپو بھی اسی کور کے کنٹرول میں ہیں، جہاں سے کوئی ادارہ اس کی منظوری کے بغیر اسلحہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس فورس کی تعداد 40 ہزار سے زائد ہے اور اسے مالی خود مختاری بھی حاصل ہے، جس کا بجٹ 60 ارب افغانی بتایا جاتا ہے۔

بدری فورس کا قصہ یہ ہے کہ امریکہ کے خلاف جنگ کے دوران حقانیوں نے قائم کیا تھا، امریکی اسے ریڈ یونٹ، ڈیتھ سکواڈ اور اس طرح کے ناموں سے پکارتے تھے، اسے طالبان کی سب سے خطرناک فورس کہا جاتا تھا۔ ہیبت اللہ نے اس کا کنٹرول سنبھالنے کے بعد اس کے کمانڈ سسٹم میں سے حقانی گروپ کے بااثر افراد کو چن چن کر نکالا اور اپنے وفاداروں کو ان کی جگہ بھرتی کیا، جس سے سراج حقانی کی ناراضی بڑھی۔ اس کا سب سے قیمتی اثاثہ اور سب سے خطرناک فورس جو مخالفین کے لئے مسئلہ بن سکتی تھی، وہ ہیبت اللہ نے اتنی صفائی سے ہتھیا لی کہ وہ گلہ بھی نہ کر سکا۔ مستقبل میں اس فورس کو مزید مضبوط کر کے اس میں انٹیلی جنس،

تحقیقاتی اور قانونی شعبے قائم کرنے کی منصوبہ بندی کی جارہی ہے۔

## ہیبت اللہ کی بادشاہت

افغانستان میں ملا ہیبت اللہ اخوندزادہ کی قیادت میں قائم موجودہ رجیم کو اگر اس کے عملی خدوخال کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ تیزی سے ایک ایسے مرحلے تک پہنچ چکا ہے جہاں اسے روایتی ریاستی ڈھانچے کے بجائے ایک مکمل شخصی استبداد کہنا زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ سیکورٹی سیٹ، مالیات، اختیارات اور اپنی ذاتی فورس قائم کرنے کے بعد ملا ہیبت اللہ کی بادشاہت اور شخصی حکومت کا ماڈل عملاً مکمل ہو چکا ہے۔ یہ نظام نہ آج کی کسی جدید ریاست کے ماڈل سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ ہی اس شریعتی ماڈل سے جس کا دعویٰ طالبان قیادت کرتی ہے بلکہ اس کی ساخت ایک ایسے محدود حلقے کی حکمرانی سے مشابہ نظر آتی ہے جہاں طاقت اور فیصلہ سازی ایک فرد کے گرد سمٹ جاتی ہے۔

سب سے پہلے سیکیورٹی کے ڈھانچے کو دیکھنا ضروری ہے۔ کسی بھی ریاست میں سیکیورٹی ادارے قومی مفاد، آئینی حدود اور واضح کمانڈ اسٹرکچر کے تحت کام کرتے ہیں، لیکن یہاں صورتحال مختلف ہے۔ مختلف یونٹس اور فورسز کی وفاداری اداروں کے بجائے براہِ راست قیادت کے ساتھ جڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اپنی ذاتی فورس کا قیام اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اقتدار کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک متوازی طاقت کا مرکز بھی تشکیل دیا گیا ہے جو ریاستی اداروں سے بالاتر ہو کر کام کرتا ہے۔ یہ طرزِ عمل جدید ریاستی اصولوں کے برعکس ہے جہاں طاقت کی تقسیم اور ادارہ جاتی توازن کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہاں طاقت کا مکمل ارتکاز فردِ واحد کی مرضی کے تابع کر دیا گیا ہے اور وہ فردِ واحد کسی کو جواب دہ نہیں۔

ایسا ہی معاملہ مالیاتی نظام میں ہے کہ جہاں فردِ واحد ہی حرفِ آخر ہے، جو معاشیات کی الف بے سے بھی آشنا نہیں۔ ریاستی وسائل، محصولات اور معدنیات پر کنٹرول ایک ایسے شخص کے کنٹرول میں دے دینا جو کسی کو جواب دہ ہی نہیں اور نہ ہی شفاف احتساب کا کوئی قابلِ ذکر نظام موجود ہے۔ مالیات کا یہ ارتکاز کسی بھی ریاست میں عدم توازن پیدا کرتا ہے کیونکہ وسائل کی تقسیم فردِ واحد کے تابع ہونا کسی صورت بھی قبول نہیں کیا جا سکتا، دنیا کا کوئی بھی نظام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی روایت میں بیت المال کو عوامی امانت سمجھا جاتا ہے لیکن جب اس پر بھی فردِ واحد کا اثر غالب ہو جائے تو اس تصور کی روح متاثر ہوتی ہے۔ اختیارات کی سطح پر بھی یہی تصویر سامنے آتی ہے۔ کابینہ اور دیگر حکومتی ادارے بظاہر موجود ضرور ہیں مگر ان

کی حیثیت ثانوی اور محدود ہے۔ جدید دور کی بادشاہتوں میں بھی شوریٰ، کابینہ اور مشاورت کو کسی نہ کسی درجے میں برقرار رکھا جاتا ہے تاکہ فیصلہ سازی میں توازن قائم رہے لیکن یہاں ایسا کوئی تکلف باقی نہیں رہنے دیا گیا۔ پالیسی سازی کا مرکز ایک فرد ہے اور باقی تمام ادارے اسی کے فیصلوں پر عملدرآمد تک محدود دکھائی دیتے ہیں۔ یوں ریاستی ڈھانچہ اداروں کے بجائے شخصیت کے گرد گھومنے لگتا ہے۔

افغانستان کے تاریخی اور سماجی تناظر میں اگر اس نظام کو پرکھا جائے تو تضاد اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ قدیم پشتون بادشاہتوں میں بھی بادشاہ اپنے اختیارات جرگے کے تحت استعمال کرتا تھا۔ جرگہ نہ صرف ایک مشاورتی فورم تھا بلکہ اس میں ملک کی مختلف لسانی اور جغرافیائی اکائیوں کی نمائندگی شامل ہوتی تھی۔ اس روایت کا مقصد طاقت کو متوازن رکھنا اور مختلف طبقات کی آواز کو شامل کرنا تھا، لیکن موجودہ نظام میں ایسا کوئی مؤثر بندوبست نظر نہیں آتا۔ نہ تو کوئی نمائندہ جرگہ موجود ہے اور نہ ہی فیصلہ سازی میں مختلف قومیتوں کی حقیقی شرکت، فردِ واحد کی سوچ پر منحصر ہے، جو چاہے کر گزرے۔

افغانستان ایک کثیر نسلی معاشرہ ہے جہاں پشتونوں کی تعداد صرف 42 فیصد ہے، 27٪ تاجک، 9٪ ہزارہ، 9٪ ازبک، اور باقی بلوچ، ترکمان اور دیگر قومیتیں شامل ہیں لیکن طالبان کے حکومتی ڈھانچے میں پشتون ہی نہیں صرف قندھار کا حصہ 80 فیصد سے زیادہ ہے، دیگر قومیتیں اگر کسی عہدہ پر ہیں بھی تو صرف بے اختیار نمائندگی کے طور پر۔ ہیبت اللہ کی بے اختیار کابینہ میں بھی نوے فیصد سے زیادہ پشتون شامل ہیں اور ان میں بھی قندھار سے تعلق رکھنے والوں کی نمایاں اکثریت ہے۔ یوں پورا ملک عملاً قندھار اور ایک محدود قیادت کی ذاتی پسند و ناپسند کے تابع ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ صورتحال قومی سطح پر توازن کے بجائے عدم شمولیت کا احساس پیدا کرتی ہے جو کسی بھی ریاست کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

## شریعت کو ذاتی تسلط کے لئے استعمال کرنے کی سازش

شریعت کے حوالے سے کیے جانے والے دعووں کو اگر عملی صورت حال کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو ایک اور بڑا تضاد سامنے آتا ہے۔ شریعت کی بنیاد شوریٰ، عدل اور اجتماعی مشاورت پر رکھی گئی ہے۔ خود حضرت محمد ﷺ نے اہم معاملات میں صحابہ سے مشورہ کیا اور قرآن میں بھی اجتماعی مشاورت کی تاکید کی گئی ہے۔ اسی طرح خلفائے راشدین رضوان اللہ اجمعین کے ادوار میں بھی حکمرانوں کو جوابدہ سمجھا جاتا تھا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ جیسے جلیل القدر خلفاء اپنے ناقدین کے

سوالات کا جواب دینا اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اور اختلافِ رائے کو برداشت کیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس اگر ایسے قوانین سامنے آئیں جن میں نہ مشاورت ہو، نہ منظوری کا کوئی اجتماعی عمل اور نہ ہی ان پر تنقید کی گنجائش باقی رکھی جائے، تو یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا یہ واقعی اسی شریعت کے اصولوں کے مطابق ہیں جس کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔

جنوری 2026 میں شریعت کے نام پر ایک ایسا قانون جاری کیا گیا جس کی نہ کسی وسیع مشاورت سے منظوری لی گئی اور نہ ہی اسے کسی نمائندہ فورم کے سامنے پیش کیا گیا۔ شریعت کے نام پر مسلط کردہ یہ نام نہاد قانونِ ذات خود شریعت سے بغاوت اور شخصی استبداد کو قائم رکھنے کا ایک آلہ دکھائی دیتا ہے جس میں ہیبت اللہ اور اس کے نمائندوں پر تنقید بھی جرم ہے اور مخالفت پر سزائے موت کا اعلان کیا گیا ہے، یہ نہ صرف جدید ریاستی اصولوں بلکہ اسلامی سیاسی فکر کے بنیادی تقاضوں سے بھی متصادم نظر آتا ہے۔

شریعت کے نام پر جاری کردہ اس توہین آمیز اور شریعت سے بغاوت پر مشتمل دستاویز میں شرمناک حرکت یہ کی گئی ہے کہ انصاف کی فراہمی کے حوالے سے معاشرے کو چار طبقات میں تقسیم کر دیا گیا ہے ،اس قانون کے مطابق تعزیر یعنی سزا کے معاملہ میں چار طبقات ہوں گے۔

اول۔۔علما، انہیں سزا نہیں دی جائے گی، بلکہ انہیں قاضی صرف سمجھائے گا۔

دوم۔۔اشراف یعنی تاجر اور قبائلی مشران۔ انہیں بھی سزا نہیں دی جائے گی، بلکہ صرف تنبیہ کی جائے گی۔

سوم۔۔متوسط، یعنی مڈل کلاس انہیں قید اور جرمانے کی سزا دی جائے گی۔

چہارم۔۔ عام آدمی، اسے قید، جرمانہ اور تشدد کی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔

شرمناک بات یہ ہے کہ اس ہندوانہ تقسیم کو شریعت کا نام دیا گیا ہے۔

ان تمام عوامل کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو ایک واضح تصویر سامنے آتی ہے۔ سیکیورٹی، مالیات، اختیارات اور قانون سازی سب ایک مرکز کے گرد گھوم رہے ہیں۔ ادارہ جاتی توازن، نمائندگی، مشاورت اور احتساب جیسے عناصر عملاً موجود نہیں۔ یہ ایک شخصی استبداد اور مطلق العنان بادشاہت تو ہو سکتی ہے، اسلامی امارت ہرگز نہیں۔ حتمی تجزیے میں یہ کہنا مشکل نہیں کہ یہ نظام کسی واضح اور متوازن طرزِ حکومت کے بجائے ایک مکمل طور پر استبدادی ڈھانچے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ نہ یہ جدید ریاستی اصولوں سے ہم آہنگ ہے، نہ قدیم بادشاہتوں کی روایت سے اور نہ ہی اس اسلامی تصورِ حکومت سے جس کی بنیاد شوریٰ، عدل اور

جوابدہی پر رکھی گئی تھی۔ ایسے میں اسے ایک باقاعدہ ریاستی ماڈل کے بجائے ایک شخصی اقتدار کا نظام کہنا زیادہ قرینِ حقیقت محسوس ہوتا ہے۔

## قندھار میں ہیبت اللہ کا شاہی پروٹوکول

قندھار ایک تاریخی اور تہذیبی ورثہ رکھنے والا شہر ہے، جس نے صدیوں سے بادشاہوں کا چلن دیکھ رکھا ہے، اس شہر نے ملا عمر جیسے درویش کا دورِ حکومت بھی دیکھ رکھا ہے، جو جھونپڑے میں بیٹھتا، عوام کے درمیان رہتا ،اب اسی مسند پر ہیبت اللہ کو بھی بچشم حیرت دیکھ رہا ہے، جس کے شاہانہ ٹھاٹھ آج کیا تاریخ میں کسی بادشاہ نے نہ دیکھے ہوں گے۔ ہیبت اللہ اس قدر ہیبت زدہ ہیں کہ ان کی سکیورٹی کے لئے قندھار میں 7 ہزار کا لشکر فروکش ہے، جب وہ سڑک پر نکلنے کی زحمت کبھی کرلیں تو 87 بلٹ پروف گاڑیوں کا قافلہ اور 7 ہزار کمانڈوز کا ٹڈی دل ساتھ لے کر نکلتے ہیں، موصوف زیادہ وقت عین و مینہ کے محل میں گزارتے ہیں جس پر اقتدار میں آتے ہی قبضہ کرلیا تھا۔ لیکن ان کی سکیورٹی پورے شہر کو عذاب میں ڈالے رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ جہاں جانا ہو، وہاں دو ہفتے قبل انتظام سنبھال لیا جاتا ہے۔ آس پاس کے علاقوں میں نقل و حرکت پر نئی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ محل کے قریب متعدد رہائشی گھروں کو انخلاء کے احکامات جاری کیے گئے ہیں۔ ایک زمانے میں جہاں مقامی لوگ آسانی سے گزر سکتے تھے، اب محل تک رسائی شدید پابندیوں کا شکار ہے، یہاں تک کہ قندھار کے رہائشیوں کے لیے بھی۔

تاریخی طور پر یہ محل جنوبی افغانستان میں طاقت کی علامت رہا ہے۔ تازہ ترین سیکیورٹی لاک ڈاؤن نے قندھار کے کچھ حصوں میں روزمرہ زندگی کو بھی متاثر کیا ہے۔ ذرائع کے مطابق، طالبان انٹیلی جنس یونٹس نے آس پاس کے اضلاع میں گشت بڑھا دیا ہے۔ محل کے قریب سڑکیں، جن میں ڈینڈ اسکوائر سرائے جامعہ روٹ، شیرزئی سنٹر روڈ شامل ہے، عام شہریوں کے لیے بند کردی گئی ہیں۔

اس کے علاوہ قندھار اور اس کے آس پاس چار کلیدی کمپاؤنڈز کی نشاندہی کی ہے، جو ہیبت اللہ کے زیر استعمال ہیں۔ ماندِ گگ محل: قندھار کے وسط میں واقع تاریخی کمپلیکس، جہاں بھاری سکیورٹی ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ یہ آخوندزادہ اور سینئر طالبان عہدیداروں کے درمیان اہم میٹنگز کی میزبانی کرتا ہے۔ حالیہ مہینوں میں سکیورٹی میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ ایک اور نامعلوم کمپاؤنڈ شہر کے شمال مشرق میں، طالبان کے دوبارہ اقتدار میں آنے کے بعد تعمیر کیا گیا۔ متعدد محفوظ داخلے، واچ ٹاورز، امریکی ساخت کے فوجی

گاڑیاں اور کاشت شدہ زمین نظر آتی ہے، جو ظاہر کرتی ہے کہ یہ جگہ طویل قیام کے لیے بنائی گئی ہے۔ اٹل محل عینو مینا میں مرحوم کندھار پولیس چیف جنرل عبدالرزاق اچکزئی کا مہمان خانہ تھا۔ اب یہ آخوندزادہ کے حلقے کے استعمال میں ہے۔ 2023 سے اس علاقے میں سکیورٹی میں اضافہ ہوا ہے۔

کندھار گورنر آفس گرچہ زیادہ عوامی نوعیت کا ہے، تاہم یہ شہر کے سب سے محفوظ انتظامی عمارتوں میں سے ایک ہے اور کہا جاتا ہے کہ طالبان کے سب سے بڑے رہنما کبھی کبھار اس کا دورہ کرتے ہیں۔ انسانی انٹیلی جنس یا براہ راست بصری شواہد کی عدم موجودگی کی وجہ سے، تحقیق کاروں نے زور دیا کہ وہ کسی مخصوص مقام پر آخوندزادہ کے قیام کے وقت یا مدت کی تصدیق نہیں کر سکتے۔

رپورٹ طالبان رہنما کی حفاظت کے لیے ایک خصوصی سیکیورٹی فورس ''امیر المؤمنین خاص زوک (خصوصی دستہ) یہ ایلیٹ یونٹ کندھار پولیس چیف مولوی عبدالاحد طالب کے کمانڈ میں ہے۔ ان میں سے سب امریکی ساخت کی M4 رائفلوں سے لیس ہیں اور ٹویوٹا ہائی لکس اور لینڈ کروزر گاڑیوں کے قافلوں میں سفر کرتے ہیں۔ کم از کم ایک گاڑی اینٹی ایئر کرافٹ گنز سے لیس ہے جبکہ دیگر راکٹ لانچرز یا ماؤنٹڈ مشین گنز سے مسلح ہیں۔ دستہ شہری علاقوں میں فوری تعیناتی کے لیے موٹر سائیکلوں کا بھی استعمال کرتا ہے۔

بہت سے طالبان عہدیداروں کے برعکس جو باقاعدگی سے عوام کے سامنے آتے ہیں یا سرکاری میڈیا سے بات کرتے ہیں، اخوندزادہ نے تقریباً مکمل غائب رہنے کا انتخاب کیا ہے۔ وہ مذہبی حکم ناموں کے ذریعے حکمرانی کرتے ہیں، جو طالبان وزارتوں کے ذریعے تقسیم کیے جاتے ہیں۔

## غیر پشتون طالبان کی تذلیل

طالبان کا نسلی امتیاز ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ اگر ہم صرف فوجی پہلو دیکھیں تو طالبان کی فوج، پولیس اور انٹیلی جنس میں مختلف قومیتوں کی موجودگی کا تناسب واضح کر دیتا ہے کہ وہ نسلی توازن نہیں رکھتے اور یہ کوئی اتفاق نہیں۔ طالبان کسی تاجک، ہزارہ یا ازبک کو اپنے ساتھ کھڑا نہیں دیکھ سکتے جو ان کے نظام سے تنخواہ لے۔ امریکہ کے خلاف جنگ کے دوران طالبان شمال میں مارے مارے پھرتے تھے اور نان پشتون نوجوانوں کو اپنی صفوں میں لانے کی خاطر بڑی بڑی مراعات اور وعدے کئے جا رہے تھے لیکن جیسے ہی اقتدار سنبھالا، اب وہی ازبک اور تاجک طالبان ناپسندیدہ قرار پا گئے ہیں، انہیں سسٹم سے نکالنے کے نت نئے طریقے سوچے جاتے ہیں، ایک جانب شمال کے وسائل کی لوٹ مار جاری ہے تو دوسری جانب

طالبان کی تنظیم میں سے شمال والوں کا انخلا جاری ہے۔ اگرچہ طالبان کی اعلیٰ قیادت اور بڑے عہدوں پر 90 فیصد سے زیادہ افراد پشتون ہیں پھر بھی یہ گروہ اپنی صفوں میں موجود گنتی کے چند تاجک، ازبک اور ہزارہ کمانڈروں کو برداشت کرنے کو تیار نہیں۔

حال ہی میں طالبان فورسز نے تخار صوبے سے تعلق رکھنے والے ایک تاجک کمانڈر غلام حسین کو گرفتار کرلیا اور اسے کابل میں انٹیلی جنس کے ڈائریکٹوریٹ 40 منتقل کر دیا۔ اس کے ضلع رستاق میں کم از کم 6 قریبی ساتھیوں اور 350 سے زائد دہشت گردوں کو بھی غیر مسلح کر دیا گیا۔ اس گرفتاری کے بعد عوامی سطح پر شدید ردعمل سامنے آیا۔ اطلاعات کے مطابق 9 جولائی 2025 کو طالبان فورسز نے تخار کے ضلع چہ آب پر حملہ کیا اور تاجک کمانڈر حاجی غلام حسین کو ان کے چھ قریبی ساتھیوں سمیت گرفتار کرلیا۔ ذرائع کے مطابق غلام حسین کو پہلے قندوز میں 217 ویں عمری کور منتقل کیا گیا اور بعد ازاں کابل میں طالبان کی انٹیلی جنس کے ڈائریکٹوریٹ 40 میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کارروائی کے دوران تقریباً 350 دہشت گردوں کو بھی غیر مسلح کر دیا گیا۔ غلام حسین، جو "حسین جندی" کے نام سے بھی معروف ہیں، تخار کے ضلع چہ آب کے گاؤں ازنا سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ 2016 میں طالبان میں شامل ہوئے اور سابق حکومت کی افواج کے خلاف لڑائیوں میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی گرفتاری کے اگلے دن طالبان فورسز نے ان کے رشتہ داروں اور قریبی ساتھیوں کے گھروں کا محاصرہ کیا اور تلاشی لی۔

گزشتہ تین برسوں میں طالبان نے بارہا اپنی صفوں میں موجود غیر پشتون کمانڈروں کو گرفتار، غیر مسلح اور برطرف کیا ہے، جس سے اندرونی نسلی اور علاقائی کشیدگی میں اضافہ ہوا ہے اور بعض اوقات جھڑپوں کی صورت بھی اختیار کی ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی طالبان کمانڈرز نے نسلی امتیاز کی شکایات کرتے ہوئے تنظیم کی صفیں چھوڑ دی ہیں۔ تقریباً ڈھائی ماہ قبل تاجک کمانڈر عبدالحمید خراسانی نے بھی اسی بنیاد پر طالبان کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ پنجشیر سے تعلق رکھتے تھے اور طالبان کی بدری یونٹ میں کمانڈر رہ چکے تھے۔ انہوں نے بھی کھل کر طالبان کے اندر نسلی اور علاقائی امتیاز کی شکایت کی تھی۔

## طالبان اعلیٰ افسروں میں جھڑپیں

افغان طالبان کی صفوں میں پشتون اور غیر پشتون عناصر کے درمیان تقسیم اور کشیدگی زبانی اختلاف سے بڑھ کر مسلح تصادم کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ یہ واقعات کم نہیں ہیں۔ صورتحال کی سنگینی کو اکتوبر 2024

کے اس واقعہ کے تناظر میں بخوبی سمجھا جاسکتا ہے، جب اس اعلیٰ سطح کے افسروں میں یہ صورتحال ہے تو نیچے کیا ہو رہا ہے، اسے سمجھنا مشکل نہیں۔

کابل میں تعینات 313 بریگیڈ کے پشتون کمانڈر ملا امیر خان حقانی اور میدان شہر میں تعینات پانچویں سپلائی ڈویژن کے تاجک کمانڈر ملا رحیم اللہ کے درمیان گاڑیوں کی لوٹ مار کے تنازع پر گولیاں چل گئیں۔ بریگیڈ کمانڈر کو ڈویژن کمانڈر کی ذاتی گاڑیاں پسند تھیں، چھیننے کی کوشش میں جھگڑا ہوا، دونوں نے ایک دوسرے پر ہتھیار تان لیے۔ ڈویژن کمانڈر نے ملا امیر خان حقانی کو مارا پیٹا، جس کے بعد بریگیڈ کی دیگر فورسز نے پانچویں ڈویژن کا محاصرہ کرلیا۔ بریگیڈ کمانڈر کے حکم پر ملا رحیم کو باتھ روم میں بند کر دیا گیا اور پانچویں ڈویژن کی تمام گاڑیاں ضبط کر لی گئیں۔ اس توہین آمیز رویے کے خلاف ڈویژن کمانڈر ملا رحیم وزیر دفاع سے لے کر ہیبت اللہ سیکریٹریٹ تک شکایت کی مگر اسے یہ احساس دلایا گیا کہ اس نے ایک پشتون افسر کو انکار کر کے اچھا نہیں کیا، بالآخر ملا رحیم نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

طالبان قیادت نے اس واقعے کو چھپانے کی کوشش کی، ملا رحیم نے تمام اہم کمانڈروں کو ایک خط لکھ کر تفصیلات سے آگاہ کیا اور انصاف کا مطالبہ کیا جس پر اسے صوبہ کاپیسا میں اس کے گاؤں سے گرفتار کرلیا گیا، اس پر امارات اسلامیہ سے بغاوت اور بدنام کرنے کا الزام ہے۔

ایک اور زیادہ خطرناک واقعہ 15 اکتوبر 2025 کو افغانستان کے وسطی صوبے دایکندی میں پیش آیا، جہاں طالبان کے اندرونی تصادم کے نتیجے میں ضلعی گورنر سمیت 13 افراد ہلاک ہوگئے۔ قاہر ضلع سے تعلق رکھنے والے طالبان کے ایک سینئر رہنما، صداقت علی ہزارہ جو ہزارہ نسل سے تعلق رکھتے تھے، کو ضلعی گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ انہوں نے صوبائی پشتون گورنر کے توہین آمیز رویے کے خلاف بغاوت کر دی۔ صورتحال کو سنبھالنے کے بجائے دایکندی کے گورنر مولوی آصف فاروقی نے پشتون طالبان کا ایک دستہ صداقت علی کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجا، جس پر جھڑپ شروع ہوگئی۔ تقریباً آٹھ گھنٹے جاری رہنے والی لڑائی میں صداقت علی ہزارہ اور ان کے 13 ساتھی ہلاک ہوگئے جبکہ پشتون طالبان کے 4 اہلکار بھی مارے گئے اور 3 زخمی ہوئے۔ صداقت گروپ کے دیگر ساتھیوں نے دایکندی کے پہاڑوں میں روپوش ہوکر جان بچائی، اس وقت سے یہ لوگ پشتون طالبان پر حملے کرتے رہتے ہیں۔ پشتون اور غیر پشتون گروپوں کے درمیان اختلافات قندھار گروپ کے شمالی عناصر کے خلاف سخت رویے کی وجہ سے نمایاں ہوئے۔ ملا ہیبت اللہ کے

متحرک ہونے کے بعد خانہ جنگی میں کمی کی توقع کی جارہی تھی، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پشتون تعصب کو کمزور کرنے میں وہ بھی ناکام رہے ہیں۔

## شمال میں سونے کی کانوں پر قبضہ

افغانستان میں موجودہ حالات کا جائزہ لیا جائے تو ایک واضح اور مسلسل ابھرتا ہوا رجحان سامنے آتا ہے کہ ریاستی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے غیر پشتون علاقوں کے وسائل کی منظم انداز میں لوٹ مار کی جارہی ہے۔ یہ کنٹرول صرف انتظامی سطح تک محدود نہیں بلکہ سیکیورٹی، معدنیات، مقامی معیشت اور حتیٰ کہ آبادی کے سماجی ڈھانچے تک پھیل چکا ہے۔ اس پورے عمل میں ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ غیر پشتون علاقوں میں مقامی آبادیا ور حتیٰ کہ وہاں سے تعلق رکھنے والے طالبان اہلکاروں کو بھی بتدریج بے اختیار کیا جارہا ہے جبکہ ان کی جگہ مخصوص پشتون گروپوں، خصوصاً قندھار اور ہلمند سے تعلق رکھنے والے عناصر کو مسلط کیا جارہا ہے۔ دوسری جانب قندھار گروپ کے لیڈروں اور وزراء کو بھی کھلی چھٹی ہے کہ وہ بھی نان پشتون لوگوں کو لوٹنے میں مصروف ہیں، اس میں مصدقہ اطلاعات ہیں کہ افغان حکومت غیر سرکاری طور پر القاعدہ اور اس کے اتحادیوں کو بھی اس وسائل کی لوٹ مار میں شریک کر رکھا ہے، جس کا ایک پورا سسٹم ہے۔ اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ شمالی افغانستان میں سونے اور دیگر قیمتی دھاتوں کی کانوں پر پشتون خصوصاً قندھاریوں کے قبضے اور لوٹ مار میں ہیبت اللہ رجیم میں چینی شہریوں اور چینی کمپنیوں کو استعمال کیا جارہا ہے جس کی وجہ سے شمالی افغانستان کے صوبوں میں چین اور چینی شہریوں کے خلاف نفرت عروج پر پہنچ چکی ہے۔

## غیر پشتون علاقوں میں طاقت کی منتقلی

شمالی افغانستان، خصوصاً بدخشان، بغلان، تخار اور کندوز جیسے صوبے، تاریخی طور پر تاجک، ازبک اور دیگر غیر پشتون قومیتوں کے مراکز رہے ہیں لیکن حالیہ برسوں میں وہاں انتظامی عہدوں، سیکیورٹی ڈھانچے اور معاشی وسائل پر کنٹرول قندھاری پشتون طالبان کو منتقل کیا جارہا ہے۔ اس عمل میں مقامی طالبان کمانڈرز کو بھی یا تو ہٹایا جارہا ہے یا انہیں عملی طور پر غیر مؤثر بنا دیا گیا ہے۔ ان کی جگہ باہر سے لائے گئے افراد کو تعینات کیا جاتا ہے جن کی وفاداری مقامی آبادی کے بجائے بیعت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی صرف عہدوں کی حد تک نہیں بلکہ زمین پر طاقت کے توازن کو بھی تبدیل کر رہی ہے۔ سب سے اہم پہلو غیر

قانونی کان کنی ہے جو شمالی افغانستان میں استحصال کا بنیادی ذریعہ بن چکی ہے۔ سونے اور دیگر قیمتی معدنیات سے مالا مال علاقوں میں منظم انداز میں کانوں پر قندھاریوں کا قبضہ کروایا جا رہا ہے۔

بدخشان کے علاقوں وکادور، فورموراہ اور شہر بزرگ میں سونے کی کانوں پر قبضے کے متعدد واقعات سامنے آئے ہیں۔ یہاں مقامی ٹھیکیداروں اور کان کنوں کو ہٹا کر کانوں کا کنٹرول قندھاریوں کو دیا گیا۔ اس عمل میں مقامی مزاحمت بھی دیکھنے میں آئی جس کے نتیجے میں جھڑپیں اور جانی نقصان ہوا۔ تخار کے اضلاع سمتی، نورابہ، انجیر، حصار اور پنج درہ وادی میں بھی غیر قانونی کان کنی ایک بڑا مسئلہ بن چکی ہے۔ یہاں بھی مقامی آبادی کو نظر انداز کرتے ہوئے کانوں پر قبضہ کیا گیا اور وسائل کی تقسیم میں مقامی لوگوں کو شامل نہیں کیا گیا۔ کئی علاقوں کو سیکیورٹی زون قرار دے کر عام لوگوں کی رسائی محدود کر دی گئی۔

غزنی کے علاقوں زرکشان، بولو، لومن اور تمکی میں بھی اسی نوعیت کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ یہاں مقامی سطح پر کان کنی کے حقوق تبدیل کیے گئے اور وسائل پر کنٹرول قندھاری طالبان کے پاس چلا گیا۔ ژابل کے علاقے کندلایان میں بھی غیر قانونی کان کنی کی سرگرمیاں رپورٹ ہوئی ہیں، جہاں مقامی آبادی کو فیصلوں سے باہر رکھا گیا اور وسائل کا کنٹرول بیرونی عناصر کے حوالے کیا گیا۔ ان تمام علاقوں میں ایک مشترکہ طریقہ کار سامنے آتا ہے، علاقے کو سیکیورٹی کے نام پر بند کر دیا جاتا ہے، مقامی آبادی کو ہٹا کر رسائی محدود کی جاتی ہے، کانوں کا کنٹرول مخصوص گروپوں کو دیا جاتا ہے مقامی انتظامیہ اور متعلقہ سرکاری اداروں کو نظر انداز کیا جاتا ہے یہ ماڈل واضح طور پر ایک منظم پالیسی کی نشاندہی کرتا ہے جس کے تحت وسائل کو مرکز کے قریب سمجھے جانے والے گروپوں کے حوالے کیا جا رہا ہے۔

بدخشان اور تخار جیسے صوبوں میں سونے کی کان کنی سے حاصل ہونے والی آمدن لاکھوں ڈالر ہفتہ وار تک پہنچتی ہے لیکن اس کا فائدہ مقامی معیشت کو نہیں ملتا۔ اس کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی نقصان جیسے دریاؤں کی آلودگی اور زمین کی تباہی، مقامی لوگوں کی زندگی کو مزید مشکل بنا رہے ہیں۔

## اندرونی کشمکش اور تشدد

وسائل پر اس کنٹرول نے طالبان کے اندر بھی شدید کشمکش کو جنم دیا ہے۔ مقامی اور غیر مقامی گروپوں کے درمیان جھڑپیں اب معمول بنتی جا رہی ہیں۔ بدخشان میں سونے کی کانوں پر ہونے والی لڑائیاں اس کی واضح مثال ہیں، جہاں صرف چند ہفتوں میں درجنوں افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔

اس سلسلہ میں اب تک کا سب سے خطرناک تصادم بدخشان میں اکتوبر 2025 سامنے آیا، جہاں طالبان حکومت کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ سونے کی کانوں پر کنٹرول کے تنازع نے اب باقاعدہ مسلح بغاوت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ تاجک کمانڈر مولانا عبدالرحمن عمار نے طالبان فورسز کو "غاصب" قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف "جہاد" کا اعلان کر رکھا ہے اور شمالی افغانستان کو "آزاد کرانے" کا عزم ظاہر کیا ہے۔ مولانا عبدالرحمن عمار، جو نسلی طور پر تاجک ہیں، امریکہ کے خلاف جنگ کے دوران طالبان کے ساتھ رہے اور موجودہ طالبان آرمی چیف قاری فصیح الدین کے نائب کے طور پر بدخشان اور بلخ میں خدمات انجام دیتے رہے۔ اگست 2021 میں افغانستان پر طالبان کے قبضے کے دوران کابل پر حملہ کرنے والی فورس میں بھی وہ قاری فصیح الدین کے نائب تھے۔ بعد ازاں انہیں بلخ کے دارالحکومت مزار شریف کا پولیس چیف مقرر کیا گیا، تاہم 2024 میں غیر پشتون طالبان ارکان کو غیر مسلح کرنے کی مہم کے دوران انہیں بدخشان میں محکمہ معدنیات کا سربراہ بنا دیا گیا ستمبر 2025 کے اوائل میں انہیں اس عہدے سے اس وقت ہٹا دیا گیا جب انہوں نے مقامی سونے کی کانیں قندھار اور ہلمند سے تعلق رکھنے والے طالبان گروہوں کے حوالے کرنے سے انکار کیا۔

27 اور 28 اکتوبر کو شہرِ بزرگ کے علاقے میں کانوں کے کنٹرول پر ہونے والی جھڑپوں کے بعد 29 اکتوبر کو مولانا عبدالرحمن عمار نے فجر کی نماز کے بعد ایک مقامی مسجد میں طالبان حکومت کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا اور کہا کہ "طالبان غاصب ہیں، نسل پرست ہیں اور غیر پشتونوں کے دشمن ہیں۔ وہ ہمارے وسائل کو لوٹ رہے ہیں۔ شمال کو ان سے آزاد کرانے کی جدوجہد جاری رہے گی۔" اعلان کے بعد مولانا عمار شہرِ بزرگ کے پہاڑی علاقے میں منتقل ہو گئے، جہاں ان کے ساتھ بڑی تعداد میں مسلح افراد موجود تھے، جبکہ مجموعی طور پر ان کے مسلح حامیوں کی تعداد اس سے زیادہ تھی۔ طالبان کا مقامی غیر پشتون کمانڈر علیم الدین نصرت، آویزگاؤں کا کمانڈر قاری عمر حسیب اور یفتل ضلع کے دیگر غیر پشتون کمانڈرز اس کے ساتھ شامل ہو گئے اور یہ قوت بڑھتی جا رہی تھی کہ طالبان نے مولانا عمار کو مذاکرات کے لئے دھوکے سے بلایا اور دھوکے سے گرفتار کر لیا، وہ اس وقت کابل کی پل چرخی جیل میں ہیں۔

2021 میں طالبان کے اقتدار سنبھالنے کے بعد شمالی افغانستان میں یہ پہلی منظم بغاوت ہے، یہ بغاوت سونے کی کانوں پر ہونے والی ان لڑائیوں کا نتیجہ ہے جو 12 اکتوبر کو بدخشان کے ضلع یفتل کے گاؤں

''یلور'' سے اس وقت شروع ہوئیں جب جنوبی ہلمند سے تعلق رکھنے والے پشتون طالبان کے ایک دھڑے نے بدخشان کے متعصب پشتون گورنر اور صوبے کے چیف جسٹس کی حمایت سے ایک سونے کی کان پر قبضہ کر لیا۔ اس اقدام نے مقامی آبادی اور طالبان ارکان میں شدید غم وغصہ پیدا کیا جو اسے غیر پشتون علاقوں پر پشتون بالادستی کی ایک مثال قرار دے رہے ہیں۔ 12 سے 14 اکتوبر تک اس لڑائی میں کم از کم 14 افراد ہلاک ہوئے جن میں دونوں جانب کے کمانڈر بھی شامل تھے۔ بدخشان کے اس وقت کے گورنر مولوی محمد ایوب خالد نے قندھار سے مزید نفری طلب کر لی جس پر معاملات مزید خراب ہوئے۔ گورنر کی جانب سے فارسی بولنے والے طالبان کو ڈیوٹی پر نہ آنے پر ملازمت سے برخاست کر کے ''اسلامی امارت'' کے خلاف بغاوت اور امیر المومنین سے غداری کے الزام میں فوجی عدالت میں پیش کرنے کی دھمکی دی، جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور بے شمار لوگوں نے استعفے دے دیئے۔ مقامی طالبان کمانڈر مولوی امین اللہ واحد نے بغاوت کا اعلان کیا اسے گرفتار کر کے غائب کر دیا گیا، ردعمل میں مقامی سطح پر حالات بدستور خراب ہیں، طالبان وہاں سے آنے والی خبروں کو چھپا رہے ہیں لیکن حالات ان کے کنٹرول میں نہیں۔

بدخشان اور بلخ جیسے شمالی صوبوں میں مقامیوسائل پر کنٹرول کے معاملے پر پشتون اکثریتی طالبان قیادت کے خلاف ناراضی اور مزاحمت میں واضح اضافہ ہو رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں مسلح جھڑپوں کی شدت بھی بڑھ رہی ہے۔ تاہم یہ واقعہ اپنی نوعیت کا پہلا بڑا اور کھلا مسلح بغاوتی اقدام ہے جس میں طالبان کا ایک دھڑا مرکزی قیادت کے خلاف براہ راست میدان میں آیا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی اندرونی اختلافات اور فرار کی اطلاعات سامنے آتی رہی ہیں لیکن اتنے بڑے پیمانے پر اتنی منظم اور اعلانیہ بغاوت پہلی بار دیکھنے میں آئی ہے۔ تمام تر طاقت کے باوجود طالبان اس بغاوت کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے البتہ اس واقعہ نے پشتون وغیر پشتون طالبان دھڑوں کے درمیان خلیج گہری کر دی ہے جو مستقبل میں مزید عدم استحکام کا سبب بن سکتی ہے۔ ان اندرونی طالبان جھڑپوں اور پاک افغان کشیدگی کے بعد کچھ تبدیلیاں بھی کی گئیں جن کے تحت شمالی مخالف اور نسلی برتری کے حامل پشتون گورنر قاری ایوب خالد کو ہٹا کر مولوی اسماعیل کو نیا گورنر مقرر کیا گیا۔ مولوی اسماعیل کا تعلق بھی قندھار گروپ سے ہے اور وہ بھی متعصب قندھاری پشتون ہیں۔

## نسلی تعصب، غیر پشتونوں کے خلاف اقدامات

ملا ہیبت اللہ کے طالبان کی پالیسیوں میں پشتون خصوصاً قندھاریوں کے تسلط کو پالیسی کے طور پر نافذ کیا جا رہا ہے، تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو ہیبت اللہ کی پالیسی میں اسرائیل اور ہندوتوا کی پالیسیوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے جس طرح سے اسرائیل فلسطینیوں کو بے دخل کر کے یہودی آبادکاری بڑھا رہا ہے، کشمیر میں مودی کی ہندوتوا پالیسیوں کے تحت کشمیری مسلمانوں کا تناسب بدلنے کی سازش کی جا رہی ہے، اسی قسم کی پالیسیاں 2021 میں افغانستان پر طالبان کے کنٹرول کے بعد دکھائی دے رہی ہیں۔ افغان طالبان ایک پالیسی کے تحت غیر پشتون بلکہ غیر قندھاریوں کے خلاف اقدامات کر رہے ہیں۔ ایک جانب نان پشتون علاقوں میں پشتونوں کی جبری آبادکاری اور مقامی لوگوں کی بے دخلی کی مہم جاری ہے تو دوسری جانب فارسی زبان اور کلچر کو ختم کرنے کی سازش بلکہ فیصلے ٹھونسے جا رہے ہیں، تیسری جانب طالبان کی اپنی صفوں میں غیر پشتونوں کو نکالا جا رہا ہے، نسلی تعصب کے ساتھ ساتھ مذہبی تعصب بھی اسی شدت سے بروئے کار آ رہا ہے، اہل حدیث، اہل تشیع اور اسماعیلیوں کو نا صرف ریاستی امور سے بے دخل کیا جا رہا ہے بلکہ ان کی تعلیمات اور مذہبی آزادیاں تک دستیاب نہیں۔

طالبان نے اقتدار سنبھالنے کے بعد ایک ایسا نظام قائم کیا ہے جس میں عملی طاقت محدود حلقوں کے پاس ہے۔ ان کے مطابق اعلیٰ سطح کے فیصلے، وزارتیں، سیکیورٹی ادارے اور اہم انتظامی عہدے زیادہ تر پشتون قیادت، خاص طور پر قندھار اور ہلمند سے وابستہ گروپوں کے پاس مرکوز ہیں۔ اس صورتحال میں ازبک، تاجک اور دیگر غیر پشتون آبادی کو فیصلہ سازی کے عمل سے باہر رکھا گیا ہے۔ باصلاحیت اور بااثر افراد کو یا تو دھمکیوں کے ذریعے خاموش کرایا گیا یا ملک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں شمالی افغانستان میں عدم اطمینان بڑھا ہے۔ وہ ازبک جو طالبان کے ساتھ ماضی میں عسکری سطح پر شامل رہے، وہ بھی صرف نمائشی حیثیت رکھتے ہیں، طالبان کی فیصلہ سازی میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، ویسے بھی 28 رکنی کابینہ میں 23 پشتون وزراء شامل ہیں، جن میں سے 80 فیصد کا تعلق قندھار یا ہلمند سے ہے۔

صوبوں کے گورنروں کو دیکھا جائے تو کل 34 صوبوں میں سے گنتی کے تین یا چار لوگ ہوں گے جو نان پشتون ہوں گے، دیگر سب پشتونوں میں بھی وہی تناسب ہے کہ اکثریت قندھاری یا ہلمند کے قبائل کی ہے، ایسی ہی صورتحال پولیس اور انٹیلی جنس میں ہے۔ جون 2025 میں ایک عالمی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ

طالبان حکومت میں غیر پشتون اقوام کی نمائندگی انتہائی کم ہے۔ رپورٹ کے مطابق 137,1 اعلیٰ عہدیداروں میں سے صرف 87 تاجک، ازبک اور ہزارہ ہیں۔ اس تحقیق کے مطابق صرف 5 فیصد اعلیٰ عہدیدار تاجک، 3 فیصد ازبک اور تقریباً نصف فیصد ہزارہ ہیں۔ ان حالات میں فیصلہ سازی میں کردار کا سوال ہی کہاں رہ جاتا ہے، یہاں تو بقا کی جنگ درپیش ہے۔

مجموعی طور پر غیر پشتون آبادی کی شکایات ایک وسیع تر استحصال کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس میں نمائندگی، اختیارات کی تقسیم اور اعتماد کا بحران شامل ہے۔ یہ مسئلہ صرف ایک گروہ کا نہیں بلکہ افغانستان کے پورے سیاسی ڈھانچے کے مستقبل سے جڑا ہوا ہے۔ اگر شمولیت اور نمائندگی کے لیے کوئی قابلِ اعتماد نظام نہ بنایا گیا تو یہ اختلافات وقت کے ساتھ مزید گہرے ہو سکتے ہیں اور ریاستی استحکام کے لیے مستقل چیلنج بنتے رہیں گے۔

## جبری بے دخلی

افغانستان کے شمالی صوبوں میں حالیہ برسوں کے دوران زمین، آبادی اور نسلی تنازعات ایک بار پھر شدت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ شمالی افغانستان سے آنے والی رپورٹس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ طالبان کے بعض ہشت گردوں اور ان کے مقامی حامیوں پر ہزارہ، ازبک اور ترکمان برادریوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو ان کے گھروں اور زمینوں سے زبردستی بے دخل کرنے کے الزامات سامنے آئے ہیں۔ ان واقعات نے نہ صرف مقامی آبادی میں بے چینی پیدا کی ہے بلکہ افغانستان کے نازک نسلی توازن پر بھی سوالات اٹھا دیئے ہیں۔ مقامی افراد اور بعض متاثرہ خاندانوں کا کہنا ہے کہ شمالی افغانستان کے کئی دیہی علاقوں میں زمینوں کے تنازعات اچانک شدت اختیار کر گئے۔ ان کے مطابق کچھ مقامات پر مسلح افراد کی موجودگی میں دباؤ ڈال کر آبادیوں کو گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا گیا۔ ان میں ازبک اور ترکمان برادریوں کے سیکڑوں خاندان شامل تھے جنہیں اپنے آبائی علاقوں سے ہجرت کرنا پڑی۔

طالبان نے افغانستان بھر میں شہریوں کی جبری اور غیر قانونی بے دخلی کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ 2024 میں نیمروز صوبے میں کم از کم 100 بلوچ خاندانوں کو جبری نقل مکانی کا حکم دیا گیا، یہ واقعہ ضلع کنگ میں پیش آیا جہاں ایک عبدالسلام عرف حاجی عمر نامی طالبان کمانڈر نے صرف اس لئے یہ راستہ اختیار کیا کہ وہ وہاں پشتونوں کو آباد کرنا چاہتا تھا، مقامی لوگ اس کی مزاحمت کر رہے تھے۔ 2025 میں صوبہ غور میں غیر

پشتون 600 سے زائد خاندان جبری بے دخلی کے احکامات کا سامنا کر رہے ہیں۔

صرف شمال میں نہیں پورے ملک میں جہاں بھی فارسی بان آباد ہیں، طالبان کی پشتون نسل پرستی کا شکار ہیں۔ ایک بڑا واقعہ جس نے فسادات کی شکل اختیار کی وہ قندوز اور تخار میں 2024 کے تیسری سہ ماہی میں پیش آیا۔ جہاں اس وقت شدید عوامی ردعمل دیکھنے میں آیا جب افغان طالبان کی جانب سے غیر پشتون علاقوں میں آبادی کا تناسب تبدیل کرنے کے لیے ٹی ٹی پی سے تعلق رکھنے والے پشتو ند دہشت گردوں کو آباد کیا جا رہا تھا۔ سب سے خوفناک امر یہ کہ ملا بیت اللہ نے صورتحال کو سنبھالنے کے بجائے اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے ملا ہیبت اللہ اخوندزادہ کی خصوصی فورس "بدر کور" کے اضافی دستے تعینات کیے جس سے وقتی طور پر تو یہ معاملہ دب گیا لیکن نفرت کی آگ سلگ رہی ہے بلکہ پھیل رہی ہے۔

2024 کی پہلی سہ ماہی میں جب پاکستان کی جانب سے دہشت گردی کے خلاف دباؤ اور افغان سرزمین پر ٹی ٹی پی اور گل بہادر گروپ کے ٹھکانوں کو ڈرون اور فضائی کارروائیوں کے ذریعے نشانہ بنایا جانے لگا تو افغان طالبان نے اسے بھی اپنی نسلی تعصب کی پالیسی کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور ان دہشت گردوں کو خاندانوں سمیت محفوظ پناہ گاہیں فراہم کرنے کے نام پر غیر پشتون صوبوں میں جبری طور پر آباد کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا، اس کے ساتھ ساتھ پاکستان سے بے دخل کئے جانے والے افغان مہاجرین کو بھی انہی غیر پشتون علاقوں میں بسایا جا رہا ہے تاکہ آبادی کا تناسب تبدیل کیا جا سکے۔ عارضی کیمپوں کے بجائے انہیں مستقل جائیدادیں دی گئیں اور نسلوں سے مستقل جائیداد رکھنے والوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا گیا۔

قندوز میں آبادکاری کے نگران مولوی محمد رمضان کریم کی کمان میں صرف ایک ماہ کے دوران ہی "کسنی" اور "کوکچہ" کے علاقوں میں تاجک اور ازبک خاندانوں کو زبردستی بے دخل کر کے ان کے مکانات اور زمینیں پاکستان سے آنے والے دہشت گردوں کے حوالے کر دیئے گئے۔ یہ عمل صرف قندوز تک محدود نہیں بلکہ تخار اور غزنی میں بھی مقامی آبادی کو بے دخل کر کے ان کی زمینیں اور مکانات ٹی ٹی پی، القاعدہ اور دیگر اتحادی گروپوں کو دیئے گئے۔ قندوز کے علاقوں کسنی، کوکچہ بازار، اور تخار کے ضلع خواجہ بہاؤالدین کے دیہات لالا گزر، کنکجر، بہارستان اور مغل قشلہ، اسی طرح دشتِ قلعہ کے علاقے الانگ، تاجک قشلاق اور عرب کٹل ان علاقوں میں شامل ہیں جہاں یہ آبادکاری کی گئی۔ اس عمل کے خلاف مقامی

سطح پر شدید ردعمل سامنے آیا جس میں مقامی طالبان عناصر بھی شامل ہو گئے یہاں تک کہ جب ٹی ٹی پی سے تعلق رکھنے دہشت گرد ان مکانات پر قبضہ لینے پہنچے تو کئی علاقوں میں ہنگامے پھوٹ پڑے، لوگوں نے ہتھیار اٹھالئے۔

بدرکور کے دستوں نے ان ہنگاموں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی، انہیں بھی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ کسنی کے علاقے میں پرتشدد جھڑپیں رپورٹ ہوئیں جبکہ مقامی آبادی میں شدید غصہ پایا جاتا تھا۔ ذرائع کے مطابق گل بہادر گروپ اور لشکر اسلام کے دہشت گردوں کو بھی قندوز میں آباد کیا گیا۔ صرف مارچ کے ایک مہینے میں باوجود اس کے کہ رمضان المبارک کے مقدس ایام چل رہے تھے، تاجک اور ازبک خاندانوں کے 783 مکان زبردستی خالی کروا کے ان دہشت گردوں کے حوالے کیے گئے، ان کی زرعی زمینیں بھی طالبان قاضی کے حکم پر چھین کر دہشت گردوں کو الاٹ کر دی گئیں۔

یہ صورتحال اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ افغان طالبان بیک وقت کئی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک طرف وہ ٹی ٹی پی کو محفوظ پناہ گاہیں فراہم کر کے پاکستان کے دباؤ سے بچانا چاہتے ہیں جبکہ دوسری طرف شمالی صوبوں میں آبادی کا تناسب تبدیل کر کے اپنے اثر و رسوخ کو مضبوط بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ پالیسی مقامی آبادی میں پہلے سے موجود نسلی محرومی کے احساس کو مزید بڑھا رہی ہے۔

یہ عدم توازن اب کھلے ردعمل کی شکل اختیار کر رہا ہے، جہاں مقامی لوگ اور حتیٰ کہ بعض طالبان عناصر بھی اس عمل کے خلاف کھڑے ہونے پر مجبور ہیں۔ اگر یہ رجحان جاری رہا تو اس کے اثرات صرف مقامی سطح پر ہنگاموں تک محدود نہیں رہیں گے بلکہ یہ وسیع پیمانے پر عدم استحکام، نسلی تقسیم اور ممکنہ مسلح مزاحمت کو جنم دے سکتے ہیں جو نہ صرف طالبان کی داخلی یکجہتی بلکہ پورے خطے کی سلامتی کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔

## پنجشیر میں جبری بے دخلی اور نسلی دباؤ

جبری بے دخلی کی تازہ ترین واردات دسمبر 2025 میں سامنے آئی جب پنجشیر میں طالبان حکومت نے علاقے کے چار دیہات فوری طور پر خالی کرانے کا حکم دیا ہے۔ طالبان امیر ملا ہیبت اللہ کی ہدایت پر ان کی ذاتی "فورس البدر کور" کو حکم دیا گیا ہے کہ پنجشیر کے چار دیہات کو فوری خالی کرایا جائے۔ طالبان فورسز نے ان دیہات میں اعلانات کیے اور نوٹس بھی چسپاں کر دیئے جن میں ہدایت کی گئی ہے کہ مکین فوراً اپنے گھر خالی کریں بصورتِ دیگر ان کا سامان ضبط کیا جا سکتا ہے اور گرفتاری بھی عمل میں لائی جا سکتی

ہے۔جن دیہات کو خالی کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان میں آلوک، اسپچہ، اسپینہ اور دشنک شامل تھے۔ طالبان کا موقف ہے کہ دشنک اور اس کے گردونواح کو فوجی علاقہ بنایا جارہا ہے۔تقریباً سات سے آٹھ ماہ قبل ان علاقوں کو ملٹری زون قرار دینے کا اعلان کیا گیا تھا تاہم اب اس فیصلے کو باضابطہ انتظامی شکل دے دی گئی ہے اور مقامی آبادی کو جبراً نقل مکانی پر مجبور کیا جارہا ہے۔

پنجشیر کے شہری اس اقدام پر شدید تشویش کا اظہار کرتے رہے ہیں۔مقامی افراد کے مطابق طالبان نے نہ تو متبادل رہائش فراہم کی ہے اور نہ ہی کسی قسم کی مالی معاونت دی جارہی ہے جس کے نتیجے میں ہزاروں خاندان بے سہارا ہونے کا خدشہ ہے۔بعض افراد جنہوں نے اپنے گھروں سے نکلنے سے انکار کردیا انہیں جبری اٹھا کر گھروں سے نکالا گیا۔اس حکم کی واحد وجہ تو یہ ہے کہ طالبان روزِ اول سے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی پنج شیر فتح نہیں کر سکے تھے، اب جھوٹے وعدوں اور دھوکہ دہی کے ذریعے سے وہ شہر قابض ہو ہی چکے ہیں تو چاہتے ہیں کہ یہاں آبادی کا تناسب بدلا جائے تاکہ آئندہ یہاں بھی ان کا اثر رسوخ قائم رہ سکے۔مقصد صرف فوجی تنصیبات قائم کرنا نہیں بلکہ تاجک آبادی کو علاقے سے بے دخل کرنا ہے کیونکہ طالبان این آر ایف کی کارروائیوں کو روکنے میں ناکام رہے ہیں۔منصوبہ یہ ہے کہ مقامی تاجک آبادی کو نکال کر ان کی جگہ پشتون طالبان کو بسایا جائے۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ القاعدہ کے اتحادی گروپ، خصوصاً ای ٹی آئی ایم کو بھی پنجشیر منتقل کیا جانا تھا۔ پنجشیر کے گورنر ملا حکیم آغا نے اس پوری کارروائی کی نگرانی کی۔ذرائع کے مطابق ان دیہات کو خالی کرانے کا مقصد ایک بڑا فوجی اڈہ قائم کرنا، تاجک آبادی کو اقلیت میں بدلنا اور ساتھ ہی قندھار اور ہلمند کے پشتون طالبان کو القاعدہ اور اس کے اتحادی گروپوں کے ساتھ، مقامی آبادی کے گھروں میں آباد کرنا تھا تاکہ بغاوت کی صورت میں وادی کے اندر بڑی تعداد میں وفادار مسلح افراد موجود ہوں۔یہ معاملہ صرف چار دیواری تک محدود نہیں۔ایک منصوبے کے تحت مزید دس دیہات کو بھی مرحلہ وار خالی کرایا جارہا تاکہ بتدریج پنجشیر کی ڈیموگرافی تبدیل کی جاسکے۔پنجشیر سے مقامی آبادی کی جبری بے دخلی طالبان کے خلاف شدید نفرت کو جنم دے رہی ہے۔اس سے عوام میں ناراضگی بڑھے گی اور این آر ایف کے لیے حمایت میں اضافہ ہوگا۔طالبان کے اقتدار کے تقریباً چار سال مکمل ہونے کو ہیں لیکن پنجشیر جیسے علاقوں میں آج بھی امن قائم نہیں ہوسکا۔یہ نہ صرف افغانستان کے اندرونی انتشار کو ظاہر کرتا ہے بلکہ پورے خطے کے لیے

خطرناک ہے۔ اگر یہ کشیدگی بڑھتی ہے تو شمالی افغانستان میں پہلے سے سرگرم مزاحمتی گروپوں کو مزید قوت ملے گی اور عدم استحکام پورے خطے تک پھیل سکتا ہے۔ معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں رہا، جگہ جگہ سے ایسی اطلاعات آ رہی ہیں کہ 2021 سے لمحہ موجود تک ایک منظم منصوبہ بندی کے تحت لوگوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔

27 جولائی 2025 کو بامیان کے گاؤں رشک میں طالبان حکام نے مسلح افراد اور کوچیوں (خانہ بدوش) کے ہمراہ پورا گاؤں خالی کروالیا گیا 25 ہزارہ قبیلے کے خاندانوں (تقریباً 200 افراد بشمول خواتین، بچے اور بزرگ افراد) کو زبردستی ان کے گھروں سے بے دخل کر کے پشتون کوچیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ جوزجان صوبے کے کئی دیہات میں پشتون کوچیوں (خانہ بدوش) نے طالبان فورسز کے ہمراہ گھروں اور زمینوں پر قبضہ کیا، بعض علاقوں میں صورتحال اس حد تک کشیدہ رہی کہ لوگوں کو کھل کر احتجاج کرنے یا مزاحمت دکھانے کا موقع بھی نہیں ملا۔ شمالی جوزجان کے دیہات درزاب اور قوش تپہ میں 2025 تک 1000 خاندانوں کو زبردستی ان کے گھروں اور زمینوں سے بے دخل کیا گیا۔ ان میں ازبک اور ترکمان نسلی برادریوں کو نشانہ بنایا گیا۔

یہ بے دخلی ایسے وقت میں کی جا رہی ہیں جب طالبان دہشت گردوں نے اگست 2021 میں افغانستان پر قبضے کے بعد سے ملک کے پانچ صوبوں میں سیکڑوں شیعہ ہزارہ خاندانوں کو بھی ان کے گھروں اور کھیتوں سے بے دخل کیا ہے۔ پشتون خانہ بدوشوں نے طالبان کی مدد سے ان کی 20 ہزار ایکڑ سے زائد زمین پر قبضہ کر لیا۔ وہاں کوئی مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔ اگر کوئی آواز اٹھاتا تو مار دیا جاتا۔ اکتوبر 2021 میں طالبان نے جنوبی ہلمند اور شمالی بلخ میں سیکڑوں غیر پشتون ہزارہ خاندانوں کو بے دخل کیا۔

ستمبر 2023 میں وسطی صوبہ دایکندی میں تقریباً 700 ہزارہ افراد کو بھی زبردستی نکالا گیا۔ طالبان کا کہنا تھا کہ وہ عدالتی حکم پر عمل کر رہے تھے جس کے مطابق زمین مبینہ طور پر اصل مالکان کو واپس دی جا رہی تھی۔ یہ بے دخلیاں صرف غیر پشتونوں تک محدود نہیں رہیں۔ طالبان نے جنوبی صوبہ قندھار میں اپنے ہی پشتون افراد کو بھی بے دخل کیا، خاص طور پر وہ لوگ جو سابق حکومت یا اس کی فورسز میں شامل رہے تھے۔

## شمال پر کنٹرول کے لئے نئی فورس

بدخشان، تخار اور بلخ میں سونے کی کانوں اور دیگر وسائل کی لوٹ مار کے خلاف شمالی افغانستان میں عوام اور

طالبان کے اندرونی حلقوں میں نفرت اور مزاحمت بڑھ رہی ہے، کئی جگہ جھڑپیں بھی ہوئی ہیں، دوسری جانب اب مقامی لوگوں کی وسائل پر قبضے کے خلاف مزاحمت بڑھ رہی ہے جس میں شمال سے تعلق رکھنے والے طالبان کی شمولیت صورتحال کو مخدوش بنا رہی ہے۔ اس صورتحال کے تدارک کے لئے ہیبت اللہ رجیم نے ایک نیا استبدادی اقدام کیا ہے اور شمال کے لئے ایک ہزار افراد پر مشتمل ایک نئی ریپڈ فورس قائم کرنے کا اعلان کر دیا ہے جس میں قندھار اور ہلمند سے پرانے طالبان کو بھرتی کیا جائے گا۔ اس فورس کے قیام کا مقصد سرحدی سکیورٹی بتایا گیا ہے لیکن اصل مقصد بڑھتی ہوئی مقامی نفرت اور بغاوت کو دبانا بتایا جا رہا ہے۔ یہ فیصلہ 3 اور 4 دسمبر 2025 کو صوبہ سمنگان کے دارالحکومت ایبک میں ہونے والے ایک اہم اجلاس میں کیا گیا۔ اس اجلاس میں شمالی اور شمال مغربی صوبوں کے طالبان گورنرز اور اعلیٰ سیکورٹی حکام نے شرکت کی۔

شرکاء میں ملا شیریں (انچارج قندھار سیکریٹریٹ اور گورنر قندھار)، ملا یوسف وفا (گورنر بلخ) کے علاوہ فاریاب، جوزجان، سمنگان، سرپل، کندز، بغلان، تخار، بدخشان اور مغربی صوبوں ہرات، بادغیس، غور اور فراہ کے گورنرز، سرحدی فوجی کمانڈرز، انٹیلی جنس سربراہان اور پولیس چیفس شامل تھے۔ بلخ کے چیف جج نے بھی اجلاس میں شرکت کی۔ اجلاس کے دوران گورنر بلخ ملا یوسف وفا نے شمال کے لیے ایک علیحدہ فورس بنانے کی تجویز پیش کی۔ ملا شیریں نے شرکاء کو یقین دلایا کہ اس فورس کے لیے فنڈز، اسلحہ اور دیگر ضروریات کی منظوری پہلے ہی ملا ہیبت اللہ اخوندزادہ سے حاصل کی جا چکی ہے۔

گورنر بلخ کے ترجمان نے اس فورس کے قیام کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے یونٹس مختلف سرحدی اضلاع میں تعینات ہوں گے اور ضرورت پڑنے پر فوری طور پر سرحدوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہوں گے۔ اس فورس کو ہلکے اور بھاری ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس کیا جائے گا اور اس کا کمانڈر کسی بھی صورتحال میں خودمختار فیصلے کرنے کا اختیار رکھے گا۔ تاہم یہ فورس سرحدی کمانڈر، گورنر یا پولیس چیف کی ہدایات پر بھی عمل کرے گی۔ اس فورس کے کمانڈر کی تقرری جلد ملا ہیبت اللہ خود کریں گے جبکہ ابتدائی مرحلے میں گورنر بلخ ملا یوسف وفا اس کی تشکیل کی نگرانی کریں گے۔

اس اقدام کا اصل مقصد صرف سرحدی سیکورٹی نہیں بلکہ اسے بطور جواز استعمال کیا جا رہا ہے۔ درحقیقت شمال میں پشتون خصوصاً قندھاری غلبے کے خلاف بڑھتی ہوئی بغاوت کو کچلنے کے لیے ایک علیحدہ فورس تیار کی

جارہی ہے۔اس فورس میں شمالی علاقوں سے کسی فرد کو شامل نہیں کیا جائے گا۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ اجلاس میں شریک ذمہ داران میں شمالی علاقوں کا کوئی نمائندہ موجود نہیں تھا۔ چونکہ تمام صوبوں میں گورنرز، پولیس چیفس اور انٹیلی جنس (GDI) کے سربراہان پشتون ہیں، اس لیے انہیں مدعو کیا گیا جبکہ بلخ کے چیف جج نے شرکت کی کیونکہ دیگر صوبوں کے چیف ججز غیر پشتون ہیں۔2024 میں طالبان نے تمام غیر پشتون طالبان کو اسلحہ سے محروم کر دیا تھا اور فیصلہ کیا تھا کہ کسی بھی غیر پشتون طالبان کو کسی مسلح فورس یا یونٹ کی قیادت نہیں دی جائے گی۔اس فیصلے کے بعد غیر پشتون طالبان کو عدلیہ اور دیگر غیر مسلح محکموں میں منتقل کر دیا گیا۔

ملا ہیبت اللہ کے 2024 کے حکم کے بعد شمال میں طالبان کے اندر بھی نفرت اور بغاوت میں اضافہ ہوا ہے جبکہ عوامی سطح پر نیشنل ریزسٹنس فرنٹ (NRF) اور افغانستان فریڈم فرنٹ (AFF) کی حمایت میں نمایاں اضافہ دیکھا گیا ہے۔اسی صورتحال سے نمٹنے کے لیے یہ نئی فورس تشکیل دی جارہی ہے ملا ہیبت اللہ کی جانب سے شمال میں پشتون، خصوصاً قندھاری غلبہ مسلط کرنے کی مسلسل کوششیں پہلے ہی شدید ردعمل کو جنم دے رہی ہیں۔اگر مقامی آبادی کو دبانے کے لیے بنائی گئی فورس مکمل طور پر پشتونوں، خاص طور پر قندھاریوں پر مشتمل ہوگی تو اس سے بغاوت مزید بھڑکنے کا امکان ہے۔یہ خدشہ بھی موجود ہے کہ اس شمالی فورس کو افغانستان کی سرزمین سے تاجکستان اور ازبکستان کے خلاف بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ صورتحال اپریل 2025 میں پاکستان سے ملحقہ علاقوں میں قائم کی گئی ''اصلاحاتی کمیشن'' فورس سے ملتی جلتی ہے جسے بظاہر ٹی ٹی پی کے خلاف بنایا گیا تھا اور جس کی قیادت سابق گورنر خوست ملا قاسم خالد کو دی گئی تھی تاہم اس فورس نے ٹی ٹی پی کو روکنے کے بجائے اس کی معاونت کی۔ یہی طرزِ عمل اب شمال میں بھی دہرائے جانے کا خدشہ ہے۔

## مذہبی اقلیتوں کا استحصال

افغانستان میں طالبان کی موجودہ حکمرانی کو اگر صرف نسلی تعصب کے دائرے میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ حقیقت کا ادھورا عکس پیش کرتا ہے۔معاملہ اس سے کہیں آگے بڑھ چکا ہے۔ ہیبت اللہ استبداد اب واضح طور پر نہ صرف غیر پشتون قومیتوں بلکہ مذہبی اقلیتوں کے لیے بھی ناقابل برداشت ہوتا جارہا ہے۔اس طرزِ حکمرانی میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی جارہی، چاہے وہ نسلی بنیاد پر ہو یا عقیدے کی بنیاد پر۔ اگست 2021 کے بعد سے تاجک، ازبک اور ہزارہ برادریوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا، اسے زیادہ

ترنسلی زاویے سے دیکھا گیا لیکن اسماعیلی، شیعہ اور سلفیوں کے خلاف منظم مہم جوئی اس بادشاہت کے ایک نئے رخ سے نقاب ہٹاتی دکھائی دیتی ہے۔ تعلیمات پر پابندی، عبادت گاہوں پر قبضے، لوگوں کو اپنے عقائد ترک کرنے پر مجبور کرنا، اور مالی مراعات یا سرکاری ملازمتوں کے ذریعے مذہب تبدیل کرنے کی ترغیب دینا، یہ سب اقدامات واضح کرتے ہیں کہ مسئلہ محض نسل تک محدود نہیں رہا بلکہ اب مذہبی شناخت بھی نشانے پر ہے۔ اس سے بھی زیادہ تشویشناک پہلو وہ سرکاری سوچ ہے جس کے تحت صرف ایک مخصوص فقہی تشریح کو درست قرار دے کر باقی تمام مسالک کو "بدعتی" یا گمراہ کہا جا رہا ہے۔ اس پالیسی کے نتیجے میں نہ صرف اسماعیلی بلکہ دیگر شیعہ گروہ، اہل حدیث کے ماننے والے اور غیر مسلم اقلیتیں بھی دباؤ اور خوف کی فضا میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اس طرح ایک ایسا ماحول پیدا کیا جا رہا ہے جہاں مذہبی تنوع کو برداشت کرنے کے بجائے اسے ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

مختلف علاقوں سے موصول ہونے والی اطلاعات ظاہر کرتی ہیں کہ مذہبی اقلیتوں کے خلاف صرف نظریاتی دباؤ ہی نہیں بلکہ عملی اقدامات بھی کیے جا رہے ہیں۔ لوگوں کو حراست میں لینا، ان سے عقیدے کے بارے میں پوچھ گچھ کرنا اور انکار کی صورت میں دھمکیاں دینا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ پالیسی محض بیانات تک محدود نہیں بلکہ زمین پر نافذ بھی ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نصاب، مساجد اور عوامی اجتماعات کے ذریعے ایک خاص بیانیہ کو فروغ دیا جا رہا ہے جس کا مقصد ایک ہی طرز فکر کو پورے معاشرے پر مسلط کرنا ہے لہٰذا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ موجودہ نظام ایک ہمہ گیر عدم برداشت کی بنیاد پر کھڑا ہے، جہاں نسلی اور مذہبی دونوں طرح کی اقلیتیں دباؤ کا شکار ہیں۔ افغانستان ایک متنوع معاشرہ رہا ہے جہاں مختلف زبانیں، ثقافتیں اور عقائد صدیوں سے ساتھ ساتھ موجود رہے ہیں۔ اس تنوع کو طاقت کے ذریعے ختم کرنے کی کوشش نہ صرف سماجی توازن کو بگاڑ سکتی ہے بلکہ مستقبل میں مزید کشیدگی اور عدم استحکام کو جنم دے سکتی ہے۔

## اہل تشیع اور اسماعیلی برادری کا استحصال

ملک کے موجودہ اقتدار کے ڈھانچے سے ہی شیعہ اور اسماعیلیوں کو خارج کرنے کی کوششیں نہیں کی جا رہی بلکہ انہیں زندہ رہنے کا حق تک نہیں دیا جا رہا۔ ان سے عملاً مذہبی آزادی چھین لی گئی ہے۔ محرم اور عاشورہ جیسے بنیادی مذہبی مواقع پر پابندیاں عائد کی گئیں، جلوسوں اور مجالس کو محدود یا بند کیا گیا اور مذہبی علامات کو

ہٹایا گیا۔ یہاں تک کہ فقہ جعفری کی تعلیم پر بھی قدغن لگائی گئی، یہاں تک کہ شیعہ تعلیمی اداروں میں بھی فقہ جعفری کی تعلیم نہیں دی جا سکتی، افغانستان میں ہمیشہ سے شیعہ کا پرسنل لا الگ رہا ہے لیکن اب اس پر پابندی لگا دی گئی ہے اور عاشورہ کو سرکاری کیلنڈر سے نکالنے جیسے اقدامات کیے گئے۔ یہ سب اقدامات شیعہ شناخت کو مٹانے کی کوشش کے طور پر دیکھے جا رہے ہیں۔ گزشتہ چار برسوں میں طالبان نے شدید مذہبی دباؤ ڈالا اور بعض افراد کو جبراً مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔

اہل تشیع اور اسماعیلی برادری کے تمام مذہبی پروگرام معطل کر دیئے ہیں، حتیٰ کہ اسماعیلی علما اور نوجوانوں کو قرآن پاک کی تلاوت اور تعلیم دینے سے بھی روک دیا گیا ہے۔ ایک ذریعے کے مطابق: "شکی ضلع کے گاؤں زنگاریا میں جمعہ فاتح نے کئی غیر تعلیم یافتہ اور ناتجربہ کار نوجوانوں کو اسلحہ دے رکھا ہے اور انہیں خوف و ہراس پھیلانے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ یہ افراد مذہب کے نام پر اور اس کے احکامات کے تحت عوام میں دہشت کا ماحول پیدا کر رہے ہیں۔" رپورٹس کے مطابق جمعہ فاتح نے جمرج بالا گاؤں میں، جہاں تقریباً 500 اسماعیلی خاندان آباد ہیں، ایک مدرسہ قائم کیا ہے اور والدین کو دھمکیوں اور اسلحے کے زور پر مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو وہاں بھیجیں۔ انکار کی صورت میں خاندانوں پر ہزاروں افغانی جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔ طالبان کمانڈر غیر تعلیم یافتہ افراد کو پیسے دے کر عوام کے خلاف دباؤ اور دھونس کے لیے استعمال کرتا ہے جس کے نتیجے میں علاقے میں تقسیم، دشمنی اور باہمی اعتماد کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ ان اطلاعات کے مطابق بدخشان کے کم از کم تین اضلاع میں اسماعیلی برادری طالبان کے شدید جبر کا شکار ہے۔ بدخشان میں قبل کم از کم 50 اسماعیلی اور اثنا عشری شیعہ افراد کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا تھا۔ فروری 2024 میں طالبان نے اعلان کیا تھا کہ ان افراد کو "اسلام میں داخل" کر لیا گیا ہے جبکہ اس سے پہلے بھی تقریباً 25 افراد کو جبراً تبدیل کیا گیا تھا۔ بعض کو مارا پیٹا گیا یا قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ طالبان نے شغنان، اشکاشم، یمگان اور زیبک کے اسماعیلیوں کو "کافر" قرار دے کر فوری طور پر عقیدہ تبدیل کرنے کی دھمکیاں دیں۔

طالبان کے وزیر اعلیٰ تعلیم ندا محمد ندیم کا دعویٰ کیا ہے کہ افغانستان میں صرف فقہ حنفی موجود ہے اور تمام شہری اسی کے پیروکار ہیں۔ اسی طرح برات کے گورنر نور محمد اسلام جار نے اپنی ایک تحریر میں شیعہ مسلک کو "گمراہ" اور تاریخی طور پر "کفار کا حامی" قرار دیا۔ تمام شواہد ظاہر کرتے ہیں کہ بدخشان میں اسماعیلی

برادری کو نہ صرف مذہبی جبر بلکہ منظم سماجی، معاشی اور نفسیاتی دباؤ کا سامنا ہے جو ایک وسیع تر پالیسی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اسماعیلی برادری چونکہ تعداد میں کم ہے اس لئے جبر کا زیادہ شکار ہے، ان سے بغاوت کا بھی خطرہ نہیں۔ بدخشان کے صوبائی دارالحکومت فیض آباد میں اسماعیلیوں کو منظم اور بار بار حملوں کا بھی سامنا ہے جن کے مجرم آج تک کبھی نہیں پکڑے گئے، ہمیشہ طالبان سکیورٹی سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

طالبان نے اسماعیلیوں کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے انعامات کا اعلان بھی کیا ہے۔ ایک سرکاری دستاویز میں گروہ نے اس مذہب کے پیروکاروں سے اپنے عقائد ترک کرنے کا مطالبہ کیا اور اس کے بدلے مراعات اور حوصلہ افزائی کا وعدہ کیا۔ جس طرح ہندوتوا بھارت میں مساجد کو مندروں میں بدلنے کی مہم چلائے ہوئے ہے، طالبان اقلیتوں کے عبادت خانوں کو مساجد میں بدل کر بھارتی ہندوتوا کی الزام تراشی کو سچ ثابت کر رہے ہیں۔ بدخشان میں اسماعیلی جماعت خانوں کو مساجد میں تبدیل کرنے کا ایک پورا منصوبہ پیش کیا جاچکا ہے جس نے شدید خوف اور غیر یقینی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ حیرت انگیز طور پر الزام بھی وہی ہے جو بی جے پی کے دہشت گرد عائد کرتے ہیں کہ "مقامات مساجد کے طور پر استعمال ہوتے تھے جنہیں بعد میں جماعت خانوں میں تبدیل کر دیا گیا اور اب وہ اس تبدیلی کو واپس پلٹنا چاہتے ہیں۔" حالانکہ اس میں اکثریت ایسے عبادت خانوں کی ہے جنہیں زمین خرید کر تعمیر کیا گیا۔

اسکولوں اور مساجد میں اسماعیلی بچوں پر مذہب تبدیل کرنے کے لیے دباؤ ڈالنے کے واقعات بھی عام ہیں۔ کچھ اسماعیلی دکاندار جو ضلعی مساجد میں نماز کے لیے جاتے ہیں، انہیں کھلے عام امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دو ماہ قبل اشکاشم کی مسجد کے امام ملا وحیب اللہ نے جمعہ کے خطبے کے دوران اسماعیلیوں سے کہا کہ وہ صفوں سے نکل جائیں۔

طالبان کے ایک سرکاری خط کے مطابق بدخشان میں اعلان کیا گیا ہے کہ جو اسماعیلی سنی اسلام قبول کریں گے انہیں سیکیورٹی تحفظ اور مالی فوائد دیئے جائیں گے۔ خط میں کہا گیا ہے کہ جو نوجوان سنی اسلام اختیار کریں گے انہیں سرکاری اداروں میں ملازمت حاصل کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں گے۔ اس میں یہ بھی زور دیا گیا ہے کہ جو نوجوان اپنا مذہب تبدیل کریں انہیں اسماعیلی علاقوں سے باہر دینی مدارس میں بھیجا جائے اور ان پر خصوصی توجہ دی جائے۔ خط میں مزید تجویز دی گئی ہے کہ اسماعیلی اکثریتی علاقوں کے

اسکولوں اور مذہبی اداروں کے لیے ''تبلیغی اور تجربہ کار'' اساتذہ بھرتی کیے جائیں جنہیں تنخواہیں دی جائیں۔ طالبان نے یہ بھی کہا ہے کہ ان کے مدارس میں بھیجے جانے والے طلبہ مالی معاونت کے مستحق ہوں گے۔

بدخشان میں اسماعیلیوں کے خلاف بڑھتے ہوئے جبر اور بدنی تشدد کے دوران نامعلوم مسلح افراد نے فیض آباد میں دو نوجوان اسماعیلیوں کو گولی مار کر زخمی کر دیا۔ یہ حملہ جمعرات کی شام 22 جنوری 2026 کو دشتِ قرغ کے علاقے میں اس وقت ہوا جب متاثرین اپنی دکان بند کر رہے تھے۔ ذرائع کے مطابق زخمیوں کی شناخت سلامت شاہ حسن اور شاہ نظر کے نام سے ہوئی ہے جو ضلع شغنان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے قبل افغانستان میں اقوام متحدہ کے امدادی مشن (یوناما) نے رپورٹ کیا تھا کہ رواں سال 2026 کے پہلے تین ماہ کے دوران طالبان نے 50 سے زائد اسماعیلیوں کو زبردستی سنی اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔ رپورٹ کے مطابق طالبان اہلکاروں نے مذہب تبدیل کرنے سے انکار کرنے والوں کو مارا پیٹا، دھمکیاں دیں اور بعض صورتوں میں انہیں قتل کی دھمکیاں بھی دیں۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ مقامی طالبان حکام جن میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی وزارت کے اہلکار بھی شامل ہیں، کم از کم 50 اسماعیلی مردوں کو رات کے وقت ان کے گھروں سے نکال کر مذہبی تفتیش کے لیے لے گئے۔

یوناما کے مطابق طالبان حکام نے نہ صرف اسماعیلیوں پر اپنا مذہب ترک کرنے کے لیے دباؤ ڈالا بلکہ اسماعیلی آبادی والے علاقوں میں متعدد دینی مدارس بھی قائم کیے ہیں۔ اس سے قبل انسانی حقوق کی تنظیم رواداری نے رپورٹ کیا تھا کہ شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ طالبان نے افغانستان پر قبضے کے بعد سے اس مذہبی اقلیت پر منظم پابندیاں اور امتیازی سلوک نافذ کیا ہے۔ تنظیم کے مطابق یہ اقدامات منظم مذہبی جبر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے مترادف ہیں۔ گزشتہ چار برسوں میں افغانستان کے اسماعیلی عوام کو سیاسی، انتظامی اور سماجی زندگی سے باہر رکھا گیا ہے اور ان کی مذہبی و ثقافتی شناخت کو کمزور اور دبانے کی دانستہ کوششیں کی گئی ہیں۔

رواداری کے مطابق بعض اسماعیلی، خاص طور پر نچلے درجے کی سرکاری ملازمتوں میں کام کرنے والے افراد، اپنی ملازمت بچانے کے لیے اپنی مذہبی شناخت چھپانے یا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور محسوس کرتے ہیں۔ تنظیم نے نشاندہی کی ہے کہ طالبان کے دوبارہ اقتدار میں آنے کے بعد اسماعیلی برادری کے خلاف نفرت انگیز تقاریر اور علانیہ تکفیر میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اس کے مطابق طالبان کی اخلاقی پولیس، مقامی

کمانڈر، شدت پسند علما اور طالبان سے وابستہ مساجد کے ائمہ کلاس رومز، عوامی پروگراموں اور مذہبی اجتماعات میں کھلے عام یہ بیانیہ پھیلاتے ہیں۔ بعض معاملات میں رواداری کے مطابق، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی وزارت اور طالبان کی غیر عدالتی عدالتوں نے حنفی خواتین اور اسماعیلی مردوں کے درمیان شادیوں کو کالعدم قرار دینے کے احکامات بھی جاری کیے ہیں۔

حال ہی میں رواداری نے طالبان عدالتوں کے تعزیری رہنما اصولوں کی ایک نقل حاصل کی۔ اس کے آرٹیکل دو کی شق آٹھ میں مکتبہ حنفیہ کے پیروکاروں کو مسلمان قرار دیا گیا ہے جبکہ دیگر مسالک اور عقائد کے ماننے والوں کو جو "اہل سنت والجماعت" سے مختلف ہیں "بدعتی" کہا گیا ہے۔ رواداری کا کہنا ہے کہ یہ درجہ بندی ایک ایسے ملک میں مذہبی اقلیتوں کے خلاف کھلی امتیازی سلوک کی عکاسی کرتی ہے جہاں اثناءعشری شیعہ، اسماعیلی، اہل حدیث کے پیروکار، نیز سکھ اور ہندو بھی آباد ہیں اور یہ مذہب وعقیدے کی بنیاد پر عدم امتیاز کے اصول کی صریح خلاف ورزی ہے۔

## کابل میں اہل تشیع پر مظالم

طالبان نے نہی عن المنکر کے نام پر اقلیتوں کا جینا حرام کر دیا ہے، 6 مئی 2026 کو ایک شیعہ جوڑے کو فقہ جعفریہ کے مطابق نکاح پڑھانے کے جرم میں بازار میں پکڑ کر تشدد کا نشانہ بنایا گیا، تھانے میں بند کر دیا گیا، بلکہ نکاح پڑھانے والے مشہور شیعہ عالمِ دین حسین داد شریفی کو بھی حراست میں لیا اور انہیں مارا پیٹا۔ ذرائع کے مطابق، طالبان کی وزارتِ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے افسران نے بدھ کے روز کابل کے داشتِ برچی علاقے میں شادی کا سامان خریدتے ہوئے ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کو حراست میں لیا اور ان پر غیر شرعی تعلقات کا الزام لگایا اور پولیس ڈسٹرکٹ 18 منتقل کیا گیا۔ خاندان کے قریبی ذرائع نے بتایا کہ شریفی نے اس سے قبل جوڑے کا شرعی نکاح پڑھایا تھا اور طالبان حکام کے سامنے قانونی مذہبی دستاویزات پیش کی گئی تھیں۔ تاہم، افسران نے نکاح نامے کی قانونی حیثیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور عالمِ دین کو سزا دینے کے لیے طلب کر لیا۔

شریفی نے بتایا کہ طالبان کے افسران انہیں تھانے لے گئے، جہاں تشدد کیا گیا، دھمکیاں دیں اور ان کے ساتھ تشدد آمیز سلوک کیا، مکے مارے اور میرا عمامہ سر سے گر گیا۔ انہوں نے کہا کہ طالبان نے شیعہ مذہب کی سرکاری شناخت ختم کر دی ہے، اور اب وہ ہمیں اپنے ذاتی اور خصوصی امور بھی اپنے مذہبی عقائد

کے مطابق انجام دینے کی اجازت نہیں دے رہے۔ شیعہ علما کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کیا جا رہا ہے، انہیں تحریری حلف ناموں پر دستخط کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے اور قید کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ شریفی نے مزید کہا کہ نہ صرف علما بلکہ عام شیعہ شہریوں کے ساتھ بھی ذلت آمیز اور توہین آمیز سلوک کیا جا رہا ہے۔ اس سے قبل بلخ یونیورسٹی کے طلباء پر اپنے مذہبی عقائد چھوڑنے کے لئے دباؤ ڈالا گیا ہے۔ طالبان حکام نے یونیورسٹی کے طلباء کو ہدایت کی ہے کہ وہ مذہبی امور، بشمول اجتماعی نمازوں میں سنی اسلامی فقہ کی پیروی کریں۔ طالبان عوامی زندگی میں، بشمول شادی اور طلاق کے معاملات میں حنفی فقہ نافذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

## سلفی/ اہل حدیثوں کی نسل کشی

ہیبت اللہ رجیم کے مظالم کا شکار صرف شیعہ اور اسماعیلی ہی نہیں بلکہ ایک بڑا سنی مکتب فکر اہل حدیث بھی محفوظ نہیں، چونکہ جس طرح طالبان کا تعلق دیوبندی مکتب فکر سے ہے لیکن تمام دیوبندی طالبان نہیں ہیں اسی طرح داعش کا تعلق اہلحدیث مکتب فکر سے ہے لیکن تمام اہل حدیث داعش سے تعلق نہیں رکھتے لیکن افغانستان میں اپنی شخصی حکومت کے استبدادی ایجنڈے کو دوام بخشنے کی کوشش میں طالبان نے اقتدار سنبھالتے ہی ملک کے تمام اہل حدیث حضرات کو داعش کا حامی قرار دے کر ان کے خلاف معاندانہ کارروائیاں شروع کر دیں حالانکہ داعش ہی نہیں القاعدہ بھی اہل حدیث ہے لیکن وہ قبول ہے کیونکہ وہ رقم دیتی ہے لیکن عام اہل حدیث قبول نہیں اس کا تعلق داعش سے چاہے ہو یا نہ ہو۔

15 اگست کے بعد جب کابل پر طالبان کا مکمل کنٹرول قائم ہوا۔ طالبان نے ان کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں، خصوصاً کنہڑ اور نورستان میں جی ڈی آئی کے اعلیٰ افسر ڈاکٹر بشیر نے وہ طوفان اٹھایا کہ پناہ بخدا، ایک ایک دن میں کئی کئی علما کو قتل کیا گیا۔ کابل سے تعلق رکھنے والے ایک معروف اور سینئر سلفی عالم شیخ ابوعبیداللہ متوکل جنہوں نے ہمیشہ داعش کے خلاف بات کی انہیں 28 اگست کو ان کے گھر سے اغوا کیا گیا، اور ایک ہفتے بعد ان کی تشدد اور پراسرار ہلاکت نے سلفی علما میں خوف مزید بڑھا دیا۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے 2022 کے آغاز میں افغان سلفی/ اہل حدیث علما کے ایک وفد نے طالبان قیادت سے ایک اعلیٰ سطحی ملاقات کی اور انہیں یقین دلایا کہ وہ طالبان کے حمایتی ہیں، انہیں مخالف نہ سمجھا جائے۔

طالبان نے ایک اوچھی حرکت کہ اور اس ملاقات کی 17 منٹ کی ویڈیو اپنے آفیشل پبلشر ''الامارہ سٹوڈیو''

سے نشر کی اور اسے ٹائٹل دیا ''سلفی علما کی بیعت''۔ اس وفد کی قیادت مولوی عبدالعزیز نورستانی کر رہے تھے اور ان کے ساتھ 32 اہم سلفی علما اور کمانڈر موجود تھے جن میں بیشتر کا تعلق کنہڑ، ننگرہار اور نورستان سے تھا جبکہ کچھ پاکستان کے پشاور اور قبائلی علاقوں سے بھی تھے۔ ان میں حاجی حیات اللہ، شیخ جمیل الرحمان اور شیخ امین اللہ پشاوری جیسے نام شامل تھے۔ اس کے باوجود سینکڑوں افراد کو گرفتار کیا گیا جبکہ 16 صوبوں میں درجنوں مساجد اور مدارس بند کر دیئے گئے۔ بعض سلفی علما روپوش ہونا پڑا جن میں کابل اور ننگرہار کے معروف مذہبی شخصیات بھی شامل ہیں۔ طالبان کے اقتدار سنبھالنے کے بعد سے اب تک کم از کم 100 سلفی علما کو قتل کیا گیا ہے جبکہ ان کے 40 سے زائد مذہبی مدارس بند کر دیئے گئے ہیں۔ طالبان نے صرف ایک سال میں افغانستان کے کم از کم 15 صوبوں میں 5 ہزار سے زائد سلفی مبلغین اور طلبہ کو گرفتار کیا۔

حیرت انگیز طور پر ایک جانب سلفی علما کے وفد کی ملاقات کو بیعت قرار دے کر تشہیر کی گئی تو دوسری جانب ملا ہیبت اللہ کے داماد اور اعلیٰ تعلیم کے وزیر مولوی ندا محمد ندیم نے ایک ویڈیو جاری کی جس میں سلفیوں کے خلاف سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے انہیں مرتد کہا گیا۔ ملا ندیم کی ویڈیو کا ایک پوائنٹ اس ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے جس کے تحت طالبان جبر اور ظلم کا یہ نظام قائم کئے ہوئے ہیں، ندیم کو کہتے ہوئے سنا جا سکتا ہے کہ ''ہم نے افغانستان فتح کر لیا ہے، اب کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

2021 کے اگست کے بعد رپورٹس کے مطابق طالبان نے سلفیوں کے خلاف سخت کارروائیاں شروع کیں۔ ان کارروائیوں میں سلفی برادری کے بعض افراد کی گرفتاری، مبینہ طور پر قتل، اور ان کی مساجد اور مدارس پر چھاپے شامل تھے جن کے بعد درجنوں مذہبی مراکز بند کر دیئے گئے۔ 2023 میں بھی سلفیوں کے خلاف خلاف ورزیاں جاری رہیں۔ خواتین اور بچوں کی گرفتاریوں کے واقعات بھی رپورٹ ہوئے، بعض اوقات بغیر کسی باضابطہ الزام کے۔ مشرقی افغانستان خصوصاً ننگرہار اور کنہڑ میں سلفیوں کی سماجی نگرانی اور شناخت کا عمل زیادہ سخت رہا جبکہ بعد میں یہ رجحان کنہڑ اور بدخشان تک بھی پھیلتا گیا۔ مذہبی اقلیتوں کے خلاف جبر کی یہ پالیسیاں بتاتی ہیں کہ ہیبت اللہ کی بادشاہت اسلامی ہے ناں جمہوری بلکہ ماضی و حال کی بادشاہت اور پشتون روایات کی بھی باغی ہیں، یہ صرف جبر و استبداد کا قانون ہے اور یہی آج کے نئے طالبان کا اصل چہرہ اور شناخت ہے۔

---

# باب چہارم

## عالمی دہشت گردی کی آماجگاہ

ہیبت اللہ کا شخصی استبداد دراصل ایک ہائبرڈ رجیم ہے، جس میں القاعدہ بنیادی ستون کی حیثیت رکھتی ہے، صرف پلاننگ اور پالیسیز کی حد تک نہیں بلکہ قوت نافذہ اور انتظامیہ میں بھی القاعدہ باقاعدہ کردار ادا کر رہی ہے، اس کی شوریٰ کے رکن طالبان حکومت کے اہم عہدوں پر موجود ہیں، وہ اپنے دیگر ہم منصب لوگوں کے مقابلے میں زیادہ بااختیار بلکہ بعض حالات میں خودمختار ہیں۔ جہاں کوئی وزیر بلکہ آرمی چیف تک ملا ہیبت اللہ تک براہ راست رسائی نہیں رکھتا، یہ القاعدہ سے منسلک کردار ملا ہیبت اللہ تک رسائی بھی رکھتے ہیں اور ان کی منظوری یا اجازت کے بغیر فیصلے کرنے کا اختیار بھی۔ طالبان کی انٹیلی جنس ایجنسی جی

ڈی آئی کے سیکرٹریٹ، وزارت دفاع اور وزارت خزانہ میں القاعدہ اور اس کی اتحادی جماعتوں کے ٹیکنو کریٹس افغان شناخت کے ساتھ موجود ہیں۔ فیصلہ ساز حلقوں میں چند ایک بہت نمایاں ہیں اور ان کا القاعدہ سے تعلق کوئی ڈھکا چھپا نہیں۔ فہرست میں جی ڈی آئی کا ڈپٹی ہیڈ تاج میر جواد جو عملاً سربراہ کے اختیار استعمال کرتا ہے، گورنر پنجشیر آغا حکیم، قندھار کا پولیس چیف اور ہیبت اللہ کی پرسنل فورس بدری کور کا غیر علانیہ سربراہ ملا عبدالاحد طالب، گورنر کا پیسہ قاری بریال اور اسی طرح دیگر کئی نام شامل ہیں۔

اسی بندوبست کی وجہ سے افغانستان مقامی اور بین الاقوامی دہشت گردوں کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ اور عالمی امن کے لیے ہمیشہ سے زیادہ بڑا خطرہ بن چکا ہے۔ ماضی میں صرف ایک القاعدہ تھی، اسے بھی ملا عمر کی حکومت میں فیصلہ سازی میں کوئی اختیار حاصل تھا، نہ ہی سفری دستاویزات، موجودہ رجیم میں القاعدہ کے اتحادیوں کی لمبی فہرست ہے، جو صرف پناہ گزین دوست نہیں، حکومت کا حصہ ہیں اور دہشت گردوں کو افغان سفری دستاویزات تک رسائی بھی حاصل ہے۔ یہ گروہ تربیتی کیمپ قائم کرنے اور عسکری مشقیں انجام دینے کے لیے خاطر خواہ جگہ اور جغرافیائی سہولت رکھتے ہیں، اور خود کو مسلح اور مضبوط بنانے کے لیے وافر مالی اور اسلحہ جاتی وسائل سے بھی لیس ہیں کیونکہ وہ ایک ایسے نظام کا حصہ ہیں جو ریاست کے وسیع وسائل کا حامل ہے۔ فی الحال صرف افغانستان اور پاکستان کے عوام اس بزدلانہ رجیم کی دہشت گردی کے تلخ اثرات بھگت رہے ہیں، مگر زیادہ دیر نہیں لگے گی کہ دنیا بھی افغانستان کو ایک مکمل دہشت گرد گروہ کے حوالے کرنے کے نتائج محسوس کرنے پر مجبور ہوگی، اور اس وقت تک شاید بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

اپنے توسیع پسند جہادی عزائم کے علاوہ طالبان افغانستان میں موجود دہشت گرد گروپوں کو ممکنہ اندرونی بغاوتوں کو دبانے کے لیے بھی استعمال کر رہے ہیں۔ غیر ملکی دہشت گردوں کو افغانستان کے شمالی، شمال مشرقی اور مغربی علاقوں میں منتقل کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ جہاں طالبان نسلی بنیاد پر نسبتاً کمزور ہیں، وہاں ان کے ذریعہ سے قوت قائم رکھی جا سکے۔

## امت واحدہ پالیسی

القاعدہ اور طالبان کے تعلقات کبھی کمزور نہیں ہوئے، لیکن 2023 کے آغاز میں القاعدہ کے ملا ہیبت اللہ کے ساتھ اقتدار میں حصہ دار بن جانے کے بعد 2024 کے شروع میں طالبان نے ایک ایسی خطرناک پالیسی اختیار کی جس نے افغانستان کو عالمی دہشت گردی کا مرکز بنا کر رکھ دیا ہے، اس پالیسی کو ''امت

واحدہ‘‘ کا نام دیا گیا ہے۔اس پالیسی کے تحت القاعدہ اور دنیا بھر میں اس کے اتحادی دہشت گرد گروپوں کو افغانستان میں خوش آمدید کہا جا رہا ہے، ان کی قیادت کو یہاں قیام اور وقت گزارنے کی اجازت بھی دی جا رہی ہے۔امت واحدہ کمیٹی جس میں طالبان کے ساتھ ساتھ القاعدہ کے لوگ بھی شامل ہیں، جن لوگوں کی سفارش کرتی ہے، انہیں افغان سفری دستاویزات اور افغان شہریت دینے کا فیصلہ بھی شامل ہے۔

باہمی اختلافات کے باوجود اس پالیسی پر طالبان کے سربراہ ملا ہیبت اللہ، حقانی گروپ کے سربراہ سراج حقانی، وزیر دفاع ملا یعقوب اور جی ڈی آئی کے نائب سربراہ ملا تاج میر جواد ایک پیج پر ہیں۔اس منصوبے کے تحت رازداری کا یہ عالم ہے کہ ان چاروں کے سوا طالبان کی صفِ اول کی قیادت کو بھی اس منصوبے اور آنے والے مہمانوں کی تفصیلات سے لاعلم رکھا جاتا ہے۔

طالبان اس منصوبے کے ذریعے بیک وقت تین مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں:

1۔ان تنظیموں سے وابستہ فنڈنگ افغانستان آئے گی، جس سے افغان معیشت کو تقویت ملے گی۔

2۔تنظیموں کی قیادت کو تحفظ فراہم کیا جائے گا، جس پر وہ دنیا بھر میں طالبان کے معاون ثابت ہوں گے۔

3۔طالبان ان گروپوں کو اپنے پراکسی کے طور پر استعمال کر کے عالمی سطح پر ایک قوت کے طور پر ابھر سکیں گے اور دوست و دشمن ممالک کے ساتھ معاملات میں ان پر اپنا کنٹرول بطور سودے بازی استعمال کر سکیں گے۔سینیئر طالبان قیادت سے ایک جملہ تسلسل سے سنا گیا کہ ’’ہم امن فروخت کریں گے، جو ہمارے ساتھ درست رہے گا، اسے امن فراہم کیا جائے گا‘‘۔اس کا مطلب صاف ظاہر ہے، جو بلیک میلنگ نہیں مانے گا، اسے امن سے نہیں رہنے دیا جائے گا۔

## عالمی دہشت گردوں کی محفوظ پناہ گاہ

افغان طالبان کی امتِ واحدہ پالیسی کے تحت 2024 کی آخری ماہی سے دنیا بھر میں پھیلے دہشت گردوں کی افغانستان منتقلی کا عمل شروع ہوا، جن میں القاعدہ، اسلامی موومنٹ آف ازبکستان (آئی ایم یو)، ایغور دہشت گرد تنظیمیں ای ٹی آئی ایم وغیرہ اور وسطی ایشیائی جہادی نیٹ ورکس سے وابستہ بلیک لسٹ دہشت گرد شامل ہیں۔جبکہ ٹی ٹی پی پہلے سے ہی افغان طالبان کی سکیورٹی پالیسی کا حصہ ہے۔باہر سے آنے والے ان دہشت گردوں کو مختلف صوبوں میں سرکاری رہائش گاہیں، محفوظ ٹھکانے اور تربیتی کیمپ فراہم کیے گئے ہیں۔ان دہشت گردوں کو ڈیل کرنے کی خاطر جی ڈی آئی کے اندر ’’امت واحدہ سیل‘‘ قائم کیا گیا ہے،

جوانہیں باقاعدہ رجسٹرڈ کرتا ہے، اور انہیں تمام سہولیات کی فراہمی کو یقینی بناتا ہے۔

منتقلی کا عمل منظم منصوبہ بندی کے تحت مکمل کیا گیا ہے جس کا مقصد افغانستان کو عالمی جہادی نیٹ ورک کا محفوظ مرکز بنانا ہے۔ اس وقت تک جو لوگ افغانستان پہنچ چکے ہیں، ان میں مصر، لیبیا، سعودی عرب، ملائیشیا، یمن، عراق، صومالیہ، تاجکستان، ازبکستان، چین کے ایغور علاقوں، ترکمانستان، مراکش اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے دہشت گرد گروپوں کی اعلیٰ قیادت شامل ہے۔ انفرادی طور پر جن لوگوں کے نام سامنے آئے ہیں، حیرت انگیز طور پر ان میں داعش دہشت گرد بھی شامل ہیں، کیونکہ داعش کے حوالہ سے طالبان کی پالیسی وہ نہیں جو عالمی سطح پر بیان کی جاتی ہے۔ طالبان داعش کے دشمن نہیں بلکہ سہولت کار ہیں اور اپنے اس عمل کو پروپیگنڈے کی آڑ میں چھپانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں داعش کے جو گروپ خود کو جی ڈی آئی سے رجسٹرڈ کرواتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ وہ افغانستان میں کوئی کارروائی نہیں کریں گے، انہیں کچھ نہیں کہا جاتا۔ اسی پالیسی کے تحت داعش خراسان کے وسطی ایشیا آپریشنز کا سربراہ اور سابق فوجی کمانڈر منصور گلمر ادخلیموف تخار میں موجود ہے، یہاں سے تاجکستان اور ازبکستان سمیت وسطی ایشیائی ریاستوں میں کارروائیوں کی نگرانی کر رہا ہے۔ القاعدہ کا نائب سربراہ سیف العدل (مصری) پہلے ہرات میں مقیم تھا عارضی طور پر ایران منتقل کیا گیا، اس کا نیٹ ورک ہرات اور کابل میں فعال ہے۔ القاعدہ کے CBRN پروگرام کا سربراہ اور بائیو کیمسٹ یزید صفت (ملائیشین) کو ننگرہار، کنڑ اور خوست میں محفوظ ٹھکانے فراہم کیے گئے ہیں۔

القاعدہ کے خفیہ آپریشنز کے سربراہ اور انصار الشریعہ لیبیا کا نائب کمانڈر عبدالعظیم علی موسیٰ بن علی (لیبین شہری) خوست اور پکتیا میں سرگرم ہے۔ جماعت انصار اللہ تاجکستان کا سربراہ مہدی ارسلان (تاجک) بھی تخار میں موجود ہے۔ تحریک طالبان پاکستان کی مکمل قیادت افغانستان میں موجود ہے۔ ٹی ٹی پی کا سربراہ مفتی نور ولی محسود اور دیگر تمام بڑے دہشت گرد کابل میں رہائش رکھتے ہیں۔

حافظ گل بہادر خوست اور کابل میں مقیم ہے۔ وسطی ایشیائی اور ازبک نیٹ ورکس میں سے آئی ایم یو کا نائب سربراہ سید اجمل یولداش قندوز اور جوزجان میں جبکہ عسکری نائب عثمان الازبکی بھی جوزجان میں موجود ہے۔ ایغور تنظیم ٹی آئی پی کا سربراہ عبدالحق ترکستانی کابل اور بغلان میں مقیم ہے اور اس کے طالبان قیادت کے ساتھ قریبی تعلقات ہیں۔ اس کا آپریشنل سربراہ حاجی فرقان بدخشان میں ہے۔

جماعت انصار اللہ تاجکستان کا سربراہ حاجی ابراہیم تاجک قندوز میں ہے، ابوعبداللہ (شامی نژاد) سابق سربراہ HTS شریعہ کونسل ہرات میں ہے۔ ان سربراہان کے ساتھ ساتھ ہزاروں کی تعداد میں دہشت گرد بھی افغان سرزمین پر موجود ہیں، انہیں افغانستان کے صوبہ زابل، کابل، پنجشیر، ہلمند، ہرات، ننگرہار، کنڑ، قندھار، بدخشان، بلخ، نیمروز اور سمنگان میں رکھا گیا ہے، بلکہ سمنگان کا ضلع ایک دہشت گردی کے ایک نئے مرکز کے طور پر سامنے آرہا ہے۔ ان تمام غیر ملکی دہشت گردوں کو نہ صرف سرکاری رہائش فراہم کی گئی ہے بلکہ الگ محفوظ ٹھکانے، تربیتی سہولیات اور محفوظ نقل وحرکت کے راستے بھی مہیا کیے گئے ہیں۔ کئی افراد کو سینئر طالبان کمانڈرز کی براہ راست سرپرستی حاصل ہے، جو اس بات کی واضح نشاندہی کرتا ہے کہ یہ صرف پناہ دینا نہیں بلکہ منظم آبادکاری ہے۔

سیکیورٹی ذرائع کے مطابق امتِ واحدہ سیل کے ذریعے ان عناصر کی رجسٹریشن، رہائش، خوراک، سیکیورٹی اور آپریشنل سہولیات کا مکمل انتظام کیا گیا ہے۔ اسی نیٹ ورک کے ذریعے وسطی ایشیا، برصغیر، چین کے ایغور علاقے، مشرق وسطیٰ اور افریقہ میں رابطہ کاری بھی برقرار رکھی جارہی ہے۔ عالمی دہشت گرد افغانستان کیسے پہنچے؟ ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ ہیبت اللہ رحیم کے دہشت گردوں کا سہولت کار ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن دنیا کے کونے کونے سے یہ ہزاروں دہشت گرد افغانستان پہنچے کیسے؟ انہیں راستے میں کسی نے روکا کیوں نہیں؟ اس سوال کا جواب خود جی ڈی آئی کے ایک سیل 08 کی ایک انکوائری رپورٹ میں موجود ہے، یہ انکوائری رپورٹ ملا ہیبت اللہ کی جانب سے خفیہ قرار دے دی گئی ہے اور اس حوالہ سے تحقیقات کو روک دیا گیا ہے، فروری 2024 میں اس انکوائری کو ختم کرنے کے حکم نامے میں ملا ہیبت اللہ نے بھی کہا تھا کہ آئندہ پاسپورٹ اور تذکرہ (شناختی کارڈ) سے متعلق کوئی بھی انکوائری صرف ملا ہیبت اللہ سیکرٹریٹ کی منظوری سے ہوگی۔

جی ڈی آئی نے یہ انکوائری ستمبر 2024 میں منظر عام پر آنے والے افغانستان میں پاسپورٹس اور ویزہ سکینڈل پر شروع کی تھی ہے، چونکہ 27 فروری 2025 کو ملا ہیبت اللہ کے سیکرٹریٹ کی جانب سے حکم جاری کیا گیا کہ اس سکینڈل سے متعلق تمام قسم کی تحقیقات فوری طور پر روک دی جائیں۔ اس لئے اس میں صرف فروری 2024 تک کے حقائق شامل ہیں، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے بعد اب تک کیا صورتحال رہی ہوگی۔ اسی حکم میں یہ بھی کہا گیا کہ پاسپورٹ ڈیپارٹمنٹ اور وزارتِ داخلہ سے تعلق

رکھنے والے وہ تمام افراد، جن کی تعداد ایک سو سے زائد تھی اور جو اس اسکینڈل میں ملوث ہونے کے الزام میں گرفتار کیے گئے تھے، انہیں رہا کر دیا جائے۔

تحقیقات کا آغاز ستمبر میں ترکی میں گرفتار ہونے والے داعش کے دو دہشت گردوں کی نشاندہی پر کیا گیا تھا جس کے پاس افغانستان کے پاسپورٹ تھے، لیکن افغان سفارتخانہ ان کی تصدیق سے انکار کر رہا تھا۔ ذرائع کے مطابق جنرل ڈائریکٹوریٹ آف انٹیلیجنس ( جی ڈی آئی ) کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ جعلی پاسپورٹس کی درست تعداد معلوم کرنا ممکن نہیں، کیونکہ پاسپورٹ آفس کا تمام ریکارڈ دستی (مینول) تھا، جو رجسٹروں میں درج تھا۔ کئی رجسٹر مکمل طور پر غائب تھے جبکہ متعدد کے صفحات پھٹے ہوئے تھے۔ جی ڈی آئی کے اندازے کے مطابق 7000 سے 10 ہزار پاسپورٹس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں تھا۔ ان میں بیرون ملک افغان سفارتخانوں کے ذریعہ سے جاری ہونے والے پاسپورٹس بھی شامل ہیں۔ تحقیقات میں کہا گیا تھا کہ یہ اعداد و شمار صرف ایک محتاط اندازہ ہے، اصل اس سے کئی گنا زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ تحقیقات میں پاسپورٹ عملے سے تفتیش کی اجازت طلب کی گئی تھی اور یہ شبہ ظاہر کیا گیا تھا کہ چوری شدہ پاسپورٹس دو طریقوں سے جاری کیے گئے: اول، سابقہ حکومت کے ملازمین کے ذریعے، جو طالبان کے اقتدار میں آنے کے بعد بھی دفاتر میں کام کرتے رہے۔ انہوں نے اشرف غنی حکومت سے وابستہ افراد کا ریکارڈ مٹا کر ان کی شناخت چھپانی اور بغیر مناسب دستاویزات کے پاسپورٹس جاری کیے۔ دوم، رشوت کے عوض پاسپورٹس جاری کیے گئے۔

جی ڈی آئی نے اپنی کارروائی میں سو سے زائد افراد کو گرفتار کیا، جن میں کابل اور قندھار کے پاسپورٹ دفاتر کے ڈائریکٹرز بھی شامل تھے۔ تاہم فروری کے آخر میں ملا ہیبت اللہ کے حکم پر تحقیقات روک دی گئیں اور تمام گرفتار افراد کو رہا کر دیا گیا۔

ملا ہیبت اللہ کی جانب سے تحقیقات ختم کرنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ تمام پاسپورٹ اور جعلی ویزے طالبان حکومت نے خود القاعدہ، ای ٹی آئی ایم، آئی ایم یو اور دیگر اتحادی دہشت گرد گروپوں کے ارکان کو افغان شہریت دینے کے لیے جاری کیے تھے۔ اگر تحقیقات جاری رہتیں تو ان افراد کی اصل تعداد اور شناخت سامنے آ سکتی تھی، لہذا تحقیقات بند کر دی گئی۔ القاعدہ دہشت گردوں کو پاسپورٹ اور ویزے جاری کرنے کے لئے انتہائی عیاری کے ساتھ ایک حکمت عملی اختیار کی گئی کہ انہیں اصل پاسپورٹ اور

ویزے جاری کر کے، ان کا ریکارڈ ضائع کر دیا گیا تا کہ اگر کوئی عالمی دہشت گرد سفر کے دوران کسی جگہ پکڑا جائے تو افغان حکومت یہ کہہ سکے کہ یہ دستاویزات جعلی ہیں۔ جیسے کہ ترکی میں پکڑے جانے والے داعش کے دو دہشت گردوں کے بارے میں کہا گیا۔ اقوام متحدہ نے بھی جنوری 2025 میں طالبان وزارت داخلہ سے رابطہ کیا تھا اور جعلی پاسپورٹس اسکینڈل کی تحقیقات کے بارے میں معلومات طلب کی تھیں، جس کا جواب نہ دینا تھا نہ دیا گیا۔

## طالبان اور القاعدہ گٹھ جوڑ

طالبان اور افغان حکومت پر ملا ہیبت اللہ کا شخصی استبداد مکمل ہو جانے کے بعد شریک اقتدار القاعدہ نے بھی ہیبت اللہ رجیم کی مشاورت اور معاونت سے افغانستان کو اپنا کمانڈ اینڈ کنٹرول سنٹر قرار دے دیا ہے، اور دنیا بھر میں مشترکہ طور پر جہاد کے نام پر دہشت گردی کی سرپرستی کا ایک فریم ورک جاری کر دیا گیا ہے۔ اس حوالہ سے القاعدہ کی ایک نئی پالیسی افغان طالبان کے دونوں بڑے دھڑوں کی مشاورت سے جاری کی گئی ہے۔ القاعدہ کی نئی پالیسی کا اعلان اور نفاذ نومبر 2025 میں کیا گیا، اس پالیسی کی تیاری کے سلسلے میں القاعدہ کی شوریٰ کی باہمی اور قندھاری گروپ سے تمام مشاورت کا عمل قندھار میں ہیبت اللہ سیکرٹیریٹ میں انجام پایا۔

القاعدہ کی جانب سے شوریٰ کونسل کے سینئر ترین کمانڈر یحییٰ ابوطلحہ عرف یحییٰ الشعمی نے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا اور افغان پاسپورٹ پر مختلف ممالک کے دورے کر کے القاعدہ شوریٰ سے مشاورت کو یقینی بنایا۔ قندھار گروپ کے ذرائع کا انکشاف ہے کہ القاعدہ اور طالبان کے درمیان یہ اتفاق رائے جولائی 2025 میں ہو گیا تھا کہ افغانستان کو القاعدہ کے کمانڈ اینڈ کنٹرول ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کیا جائے گا، بعد کا وقت تفصیلات طے کرنے میں صرف ہوا ہے، کیونکہ القاعدہ شوریٰ کی منظوری لازم تھی۔ اس نئی پالیسی کے تحت فیصلہ کیا گیا ہے کہ:

1۔۔ القاعدہ افغانستان میں ہیبت اللہ کی حکومتی معاملات میں ہر طرح سے معاونت کرے گی۔

2۔۔ افغانستان کو کسی بھی دباؤ سے بچانے کی خاطر القاعدہ اپنے نام سے کارروائیاں نہیں کرے گی۔

3۔۔ دنیا بھر میں موجود اپنی اتحادی تنظیموں کی تربیت، پلاننگ، نگرانی اور کارروائیوں میں ہم آہنگی پیدا کرے گی۔

4۔۔تمام متعلقہ دہشت گرد گروپوں پر مشتمل ایک مشترکہ شوریٰ قائم کی جائے گی۔

5۔۔اتحادی شوریٰ کے فیصلے طالبان کی نامزد کردہ کمیٹی کے ساتھ مشاورت سے کیے جائیں گے۔

اس اتحاد کی بنیاد اس اصول پر رکھی گئی ہے کہ ہر گروہ اپنی کارروائیوں اور مالی معاملات میں خود مختار ہوگا، جبکہ القاعدہ انہیں سرپرستی فراہم کرے گی اور جہاں ضرورت ہوگی وہاں مدد دی جائے گی۔اس حوالہ سے القاعدہ کا ایک اہم اجلاس 10 نومبر کو قندھار میں ہوا،جس میں القاعدہ وفد کی قیادت یحیٰی ابوطلحہ المعروف یحیٰی الشعیبی نے کی۔ان کے ہمراہ دیگر افراد میں عبدالرزاق الکردی المعروف ابومحمد، ابوعبدالرحمٰن، جمعہ خان منصور، مصطفٰی حامد المعروف شیخ ابولید المصری، اور لیبیا سے تعلق رکھنے والے عبدالعظیم علی موسیٰ بن علی شامل تھے۔ان میں عبدالرزاق الکردی پہلے ہی افغانستان میں موجود تھا جبکہ دیگر افراد اکتوبر میں افغانستان پہنچے۔اس اجلاس میں حقانی گروپ کا کوئی نمائندہ شریک نہیں تھا، تاہم اس وفد نے اجلاس سے قبل خوست میں سراج حقانی سے ملاقات کر کے انہیں اعتماد میں لیا تھا۔ ماضی میں بھی جب ہیبت اللہ سیکرٹریٹ مشاورت کی میزبانی کر رہا تھا، سراج حقانی اس مشاورتی عمل کا حصہ رہے ہیں، ان سے رابطہ عبدالعظیم علی موسیٰ بن علی کے ذریعے رکھا جا رہا تھا۔قندھار میں ہونے والے فیصلہ کن اجلاس میں ملا ہیبت اللہ شریک نہیں ہوئے، تاہم اجلاس کی میزبانی اور صدارت ان کی جانب سے ملا محمد علی حنفی المعروف ملا شیرین نے کی۔طالبان کی جانب سے شریک افراد میں: جی ڈی آئی کے نائب سربراہ ملا تاج میر جواد، گورنر کا پیسا قاری بریال، وزیر صحت مولوی نور جلال، اور گورنر پنجشیر آغا حکیم شامل تھے، جو ماضی میں القاعدہ شوریٰ کے رکن رہ چکے ہیں اور اب بھی دوہری نمائندگی رکھتے ہیں۔اجلاس میں القاعدہ قیادت نے طالبان کو سیف العدل اور حمزہ بن لادن کی مشاورت سے تیار کردہ نئی حکمت عملی پر باضابطہ بریفنگ دی۔

اجلاس کے دوسرے روز ملا ہیبت اللہ کی جانب سے اس منصوبے کی منظوری دے دی گئی۔اس کے بعد جی ڈی آئی، وزارت داخلہ، وزارت مہاجرین اور دیگر تمام صوبائی اداروں کو ''امہ واحدہ'' منصوبے کے تحت طالبان کمیٹی کی ہدایات پر عملدرآمد کے احکامات جاری کر دیے گئے ہیں۔طالبان سربراہ نے ''امہ واحدہ کمیٹی'' کے قیام کا نوٹیفکیشن بھی جاری کیا ہے،جس میں نائب وزیر داخلہ ابراہیم صدر، تاج میر جواد، قاری بریال، نور جلال اور آغا حکیم شامل ہیں۔اس کمیٹی کو مکمل اختیارات حاصل ہیں اور یہ القاعدہ سے متعلق کسی بھی معاملے میں ملا ہیبت اللہ کی منظوری کے بغیر فیصلے کر سکتی ہے۔اس کمیٹی کے ساتھ رابطے کے لیے القاعدہ

کی نمائندگی عبدالرزاق الکردی (ابومحمد/ ابوعبدالرحمان/ جمعہ خان منصور) اور عبدالعظیم علی موسیٰ بن علی کریں گے۔ یہ تمام صورتحال بتاتی ہے کہ طالبان حکومت نے کھلے طور پر اپنے عالمی دہشت گرد اتحادیوں کی حمایت کا فیصلہ کرلیا ہے، جس کے تحت طالبان کی حمایت کرنے والے کسی بھی گروہ کو، خواہ وہ ہمسایہ ممالک کے خلاف سرگرم کیوں نہ ہو، افغانستان سے نہیں نکالا جائے گا اور انہیں تعاون فراہم کیا جاتا رہے گا۔ تاہم ان تمام گروپوں کو اس شرط کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے اور طالبان کے تمام احکامات کی پابندی کریں گے۔ یہ فیصلہ سیدھا سیدھا افغانستان کو دہشت گردوں کے مرکز میں بدلنے کی ابتدا ہے۔

## ای ٹی آئی ایم

نومبر 2025 میں تاجکستان میں چینی شہریوں پر ڈرون کے ذریعے دہشت گردانہ حملہ کیا گیا، جس کی ذمہ داری ایک دہشت گرد تنظیم ایسٹ ترکستان لبریشن فرنٹ (ETLF) نے قبول کی۔ یہ نیا نام تھا جس کی تحقیقات کی گئیں تو ایک نئی داستان سامنے آئی کہ چین کی فنڈنگ پر پلنے والے طالبان چین کے دشمنوں کو بھی پناہ دیئے ہوئے ہیں، اور یہ نیا گروہ بھی انہیں پرانے گروپس میں سے ایک کا نیا نام ہے جو دھوکہ دینے کے لئے اختیار کیا گیا۔ اس حوالہ سے سفارتی ذرائع سے دستیاب ہونیوالی ایک انویسٹی گیشن رپورٹ نے طالبان کی جانب سے افغانستان کو دہشت گردوں کے عالمی مرکز میں تبدیل کی پالیسی کے مزید راز کھول دیئے اور اس کے نئے گوشے آشکار کردیئے۔ اس رپورٹ میں قرار دیا گیا کہ ایسٹ ترکستان لبریشن فرنٹ (ETLF) دراصل ایسٹ ترکستان اسلامک موومنٹ ETIM کی ہی ایک توسیع ہے اور اسے القاعدہ کے مشورے سے ایک کور تنظیم کے طور پر قائم کیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق ETIM اور دیگر ایغور دہشت گردوں کو افغانستان کے صوبوں بلخ، بدخشان، بغلان اور کابل میں کیمپ فراہم کیے گئے ہیں اور یہ سلسلہ 2023 سے جاری ہے۔ ابتدا میں انہیں ٹی ٹی پی اور دیگر دہشت گرد تنظیموں کے نام پر چھپایا گیا، لیکن اپریل 2025 کے بعد یہ کیمپ مکمل طور پر ایغور دہشت گردوں کے نام پر فعال کردیے گئے۔ یہ تنظیم ETLF جس نے حالیہ حملے کی ذمہ داری قبول کی، اپنے قیام کے بعد چند کارروائیوں کے بعد زیرزمین چلی گئی تھی۔ ذریعے کے مطابق اب جبکہ چین ETIM کے نام کے حوالے سے انتہائی حساس ہے، لہذا القاعدہ کے مشورے پر ETIM اور ترکستان اسلامک پارٹی (TIP) نے خود پسِ پردہ رہتے ہوئے

ETLF کے نام کو آگے لانے کا فیصلہ کیا ہے۔

ایسٹ ترکستان لبریشن فرنٹ ETLF اور ایسٹ ترکستان لبریشن آرگنائزیشن ETLO دراصل ایک ہی تنظیم کے دو نام ہیں؛ ETLF عسکری کردار کا دعویٰ کرتی ہے جبکہ ETLO سیاسی کردار کی نمائندگی کرتی ہے۔اس تنظیم کی بنیاد 1997 کے لگ بھگ ایک ایغور سیاست دان محمد امین حضرت المعروف عبدالحضرت نے ترکی میں رکھی، جو سیاست سے مایوس ہو چکا تھا۔ بعدازاں وہ وزیرستان میں القاعدہ سے جاملا، جہاں القاعدہ نے مختلف ایغور دہشت گرد تنظیموں کو متحد کیا اور یہ حکمتِ عملی اپنائی کہ ضرورت کے مطابق مختلف ناموں سے انہیں بیک وقت استعمال کیا جائے۔

اسی حکمتِ عملی کے تحت اس وقت ETLF اور ETLO کو غیر فعال کر دیا گیا اور ETIM اور ترکستان اسلامک پارٹی (TIP) کو فعال کیا گیا، جن کی قیادت اس وقت افغانستان میں موجود ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ترکی، قازقستان، کرغزستان، پاکستان اور وسطی ایشیا کے کچھ شہروں میں اس تنظیم کے چھوٹے سیلز بھی قائم کیے جا چکے ہیں، جو بھرتی، رابطہ کاری اور اسلحہ اسمگلنگ کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔2003 میں محمد امین حضرت پاکستان کے وزیرستان میں ایک آپریشن کے دوران مارا گیا۔ اس کے بعد مصری شہری حمید بن محمد المصري المعروف حمید خان/حمید محمد جان نے اس گروہ کی قیادت سنبھالی۔ وہ کیمیائی حملوں اور شہری جنگ کا ماہر تھا اور القاعدہ نے اسے ETLF اور ETLO کے ساتھ منسلک کیا تھا۔تمام ایغور تنظیمیں افغانستان میں منتقل ہو چکی ہیں اور آنے والے ایام میں افغانستان اور اس کے اردگرد ممالک میں چینی مفادات پر حملے کرنے کی منصوبہ بندی کر رہی ہیں، حالیہ حملہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

## شام سے دہشت گردوں کی افغانستان آمد

ایک روسی ویب سائٹ کے مطابق شام سے 2025 میں ساڑھے 8 ہزار سے 9 ہزار دہشت گرد افغانستان آئے ہیں۔ افغانستان واپس آنے والے دہشت گرد روسی، ازبک، تاجک، چینی اور مقامی افغان ہیں۔ ابوبکر بدخشانی ان واپس آنے والوں میں سے ایک اہم کمانڈر ہے، جس کا القاعدہ سے بھی تعلق رہا ہے۔اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق افغانستان کے اندر اور باہر عسکریت پسندوں کے سلیپنگ سیلز سے بھی ہے۔ اس انفارمیشن کو ٹریک کیا گیا تو ہیبت اللہ رجیم کے عالمی دہشت گردی کے رابطوں کے مزید ثبوت سامنے آ گئے۔

ابوبکر بدخشانی ای ٹی آئی ایم اور القاعدہ کا پرانا دہشت گرد ہے، جو شام میں متحرک رہا ہے، اس کا پنجشیر کے گورنر مولوی عبدالحکیم عرف حکیم آغا سے گہرا یارانہ سے گہرا تعلق ہے۔ حکیم آغا کے بارے عام تاثر یہ ہے کہ وہ عرب شہری ہے، القاعدہ کے ساتھ منسلک ہونے کی وجہ سے، طویل عرصے سے افغانستان میں مقیم رہا، طالبان میں شامل ہوا، افغانستان میں شادی کی، 2000ء میں اسے ملا عمر حکومت نے شہریت دی اور اس نے اپنی شناخت تبدیل کر کے خود کو افغان کہلوانا شروع کر دیا، تب یہ گل آغا کہلاتے تھے اور اسامہ بن لادن کے قریب سمجھے جاتے تھے۔

ابوبکر بدخشانی نے افغانستان پہنچ کر پنجشیر کے گورنر حکیم آغا سے رابطے کیے، اس کے ساتھ ساتھ اس نے جماعت الاحرار کے کمانڈر صابر اور ٹی ٹی پی کے مولوی فاروق اور ان کے بیٹے سے بھی ملاقاتیں کیں، یہ سب القاعدہ کے سابق فعال رکن ہیں۔ ابوبکر بدخشانی کے بارے میں تفصیلات بتاتی ہیں کہ وہ القاعدہ کا ایک پرانا دہشت گرد ہے جو اسامہ بن لادن کے قریب رہا ہے۔ القاعدہ نے اسے شام کی جنگ کے ابتدائی دنوں میں وہاں بھیجا تھا۔ وقت کے ساتھ وہ جبہ النصرہ اور دیگر تنظیموں سے وابستہ رہا، کچھ عرصہ شام میں داعش سے بھی اس کے روابط رہے، اور جنگ کے آخری مرحلے میں اس نے حیات تحریر الشام (HTS) میں شمولیت اختیار کی، جہاں اسے احمد الشرع کے قریب سمجھا جاتا تھا۔ تاہم ذریعے کے مطابق وہ جس بھی گروہ کے ساتھ رہا، بنیادی طور پر القاعدہ سے ہی وابستہ رہا۔ اب شامی فوج یا حکومت میں کوئی کردار اختیار کرنے کے بجائے اس نے افغانستان منتقل ہو کر القاعدہ کے نئے منصوبے میں کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

کابل میں غیر ملکی دہشت گردوں سے متعلق جی ڈی آئی کے ذمہ دار نے تصدیق کی ہے کہ بڑی تعداد میں دہشت گردوں کی افغانستان منتقلی 2025 میں اس وقت ہوئی، جب شام کے نئے حکمران نے اقتدار سنبھالنے کے بعد شام میں تمام اقسام کی دہشت گرد تنظیموں پر پابندی لگا دی اور بشار حکومت کے خلاف لڑنے والے دہشت گردوں کو یہ اختیار دے دیا کہ شام میں رہنا چاہتے ہیں شامی فوج میں شامل ہو جائیں یا ہتھیار اور عسکریت پسندی چھوڑ کر پُرامن شہری کے طور پر رہیں، بصورتِ دیگر ملک چھوڑ دیں۔ اس حکم کے بعد بہت تھوڑی تعداد میں ن نے عسکریت چھوڑ کر شامی فوج میں شمولیت اختیار کر لی، اکثریت کو القاعدہ نے افغانستان کا راستہ دکھایا جہاں القاعدہ کے تعاون سے ہیبت اللہ رجیم دہشت گردوں کے

استقبال کا منتظر تھا۔ یوں القاعدہ کے اتحادی دہشت گرد گروپوں سے وابستہ وہ دہشت گرد، جو وسطی ایشیائی ریاستوں، چین اور خلیجی ممالک سے تعلق رکھتے ہیں افغانستان کا رخ کرنے لگے۔ دسمبر 2025 تک کم از کم 6000 سے 7000 دہشت گرد افغانستان پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر نے استنبول سے کابل تک عارضی سفری دستاویزات پر سفر کیا، اور ان کی اکثریت افغان شہریت حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔

یہ انکشاف ہوا ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں دہشت گردوں کی افغانستان منتقلی انٹیلی جنس کے تعاون سے ہو رہی ہے، اور مزید کم از کم 5000 دہشت گردوں کی منتقلی متوقع ہے۔ اس بڑے پیمانے پر آمد کے اخراجات پورے کرنے کے لیے طالبان کو بھاری مالی معاونت بھی فراہم کی گئی ہے۔ اطلاعات کے مطابق طالبان قیادت افغانستان میں اس بڑی تعداد میں دہشت گردوں کی آمد کو ایک موقع کے طور پر دیکھتی ہے، ان کا خیال ہے کہ ان کے ساتھ مالی وسائل بھی آئیں گے۔ طالبان اپنی ''امتِ واحدہ'' پالیسی کے تحت آنے والے دہشت گردوں کا خیر مقدم کر رہے ہیں، اور ان کے انتظام کے لیے ایک باقاعدہ نظام قائم کیا جا چکا ہے، جس کے لیے 13 نومبر 2025 کو ملا ہیبت اللہ کی جانب سے ایک نوٹیفکیشن بھی جاری کیا گیا۔

اس نوٹیفکیشن کے مطابق پنجشیر کے گورنر، ملا عبدالحکیم المعروف حکیم آغا، کو طالبان حکومت کی طرف سے کوآرڈینیٹر مقرر کیا گیا ہے اور فیصلہ کیا گیا ہے کہ نئے آنے والے تمام دہشت گردوں کو پنجشیر میں آباد کیا جائے گا۔ جو دہشت گرد فعال دہشت گرد کارروائیوں میں حصہ لینا چاہتے ہیں، انہیں بلخ، بدخشان، بغلان اور دیگر شمالی صوبوں میں ای ٹی آئی ایم کے لیے قائم کیمپوں میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ حکیم آغا کی سربراہی میں قائم ذیلی کمیٹی شام سے آنے والے دہشت گردوں سے متعلق تمام امور کی نگرانی کرے گی اور ''امتِ واحدہ'' کمیٹی کو جواب دہ ہوگی۔ تاکہ ان غیر ملکی دہشت گردوں کے معاملات سنبھالے جا سکیں۔ ابو بکر بدخشانی کو شام سے آنے والوں کے ساتھ رابطہ کاری کی ذمہ داری دی گئی ہے۔ مقامی سطح پر جماعت الاحرار کے کمانڈر صابر، ٹی ٹی پی کے مولوی فاروق اور اس کے بیٹے ابو حنظلہ فاروق کو بھی شامل کیا گیا ہے، کیونکہ یہ تینوں القاعدہ سے تربیت یافتہ اور سرگرم ارکان رہے ہیں۔

افغان شہریت کے حوالے سے سخت پالیسی اختیار کی گئی ہے، کہا گیا ہے کہ ہر کسی کو شہریت نہیں دی جائے گی اس کا طریقہ کار یہ ہوگا کہ القاعدہ کمیٹی، جس کی سربراہی یحییٰ ابو طلحہ المعروف یحییٰ الشعبی کر رہا ہے، اس کی سفارش کے بغیر کسی کو شہریت نہیں دی جائے گی۔ شام سے دہشت گردوں کی آمد جون 2025 سے جاری

ہے، ابوبکر بدخشانی اکتوبر کے دوران کابل پہنچا۔

غیر ملکی دہشت گردوں کی افغانستان منتقلی اور ان کا طالبان کے زیرِ کنٹرول انضمام خطے کے سیکیورٹی اور سیاسی توازن کو عدم استحکام سے دوچار کر سکتا ہے۔ دہشت گردوں کی نقل و حرکت کی سہولت کاری اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بعض ریاستیں اور انٹیلی جنس ادارے براہِ راست دہشت گردوں کی نقل و حرکت میں ملوث ہیں، جس سے افغانستان میں دہشت گرد تنظیموں کی موجودگی مزید مضبوط ہو رہی ہے۔ طالبان نے نئے آنے والے دہشت گردوں کو شامل کرنے کے لیے ایک باقاعدہ اور منظم نظام قائم کر لیا ہے، جس کے تحت قیادت مقرر کی گئی ہے اور رہنمائی و نگرانی کے لیے مخصوص کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں۔ افغان شہریت سے متعلق سخت پالیسیاں اور مخصوص علاقوں میں رہائش کی تقسیم ظاہر کرتی ہے کہ طالبان اس عمل پر منظم انداز میں کنٹرول اور اثر و رسوخ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

یہ صورتحال نہ صرف افغانستان میں دہشت گردی کی صلاحیت کو مضبوط بناتی ہے بلکہ اس بات کے امکانات بھی بڑھاتی ہے کہ افغان سرزمین غیر ملکی جہادیوں کا مضبوط گڑھ بن جائے۔ اس طرح کی پیش رفت وسطی ایشیا کے لیے سنگین سکیورٹی خطرات پیدا کر سکتی ہے، کیونکہ افغانستان میں مضبوط ہونے والا دہشت گرد نیٹ ورک پڑوسی ممالک تک بھی اثر انداز ہو سکتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ رجحان وسیع علاقائی سطح پر ایک بڑا خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔ تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ اقوامِ متحدہ اور SIGAR کی یہ رپورٹ ایک حد تک درست ہے کہ "اس وقت افغانستان میں تقریباً 13 ہزار غیر ملکید ہشت گرد موجود ہیں، جن میں 6 ہزار سے زائد ٹی ٹی پی، 3 ہزار کے قریب داعش خراسان کے دہشت گرد، اس کے علاوہ القاعدہ، اے کیو آئی ایس، وسطی ایشیائی اور مشرقِ وسطی کے تجربہ کار داعش اور دیگر جہادی تنظیموں کے سینکڑوں کارکن شامل ہیں۔ صوبہ قندوز ان کا مرکزی ٹھکانہ بنتا جا رہا ہے۔" اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے، اور صرف قندوز نہیں، پورا شمالی افغانستان ان دہشت گرد تنظیموں کے کنٹرول میں دیا جا رہا ہے، جہاں سے وسط ایشیائی ریاستوں سے لے کر ماسکو تک خطرے کے اولین دائرے میں شامل ہیں۔

## ہیبت اللہ کے ای ٹی آئی ایم سے تعلقات

ای ٹی آئی ایم کی دہشت گرد قیادت سے طالبان کے رابطے 2025 میں شام سے نکالے جانے کے بعد اچانک نہیں ہوئے، بلکہ وہ 2024 سے یہ ملاقاتیں شروع کر چکے تھے، یعنی تیاری پہلے سے جاری تھی کہ

چین کو کس طرح سے دھوکہ دیا جاتا ہے۔اس حوالہ سے مصدقہ اطلاعات یہ ہیں کہ چینی علیحدگی پسند ایغور مسلم تنظیم ترکستان اسلامی پارٹی کے سربراہ عبدالحق ترکستانی اور ایک اور علیحدگی پسند ایغور تنظیم حزب اسلامی ترکستان کے نائب صدر عبدالسلام ترکستانی نے طالبان رہنما ملا ہیبت اللہ سے قندھار میں ملاقات کی۔ یہ دونوں رہنما یکم اکتوبر 2024 سے قندھار میں موجود تھے، جہاں انہوں نے دیگر طالبان رہنماؤں بشمول ملا تاج میر جواد، جو جی ڈی آئی کے نائب سربراہ ہیں، اور ملا شیریں، قندھار کے گورنر اور ملا ہیبت اللہ کے قریبی ساتھی، سے ملاقاتیں کیں، بعد ازاں 8 اکتوبر کو یہ ملاقات ملا ہیبت اللہ سے ہوئی، جو نماز ظہر کے بعد شروع ہوئی اور عصر تک جاری رہی۔اس کے بعد یہ دونوں قافلہ بغلان گئے، جہاں ان کے دیگر رکن جماعت سے ملاقات ہوئی۔ ان کے اہل خانہ بغلان کے شہر میمنہ میں مقیم ہیں، یہ عبدالحق ترکستانی کی ملا ہیبت اللہ کے ساتھ دوسری ملاقات تھی۔

پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب ملا ہیبت اللہ یکم تا 8 ستمبر شمالی افغانستان کا دورہ کر رہے تھے۔عبدالحق اگست کے وسط میں ترکی سے افغانستان آئے، جبکہ ترکستان کے دوسرے رہنما عبدالسلام ترکستانی ستمبر کے آخری ہفتے میں ترکی سے افغانستان پہنچے اور اسی وقت دونوں قندھار میں ملاقات کے لیے پہنچے، یہ دونوں رہنما اس ملاقات کے لئے ہی ترکی سے آئے اور اس انہیں اس کی دعوت خود ملا ہیبت اللہ کی جانب سے دی گئی تھی۔اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ETIM کے دو رکن بھی قندھار گئے تھے، جن میں حمزہ ازبک اور یحییٰ اویغور شامل تھے، لیکن انہوں نے ملا ہیبت اللہ سے ملاقات نہیں کی بلکہ عبدالحق ترکستانی سے ملاقات کی اور انہیں بھی دعوت دی گئی۔

## القاعدہ کے پرانے دہشت گرد غزنی منتقل

امۃ واحدہ کمیٹی بن جانے کے بعد القاعدہ کے لوگ مسلسل افغانستان پہنچ رہے ہیں، اکتوبر اور نومبر 2025 کے دوران بھی القاعدہ کے کم از کم پچیس سے تیس نئے دہشت گرد افغانستان میں داخل ہوئے۔انہیں پہلے پندرہ دن کے لیے قندھار میں قائم اس عبوری کیمپ میں رکھا گیا جو القاعدہ کے مہمان مجاہدین کے لیے مخصوص ہے۔ بعد میں انہیں عارضی طور پر غزنی کے شمالی دیہی علاقے میں ایک پرانے کیمپ منتقل کیا گیا۔ یہ وہی کیمپ ہے جسے اس سے پہلے حمزہ بن لادن بھی استعمال کرتا رہا۔ پہلے اس کیمپ کی سیکیورٹی حقانی نیٹ ورک کے پاس تھی، لیکن اس نئی آمد کے بعد سیکیورٹی ایک مشترکہ ٹیم کے حوالے کر دی گئی ہے جس میں

جی ڈی آئی اور القاعدہ دونوں شامل ہیں۔ اس کی نگرانی اس مشترکہ کمیٹی کے پاس ہوگی جس کا اعلان ملا ہیبت اللہ نے 16 نومبر کو کیا تھا۔ اور جس میں القاعدہ کی نمائندگی اس کی سینئر شوریٰ کے رکن یحییٰ ابوطلحہ عرف یحییٰ الشعیبی کو دی گئی ہے۔ یہ نئے گروہ مختلف تاریخوں اور مختلف راستوں سے افغانستان پہنچے۔ ان میں سے کچھ افراد امت واحدہ پالیسی کے تحت افغان شہریت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے کم از کم پانچ افراد کی شناخت کی تصدیق ہو چکی ہے۔ شیخ ابو ولید الراحمی اصل نام مصطفیٰ حامد عرف ابو ولید المصری، مشہور اور پرانا القاعدہ رہنما ہے۔ اقوام متحدہ کی رپورٹس میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ ابتدائی دور کے میڈیا مینیجرز میں شمار ہوتا ہے۔ مصر میں صحافت سے وابستہ رہا۔ نوے کی پوری دہائی افغانستان میں گزاری، عمر رسیدہ ہے اور غالب امکان ہے کہ اب افغانستان میں پرسکون پناہ چاہتا ہے۔ اسامہ بن محمد عرف ابو محمد المقدسی عرف شیخ ابو محمد قاسم فلسطینی نژاد، القاعدہ کے عسکری ڈھانچے کا حصہ نہیں رہا مگر دعوتی سرگرمیوں میں فعال ہے۔ حماس کا سخت مخالف بھی ہے۔ عراق سے ایران کے راستے افغانستان پہنچا۔ اس کے ساتھ آنے والے دیگر افراد کی شناخت تا حال ممکن نہیں ہو سکی۔ ابو اسحاق الحریری مصری نژاد اندازاً عمر پینتالیس سے پچاس سال ہے، یہ بندہ القاعدہ جزیرہ نما عرب (AQAP) سے وابستہ ہے، اسے سیف العدل کی ہدایت پر بلایا گیا ہے۔ فہد محمد بشعیبہ عمر، عبدالعزیز 2001 میں القاعدہ کی مالیاتی ٹیم کا حصہ تھا 2007 تک پاکستان کے قبائلی علاقوں میں بھی موجود رہا جہاں اس کے رابطے TTP سے بھی رہے۔ پاکستان نے بھی اسے دہشت گرد قرار دے رکھا ہے، سعودی شہری ہے اور خاصا مالدار ہے، تاہم اس وقت یمنی پاسپورٹ استعمال کر رہا ہے۔ افغان شہریت بھی چاہتا ہے۔ ان ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ القاعدہ اپنے پرانے اور اہم افراد کو افغانستان منتقل کر رہی ہے تاکہ یہ افراد محفوظ رہیں اور ساتھ ہی تنظیم کی پالیسی، نظریاتی تربیت اور میڈیا حکمت عملی میں کردار ادا کریں۔ طالبان کی حکمت عملی بھی واضح دکھائی دیتی ہے۔ وہ غیر ملکید ہشت گردں، خصوصا مالی طور پر مضبوط القاعدہ ارکان کو شہریت دے کر اپنے مالی مستقبل کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے انہیں ایسے وسائل مل سکتے ہیں جن کی وہ اس وقت شدید کمی کا شکار ہیں۔ افغانستان اس وقت کئی گروپوں کی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ القاعدہ اپنے سابقہ ڈھانچے کو دوبارہ ترتیب دے رہی ہے جبکہ طالبان اس صورت حال کو مکمل طور پر روکنے کے بجائے اسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

## القاعدہ برصغیر مستقبل کا بڑا خطرہ:

افغانستان میں القاعدہ برصغیر مستقبل کے لیے بڑا خطرہ بنتی دکھائی دے رہی ہے۔ القاعدہ قیادت اور طالبان کی جانب سے نئی بھرتیاں اور القاعدہ کے بعض ماہر دہشت گردوں کو القاعدہ برصغیر میں منتقل کرنے کا سلسلہ تیزی سے جاری ہے۔ ذرائع سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق صوبہ ننگرہار، کنڑ اور خوست کے ساتھ ساتھ پنجشیر، تخار اور نیمروز میں القاعدہ برصغیر کے تربیتی کیمپ آباد ہو چکے ہیں، اور خطے میں دہشت گردی کے لیے متحرک تمام تنظیموں کے ساتھ القاعدہ برصغیر کی کوارڈینیشن قائم کروائی گئی ہے۔ ان میں پکتیا اور خوست ریجن میں جماعت الاحرار، نورستان اور کنڑ ریجن میں داعش کے افغان جی ڈی آئی کے ساتھ رجسٹرڈ گروپس، شمالی افغانستان میں آئی ایم یو، ٹی ٹی پی اور ای ٹی آئی ایم شامل ہیں، جبکہ پنجشیر میں القاعدہ برصغیر کی مرکزی قیادت اور تعیناتی کے منتظر غیر ملکی دہشت گردوں کو رکھا جا رہا ہے۔ اسے القاعدہ برصغیر کا گیسٹ ہاؤس بھی کہا جا سکتا ہے، جبکہ اس کا آپریشنل ہیڈکوارٹر درہ نور، صوبہ ننگرہار میں ہے۔ مرکزی امیر اسامہ محمود خود اس مرکزی کیمپ کی نگرانی کرتا ہے، اس کی رہائش کابل کے علاقے پل خمری میں ہے۔

القاعدہ برصغیر کے معاملات کی نگرانی اور رابطہ کاری کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی ہے، جس میں القاعدہ اور طالبان کے درمیان قائم امت واحدہ کمیٹی میں سے القاعدہ کے یحییٰ ابوطلحہ عرف یحییٰ الشعبی اور عبدالرزاق الکردی عرف ابومحمد، عرف ابوعبدالرحمٰن، عرف جمعہ خان منصور شامل ہیں، جبکہ طالبان کی جانب سے گورنر پنجشیر محمد آغا حکیم شامل ہیں۔ تمام متعلقہ صوبائی گورنروں کو بھی ان تمام دہشت گردوں کے ساتھ تعاون کرنے اور ان کے مسائل ترجیحی بنیادوں پر حل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ القاعدہ کا ایک پرانا دہشت گرد محمد جعفر جمال القحطانی دسمبر کے آخر یا جنوری میں افغانستان پہنچا ہے۔ اسے القاعدہ نے القاعدہ برصغیر کے تمام کیمپس کا کوارڈینیٹر مقرر کر دیا ہے۔ محمد جعفر جمال القحطانی سعودی عرب کا شہری ہے، طویل عرصہ افغانستان میں رہا، گرفتار ہوا، 2005 میں بگرام جیل سے فرار ہونے والے القاعدہ گروپ میں سے اب تک واحد زندہ بچنے والا شخص ہے۔ نومبر 2006 میں خوست میں دوبارہ گرفتار ہوا تھا، اپریل 2007 میں افغان حکومت نے اسے سعودی عرب کے حوالے کر دیا تھا، جس کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں آئی۔ 2015 میں سعودی حکومت کے ایما پر شام جانے والوں میں یہ بھی شامل تھا، جہاں یہ کچھ عرصہ سعودی حمایت یافتہ

تنظیم میں رہنے کے بعد القاعدہ میں واپس چلا گیا۔2022 کے بعد سے ترکی میں تھا، اب بذریعہ ہوا ترکی سے افغانستان آیا ہے۔اس کے لیے افغان شناختی دستاویز (تذکرہ) کی بھی منظوری دی جا چکی ہے۔

اطلاعات کے مطابق القاعدہ برصغیر کے تربیتی مراکز تیزی سے قائم کیے جا رہے ہیں۔ان میں برمل پکتیا میں جماعت الاحرار کا ایک دہشت گردی کا مرکز اس وقت جماعت الاحرار اور القاعدہ برصغیر کے درمیان مشترکہ طور پر کام کر رہا ہے، جہاں القاعدہ برصغیر کی جانب سے ابو اخلاص مصری کو انچارج بنایا گیا ہے، جو پہلے بھی طویل عرصہ یہاں گزار چکا ہے۔ مارچ میں پاکستان کی جانب سے دہشت گردی کے کیمپوں کے خلاف کارروائی کے دوران یہ کیمپ بھی جزوی طور پر تباہ ہوا ہے۔

ہلمند کے ضلع دشو میں پہلے سے موجود القاعدہ کے ایک رہائشی کیمپ کو القاعدہ برصغیر کے تربیتی کیمپ میں بدل دیا گیا ہے، اور اس کا انچارج ایک فلسطینی شہری ابو بکر محمد کو بنایا گیا ہے، جسے حال ہی میں القاعدہ سے القاعدہ برصغیر میں ٹرانسفر کیا گیا ہے۔نورستان میں ان کا کیمپ وانات میں بنایا گیا ہے، یہ بھی ماضی میں القاعدہ کا رہائشی کیمپ تھا، اب اسے برصغیر والوں کو دے دیا گیا ہے۔نیمروز میں القاعدہ برصغیر کے کیمپ کی درست لوکیشن معلوم نہیں ہو سکی، لیکن یہ کیمپ القاعدہ برصغیر اور ایران مخالف دہشت گردوں کے اتحاد JMM کے مشترکہ استعمال میں ہے، اور اس کا انچارج سراج ابو محمد کردستانی کو بنایا گیا ہے، اس کی شہریت کنفرم نہیں، لیکن مشہور ہے کہ عراقی شہری ہے۔

پنجشیر میں دشتک گاؤں کے پاس القاعدہ برصغیر کو ایک بڑا مرکز دیا گیا ہے، جو ماضی میں یہاں امریکی فورسز کا علاقائی نوعیت کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ یہ کیمپ بھی ابھی صرف القاعدہ برصغیر کی اعلیٰ غیر ملکی قیادت کی رہائش کے لیے استعمال ہو رہا ہے، اس کیمپ کا انچارج عبدالرحمن فارسی عرف ابو سلمان ہے، جو ایرانی شہری ہے۔ بدخشان میں ان کے پاس ایک بڑا کیمپ یمگان کے علاقے میں ہے، جس کا انچارج صالح محمد عبداللہ عرف ابو مثنی الیمنی ہے۔القاعدہ برصغیر مستقبل میں دہشت گردی کے حوالے سے تیزی سے ابھرتا ہوا ایک بڑا خطرہ ہے۔

## القاعدہ 313 دہشت گردی کی ایک نئی فرنچائز

افغان طالبان اور القاعدہ قیادت کس طرح سے ایک دوسرے کے مقاصد کے لئے کام کرتے ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ طالبان نے القاعدہ اور اس سے منسلک اندہشت گردوں کو، جنہوں نے

طالبان سے بیعت کر رکھی ہے، اپنے مخالفین کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ افغان طالبان نے یہ قدم القاعدہ کی قیادت سے مشاورت کے بعد اٹھایا ہے۔ اس مقصد کے لیے القاعدہ 313 کے نام سے ایک نیا ڈھانچہ قائم کیا گیا ہے۔ اس سے وابستہ دہشت گردوں کو جی ڈی آئی (جنرل ڈائریکٹوریٹ آف انٹیلی جنس) کے انسدادِ دہشت گردی ونگ کے تحت مختلف علاقوں میں تعینات کیا جا رہا ہے اور یہ لوگ افغانستان کے اندر اور باہر طالبان مخالفین کی ٹارگٹ کلنگ میں استعمال ہو رہے ہیں۔ القاعدہ 313 کے تحت ابتدائی مرحلے میں سیکیورٹی کلیئرنس کے بعد 7 دہشت گردوں کو انسدادِ دہشت گردی ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں۔ ان میں سے 5 کا تعلق القاعدہ جبکہ ایک کا تعلق آئی ایم یو (اسلامک موومنٹ آف ازبکستان) سے ہے۔ طالبان نے انہیں ایک یونٹ کی صورت میں تعینات کرنے کے بجائے جی ڈی آئی کے تحت مختلف علاقوں میں پھیلایا ہے، جہاں داعش کے اندر دہشت گردوں کی موجودگی کا خدشہ ہے، جو جی ڈی آئی سے رجسٹرڈ نہیں اور طالبان کے خلاف حملہ آور ہو سکتے ہیں، منصوبے کے مطابق ان کی سرکاری حیثیت کو ظاہر نہیں کیا جائے گا، وہ اپنی سابقہ شناخت برقرار رکھتے ہوئے طالبان مخالف دہشت گردوں کی نشاندہی میں معاونت کریں گے۔ سیکیورٹی کلیئرنس کے بعد تعینات کیے گئے دہشت گردوں کی تفصیلات سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ طالبان رجیم کس طرح سے افغانستان کے اندر اور باہر اپنے مخالفین کے خلاف دہشت گردی کا مرتکب ہو رہا ہے، اور کس سطح کے دہشت گردوں کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے عبدالرحمن فردوس عرف عبدالرحمن بدخشانی نام کا ایک ازبک شہری ہے۔ 2010 تک وہ وزیرستان میں آئی ایم یو کے ساتھ سرگرم رہا۔ بعد ازاں وہ غائب ہو گیا اور 2016 میں شام میں داعش کے ساتھ دیکھا گیا، تاہم وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ 2022 میں افغانستان واپس آیا اور دوبارہ آئی ایم یو میں شامل ہوا، مگر اختلافات کے باعث اس نے عسکریت سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بدخشان میں افغان طالبان سے بیعت کر لی، جہاں وہ مقامی طور پر القاعدہ عناصر کے ساتھ رہنے لگا۔ اب اسے القاعدہ 313 میں شامل کر کے بدخشان میں تعینات کیا گیا ہے، اس کا ٹاسک یہ ہے کہ طالبان مخالف سوچ رکھنے والے ازبک شہریوں کو شناخت کرنا اور ان کا قتل کرنا۔

دوسرا نام سعد ابو حازم عرف ابو حکیم عرف حکیم پنجابی ہے عراقی شہری ہے، عمر تقریباً 50 سال ہے۔ 1990 کی دہائی میں القاعدہ کے ساتھ افغانستان آیا۔ اس نے کنڑ میں ایک پشتون خاندان میں شادی کی اور

پاکستان کے مختلف علاقوں میں بھی کافی وقت گزارا۔ وزیرستان آپریشن اور ایمن الظواہری کی افریقہ منتقلی کے دوران وہ بھی وہاں سے چلا گیا۔ یمن، عراق اور شام میں مقیم رہا۔ 2024 میں افغانستان واپس آیا اور اب اسے اپنے سسرالی علاقے کنڑ میں تعینات کیا گیا ہے، جہاں اس کا مقصد مخبری اور طالبان مخالف عناصر کو تلاش کر کے ٹھکانے لگانا ہے، اس کا ایک دوسرا کام بھی ہے کہ داعش کے باہر سے آنے والے دہشت گردوں سے روابط پیدا کرنا اور انہیں جی ڈی آئی سے منسلک کروانا، اور جو کوئی اس ڈھب پر نہ آئے، اسے قتل کر دینا اس کا ٹاسک ہے۔ حضرت نبی عرف ملا طمانچی پاکستانی شہری ہے۔ 2010 سے پہلے خیبر ایجنسی میں ایک معروف شخصیت تھا، لنڈی کوتل کا رہائشی ہے۔ اب اس کی عمر 55 سال سے زائد ہے۔ نوجوانی میں جے یو آئی سے وابستہ رہا۔ افغانستان پر امریکی حملے کے دوران پہلے حرکت المجاہدین میں شامل ہوا، پھر لشکر اسلام کے خلاف بننے والے گروہ نہی عن المنکر کا حصہ بنا، اور بعد میں ٹی ٹی پی میں شامل ہو گیا۔ 2009 میں القاعدہ میں شامل ہوا۔ 2015 سے لاپتہ تھا اور 2024 میں اچانک افغانستان میں ظاہر ہوا، جہاں اس نے افغان شہریت حاصل کر لی۔ بعد ازاں اسے وزارت مہاجرین کے تحت ایک ایسے شعبے میں تعینات کیا گیا جو طالبان کے حامی غیر ملکید ہشت گردوں کی سہولت کاری کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس وقت وہ قندھار میں القاعدہ 313 کے تحت جی ڈی آئی کے لئے کام کر رہا ہے، اس کا ٹاسک پاکستانیوں کی تلاش ہے، جو کوئی بھی پاکستانی شہری کسی بھی دہشت گرد تنظیم میں ہو، اگر وہ ہیبت اللہ رجیم کے خلاف جذبات رکھتا ہے تو اسے قتل کر دیا جائے گا، بنیادی طور پر فالس فلیگ ٹائپ ذمہ داری ہے تا کہ طالبان کا نام بھی نہ آئے اور بندہ بھی بچ نہ سکے۔ فرسید عرف ظفر ایرانی عرف ابو فارس ایک ایرانی شہری ہے اور طویل عرصہ جنداللہ کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اشرف غنی کے دور میں اس نے ایران سے القاعدہ کے دہشت گردوں کی افغانستان منتقلی میں سہولت فراہم کی۔ 2024 سے افغانستان میں موجود ہے اور ہلمند میں القاعدہ کے کیمپ کا حصہ رہا۔ اب اسے کنڑ کے دیوگل علاقے میں تعینات کیا گیا ہے۔ شیخ ضیاء الدین عرف ابو ضیاء العربی ایک سعودی شہری ہے۔ 1998 میں اس کی ملاقات اسامہ بن لادن کی قندھار میں رہائش گاہ پر ہوئی۔ وہ ان افراد میں شامل تھا جو ایمن الظواہری کے ساتھ یا اس کے بعد افریقہ منتقل ہوئے۔ 2024 میں افغانستان آیا اور قندوز میں القاعدہ کے کیمپ میں قیام کیا۔ اب اسے قندھار کے سرحدی علاقے اسپین بولدک میں تعینات کیا گیا ہے۔ ملا ہیبت اللہ ماضی میں بھی اپنے

اتحادی دہشت گرد گروپوں کو مخالفین کے خلاف استعمال کرتا رہا ہے، پہلے یہ سب انفرادی طور پر ہوتا تھا، اب اس حکمت عملی کو باقاعدہ تنظیمی شکل دے دی گئی ہے۔ یہ ایک اہم سوال ہے کہ بین الاقوامی برادری، خصوصاً ہمسایہ ممالک، طالبان کے نظام میں القاعدہ اور جنداللہ جیسے گروپوں کے دہشت گردوں کی باضابطہ شمولیت کو کس نظر سے دیکھیں گے۔

## خطرے کی گھنٹی

ہیبت اللہ رجیم کی یہ تمام سرگرمیاں یہ بتانے کو کافی ہیں کہ وہ ایک ایسا فسطائی نظام چلا رہے ہیں، جس میں ہر مخالف آواز کو قتل کر دیا جانا ہی حل ہوتا ہے، جس طرح سے عالمی دہشت گرد تنظیموں کو استعمال کیا جا رہا ہے، اس سے یہ خطرہ یقینی ہے کہ خطے کے ممالک میں طالبان کس طرح سے امن دشمنی کر سکتے ہیں۔ طالبان سربراہ ملا ہیبت اللہ صرف ایک شخصی استبداد ہی نہیں چلا رہے بلکہ درجنوں دہشت گرد تنظیموں اور ان کے اندر کئی طرح کے عناصر کو اپنے مقاصد کے تحت استعمال کر کے ایک ایسے طرزِ حکومت کی بنیاد رکھ رہے ہیں کہ جس میں کوئی اعتراض کرنے والی زبان باقی نہ رہے، خطرہ ہے کہ یہ سلسلہ افراد سے نکل کر پڑوسی ممالک میں بڑے پیمانے پر نہ شروع ہو جائے۔ افغان طالبان اور القاعدہ کے باہمی تعلق کی نوعیت اب کسی ابہام کی محتاج نہیں رہی۔ دستیاب معلومات سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان تعلق محض نظریاتی ہم آہنگی تک محدود نہیں بلکہ عملی اور تنظیمی سطح پر ایک مربوط شراکت داری کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

## القاعدہ 313

''القاعدہ 313'' جیسے نئے ڈھانچے کا قیام اسی سمت میں ایک اہم پیش رفت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، جس کے تحت القاعدہ اور اس سے منسلک دہشت گردوں کو افغان طالبان کے سیکیورٹی نظام میں ضم کر کے مختلف علاقوں میں تعینات کیا جا رہا ہے۔ اس انتظام کا بظاہر مقصد مخالف گروپوں کا مقابلہ بتایا جا رہا ہے، لیکن زمینی حقائق اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان عناصر کو نہ صرف خفیہ انداز میں مختلف علاقوں میں پھیلایا گیا ہے بلکہ ان کی شناخت بھی پوشیدہ رکھی گئی ہے، تاکہ وہ بوقت ضرورت مختلف کردار ادا کر سکیں۔ اس حکمتِ عملی کا ایک پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ ایسے افراد کو مخالفین کی نشاندہی اور ان کے خلاف کارروائیوں کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے، جس میں ٹارگٹ کلنگ جیسے اقدامات کے الزامات

بھی شامل ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ان افراد کا پس منظر مختلف دہشت گرد تنظیموں سے جڑا رہا ہے، جن میں القاعدہ، آئی ایم یو اور دیگر گروہ شامل ہیں۔ ان میں سے کئی ایک ماضی میں مختلف تنازعات کا حصہ رہے، ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل ہوتے رہے اور بالآخر ایک نئے فریم ورک کے تحت دوبارہ فعال کر دیے گئے۔ یہ صورت حال اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ طالبان قیادت نہ صرف ایسے عناصر کو قبول کر رہی ہے بلکہ انہیں ایک منظم انداز میں اپنے مقاصد کے لیے بروئے کار بھی لا رہی ہے۔

یہ طرز عمل ایک ایسے حکومتی ڈھانچے کی عکاسی کرتا ہے جس میں اختلاف رائے کے لیے گنجائش کم ہوتی جا رہی ہے۔ اگر کسی نظام میں سیاسی یا نظریاتی اختلاف کا جواب طاقت کے استعمال سے دیا جائے تو وہ نظام بتدریج سخت گیر اور جابرانہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں بھی یہی رجحان دکھائی دیتا ہے کہ سیکیورٹی کے نام پر ایسے اقدامات کیے جا رہے ہیں جن کے اثرات نہ صرف اندرونِ افغانستان بلکہ اس سے باہر بھی محسوس ہو سکتے ہیں۔ علاقائی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ پیش رفت مزید تشویش کا باعث ہے۔ جب مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے دہشت گرد ایک ہی پلیٹ فارم کے تحت متحرک ہوں اور انہیں سرحدی یا حساس علاقوں میں تعینات کیا جائے تو اس کے اثرات لازماً ہمسایہ ممالک تک پہنچتے ہیں۔ ماضی کا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ ایسے نیٹ ورکس سرحدوں کے پابند نہیں رہتے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ مزید برآں، اس حکمت عملی سے یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ فیصلہ سازی کا مرکز محدود ہوتا جا رہا ہے اور طاقت کا ارتکاز چند افراد تک محدود ہو رہا ہے۔ جب مختلف گروپوں اور ان کے افراد کو ایک مرکزی قیادت کے تحت اس انداز میں استعمال کیا جائے تو یہ ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھتا ہے جہاں ادارہ جاتی توازن کمزور اور شخصی اختیار مضبوط ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں شفافیت اور جوابدہی جیسے اصول پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔

## عالمی برادری کے لئے سنجیدہ سوال؛

بین الاقوامی برادری کے لیے یہ ایک سنجیدہ سوال ہے کہ وہ اس صورت حال کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔ اگر کسی حکومت کے اندر ایسے عناصر کو باقاعدہ جگہ دی جائے جن کا ماضی عالمی سطح پر متنازع رہا ہو، تو اس کے اثرات سفارتی تعلقات، سیکیورٹی تعاون اور علاقائی استحکام پر پڑنا فطری امر ہے۔ خاص طور پر ہمسایہ ممالک کے لیے یہ ایک عملی چیلنج بن سکتا ہے، کیونکہ وہ براہ راست ان اثرات کی زد میں آ سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ موجودہ پیش رفت ایک ایسے رجحان کی طرف اشارہ کرتی ہے جس میں طاقت کے استعمال اور

خفیہ نیٹ ورکس پر انحصار بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر یہ سلسلہ اسی انداز میں جاری رہا تو اس کے اثرات صرف افراد تک محدود نہیں رہیں گے بلکہ پورے خطے کی سیکیورٹی اور سیاسی فضا کو متاثر کر سکتے ہیں۔ یہی وہ پہلو ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ایسے ماڈلز دیرپا استحکام کے بجائے مزید پیچیدگیاں پیدا کرتے ہیں۔

## ہیبت اللہ کی استبدادی حکومت کا اصل چہرہ

افغانستان میں طالبان کے دوبارہ برسرِ اقتدار آنے (اگست 2021) کے بعد ملک کی مجموعی صورت حال نہ صرف سیاسی طور پر بلکہ انسانی، معاشی اور سماجی حوالوں سے بھی شدید بحران کا شکار ہو چکی ہے۔ بین الاقوامی اداروں، خصوصاً اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی اداروں کی رپورٹس اس حقیقت کی تصدیق کرتی ہیں کہ افغانستان اس وقت دنیا کے بدترین انسانی بحرانوں میں سے ایک سے گزر رہا ہے۔ ایک ایسا ملک جہاں وسائل کی کمی نہیں، لیکن حکمرانی کی ترجیحات نے عوام کو بنیادی حقوق سے محروم کر دیا ہے۔

اقوامِ متحدہ کے ادارہ برائے خوراک کے مطابق 2025 تک افغانستان کی تقریباً 80 فیصد آبادی انسانی امداد پر انحصار کر رہی ہے۔ یہ شرح دنیا میں کسی بھی ملک کے مقابلے میں انتہائی تشویشناک ہے۔ مزید برآں، تقریباً 2 کروڑ 30 لاکھ افراد شدید غذائی عدم تحفظ کا شکار ہیں، یعنی انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اگلا کھانا کہاں سے آئے گا۔ دیہی علاقوں میں یہ صورتحال اور بھی سنگین ہے، جہاں قحط جیسی کیفیت پیدا ہو چکی ہے۔

صحت کے شعبے کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں۔ ڈبلیو ایچ او کے مطابق افغانستان میں ہزاروں طبی مراکز فنڈز کی کمی کے باعث بند ہو چکے ہیں یا جزوی طور پر کام کر رہے ہیں۔ لاکھوں افراد بنیادی علاج کی سہولت سے محروم ہیں، جبکہ بچوں میں غذائی قلت اور اموات کی شرح خطرناک حد تک بڑھ چکی ہے۔ اندازہ ہے کہ ہر سال ہزاروں بچے صرف اس لیے جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں کیونکہ انہیں بروقت طبی امداد میسر نہیں ہوتی۔ اس سنگین انسانی بحران کے باوجود طالبان حکومت کی ترجیحات سوالیہ نشان بنی ہوئی ہیں۔ مختلف بین الاقوامی رپورٹس نشاندہی کرتی ہیں کہ محدود مالی وسائل میں سے بھی نصف سے زیادہ سیکیورٹی اور عسکری مقاصد (دہشت گردی کہنا زیادہ بہتر ہوگا) پر خرچ ہو رہا ہے۔

ایک ایسے ملک میں جہاں عوام بھوک سے مر رہے ہوں، یہ ترجیح نہ صرف غیر متوازن بلکہ غیر انسانی بھی محسوس ہوتی ہے۔

## بین الاقوامی دہشت کی پناہ گاہ:

مزید تشویشناک پہلو یہ ہے کہ افغانستان ایک بار پھر بین الاقوامی دہشت گرد گروپوں کے لیے محفوظ پناہ گاہ بنتا جا رہا ہے۔ مختلف رپورٹوں میں القاعدہ، داعش خراسان (ISIS-K)، تحریک اسلامی ازبکستان (IMU) اور ایسٹ ترکستان اسلامک موومنٹ (ETIM) جیسے گروپوں کی موجودگی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ گروہ نہ صرف افغانستان میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں بلکہ خطے کے دیگر ممالک کے لیے بھی خطرہ بن رہے ہیں۔

یہ صورتحال اس لیے بھی خطرناک ہے کہ ایک طرف افغان عوام بھوک، بیماری اور بے روزگاری کا شکار ہیں، جبکہ دوسری طرف ریاستی وسائل اور توجہ ایسے عناصر پر مرکوز ہے جو عالمی امن کے لیے خطرہ ہیں۔ اگر ایک حکومت اپنے شہریوں کو بنیادی ضروریات یعنی روٹی، علاج اور تعلیم فراہم کرنے میں ناکام ہو، لیکن غیر ریاستی مسلح گروپوں کو سہولت فراہم کرے، تو اس کی پالیسیوں پر سوال اٹھنا فطری امر ہے۔

## طالبان کی تعلیم دشمنی

تعلیم کے شعبے میں بھی حالات مایوس کن ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم پر پابندیاں، یونیورسٹیوں کی بندش، اور نصاب میں یکطرفہ تبدیلیاں ایک پوری نسل کے مستقبل کو خطرے میں ڈال رہی ہیں۔ UNICEF کے مطابق لاکھوں بچے، خاص طور پر لڑکیاں، اسکول سے باہر ہیں، جس کے طویل المدتی اثرات پورے معاشرے پر مرتب ہوں گے۔ معاشی طور پر افغانستان شدید زوال کا شکار ہے۔ بین الاقوامی پابندیوں، منجمد اثاثوں اور سرمایہ کاری کے فقدان نے معیشت کو مفلوج کر دیا ہے۔ بے روزگاری کی شرح میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور نجی شعبہ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ لوگ اپنی جائیدادیں بیچنے اور حتیٰ کہ بچوں کو مزدوری پر بھیجنے پر مجبور ہیں تاکہ زندہ رہ سکیں۔ المیہ یہ ہے کہ قابض رجیم کو احساس ہی نہیں کہ عام افغان بھوک اور بیماری کے خلاف لڑنے کی سکت کھو چکا،

اور یہ استبدادی نظام دہشت گردوں کے جتھوں کی میزبانی کرنے میں مصروف ہے۔ یہ ہے طالبان رجیم کا وہ اصل چہرہ جسے انہوں نے اسلام اور شریعت کے مقدس ناموں کے پیچھے چھپا رکھا ہے۔

---

# باب پنجم

## طالبان رااتحاد، خطے کے لئے خطرہ

ہیبت اللہ رجیم صرف پاکستان ہی نہیں پورے خطے کے لئے بدامنی، دہشت گردی اور عدم استحکام کا مرکز بنا ہوا ہے۔ سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ دہشت گردی کے لئے ان کے رجحان کو دیکھتے ہوئے، امن دشمن ایجنسیز بھی وہاں پہنچ چکی ہیں، طالبان ان سے ہاتھ ملا چکے ہیں۔ قندھار سے ابھرتی ہوئی دہشت گردی کی یہی نئی صف بندیاں، مختلف نظریاتی پس منظر کی حامل دہشت گردی کی قوتوں کا گٹھ جوڑ اور بھارتی را کی سرپرستی میں طالبان رجیم کا خونی کھیل خطے کی سلامتی کے لئے ایک بڑا خطرہ بن کر سامنے آیا ہے۔

## ٹی ٹی پی اور طالبان ایک سکے کے دو رخ

ٹی ٹی پی کے حوالہ سے ایک بڑی غلطی یہ رہی ہے کہ ہم اسے افغان طالبان سے الگ ایک تنظیم کے طور پر دیکھتے رہے اور توقع رکھتے تھے کہ طالبان حکومت آنے کے بعد انہیں افغانستان میں ٹھکانے دستیاب نہیں ہونگے، کیا علم تھا کہ صرف ٹھکانے ہی نہیں دیں گے بلکہ طالبان پوری طرح سے ان کی حمایت میں کھڑے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹی ٹی پی اور طالبان ایک ہی وجود ہیں، ان میں کوئی تفاوت نہیں، ٹی ٹی پی خود کھل کر ملا ہیبت اللہ کی بیعت کا اعلان کرتی ہے، طالبان کے وزراء اور اہم شخصیات وہی زبان بولتی ہیں، جو ٹی ٹی پی کی ہے بلکہ ٹی ٹی پی کی پلاننگ، ریکروٹمنٹ سے لے کر بیانیہ سازی تک طالبان رجیم پوری طرح سے ان کے ساتھ کھڑا ہے۔ ماضی میں اگر کوئی ابہام تھا بھی تو اب نہیں رہا، ملا یعقوب، ذبیح اللہ مجاہد اور اب وزیر سرحدات علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ وہ ٹی ٹی پی کو دہشت گرد نہیں مانتے، ڈیورنڈ لائن کو سرحد تسلیم نہ کرنا اور ٹی ٹی پی کے ذریعہ دہشت گردی پھیلانے کی دھمکیاں یہ ثابت کرنے کو کافی ہیں کہ کابل حکومت دنیا کو دھوکہ دینے اور عالمی دباؤ سے نکلنے کی خاطر ممکن ہے جھوٹ کا سہارا لے، ٹی ٹی پی کے خلاف کارروائی کا ڈرامہ بھی رچایا جا سکتا ہے، جیسا کہ پہلے کئی بار کیا گیا لیکن حقیقت صرف ایک ہے کہ دونوں ایک وجود ہیں، ایک ہی کھوٹے سکے کے دو رخ۔

## میر علی معاہدہ: درندوں کا اتحاد

تصور کیجئے کہ ایک طرف پاکستان افغانستان سے امریکی انخلاء کے لئے دوحہ مذاکرات میں فریقین کو سہولیات دے رہا ہے، امن مذاکرات کی معاونت کر رہا ہے، پاکستان میں افغان شہریوں کو علاج معالجہ اور رہائش کی جگہ دے رہا ہے، ان کے بیوی بچوں کو تحفظ فراہم کر رہا ہے اور اس سب کے بدلے عالمی برادری کا دباؤ اور معاشی نقصان برداشت کر رہا ہے تو دوسری جانب عین انہی ایام میں افغان طالبان کے دونوں دھڑے حقانی اور قندھاری القاعدہ اور ٹی ٹی پی کے ساتھ ایک معاہدہ پر دستخط کر رہے ہیں کہ کس طرح باہم مل کر پاکستان کو تباہ کرنا ہے، کس طرح سے یہاں دہشت گردی کا بازار گرم کرنا ہے۔

ناقابلِ فہم ہے کہ یہ کونسی شریعت ہے؟ آقا و مولا خاتم النبیین سیدنا محمد ﷺ کی شریعت میں تو ایسی دھوکہ دہی، دہشت گردی کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیا یہ قبائلی یا پشتون روایات کی پاسداری تھی؟ پشتون ولی تو پناہ

دینے والے کا احسان نسل در نسل تسلیم کرتا ہے، اس کے مفادات کے خلاف کسی بھی عمل کو بے غیرتی قرار دیتا ہے اور ایسا کرنے والے کی سزا موت بتاتا ہے۔ تو پھر سوال تو اٹھتا ہے یہ کون ہیں؟ مختصر جواب یہی ہوسکتا ہے کہ یہ شریعت اور پشتون روایات سے باغی ہیبت اللہ رجیم ہے۔

2020 کے آخری ایام تھے یا 2021 کا اوائل کہ شمالی وزیرستان کے علاقے میرعلی میں افغان طالبان کے دونوں دھڑوں حقانی اور قندھاری کے نمائندے القاعدہ، ٹی ٹی پی اور گل بہادر گروپ کے ساتھ جمع ہوئے اور ایک معاہدے پر دستخط کئے، جسے معاہدہ میرعلی کا نام دیا گیا۔ دستخط کرنے والوں میں سراج حقانی، نور ولی محسود، گل بہادر اور مولوی صادق نور کے نام معلوم ہیں، لیکن قندھار گروپ اور القاعدہ دہشت گردوں کے نام معلوم نہیں ہوسکے۔ یہ کوئی ایک دن میں ہونے والا معاملہ نہیں تھا۔ رسمی معاہدہ نہیں تھا، بلکہ ایک سلسلہ وار مشاورت اور رابطوں کا نتیجہ یعنی سوچی سمجھی پالیسی کا حصہ تھا۔ اس میں بنیادی طور پر اس بات پر اتفاق کیا گیا تھا کہ:

1۔۔ طالبان افغانستان میں دوبارہ اقتدار حاصل کر لینے کے بعد خطے میں موجود ہم خیال گروپوں ٹی ٹی پی، گل بہادر اور القاعدہ اور دیگر کے ساتھ ہر معاملے میں تعاون کریں گے۔

2 ۔اس تعاون میں لاجسٹک سپورٹ، پناہ گاہوں کی فراہمی اور آپریشنل تعاون جیسے پہلو شامل ہوں گے۔

3۔۔ کسی بھی تنازع کی صورت ایک دوسرے کے خلاف کارروائی نہیں کی جائے گی۔

4۔۔ مشترکہ دشمن کے خلاف تعاون کریں گے۔ (یقیناً یہاں مشترکہ دشمن پاکستان کے سوا کون ہوسکتا ہے)

5۔۔ پاکستان میں شریعت کے نفاذ کو ایک مشترکہ ہدف کے طور پر پورا کیا جائے گا۔

اس معاہدے میں پاکستان کے ساتھ ساتھ خطے میں موجود ہم خیال گروپوں کا ذکر سب سے خطرناک پہلو ہے جس کا مطلب واضح ہے کہ ہدف صرف پاکستان نہیں، ایران، تاجکستان، ازبکستان اور سب ہیں۔

معاہدہ ثابت کرنے کو کافی ہے کہ طالبان اور ٹی ٹی پی ہی نہیں القاعدہ بھی ماضی کی طرح پناہ گزیں مہمان نہیں بلکہ معاہدے میں شریک ایک فریق ہے اور ہیبت اللہ رجیم میں القاعدہ کی شمولیت کوئی جذباتی یا وقتی فیصلہ نہیں، ایک سٹریٹجک معاہدے کا نتیجہ ہے۔

2021 میں طالبان کے اقتدار میں آنے کے بعد خطے کی سکیورٹی صورتحال میں جو تبدیلیاں آئیں، ٹی ٹی پی نے جس طرح سے مرحلہ وار اپنی قوت کو بڑھایا وہ اسی معاہدہ کا نتیجہ تھا۔ آج جب طالبان پوری ڈھٹائی

کے ساتھ ٹی ٹی پی اور القاعدہ کا ساتھ دے رہے ہیں تو یہ بھی اسی معاہدے کے اثرات ہیں، شاید جب تک خطے کے دیگر ممالک اس بات کو سمجھیں، بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ افغانستان میں القاعدہ کے مراکز اور دیگر تمام ممالک کے خلاف دہشت گردی کی تیاریاں بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہیں۔ قابل غور ہے کہ طالبان حکومت عالمی سطح پر خود کو ایک ذمہ دار ریاست کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے جبکہ دوسری طرف معاہدہ میر علی اور اس کے زمینی اثرات پوری بے رحمی کے ساتھ طالبان کے اس دعوے کو جھٹلا رہے ہیں۔

افغان طالبان اس معاہدے کی تصدیق کرتے ہیں، حقانی گروپ کے سورسز نے کہا کہ یہ معاہدہ ملا ہیبت اللہ کی ہدایت پر کیا گیا تھا، اس کا مقصد تھا کہ فتوحات کے لئے حتمی حملوں کے دوران طالبان کو مزید فورسز کی ضرورت تھی، ٹی ٹی پی نے وہ فورس فراہم کی۔

## ٹی ٹی پی کے ٹھکانے

ٹی ٹی پی بنیادی طور پر پاک افغان بارڈر کے آر پار آباد قبائل پر مشتمل تنظیم ہے، اس کے تمام گروپس بھی قبائلی پس منظر رکھتے ہیں، ٹی ٹی پی کی مرکزی تنظیم محسود قبائل پر مشتمل ہے، اس کے کمانڈر ہمیشہ محسود ہی آتے ہیں، دہشت گردوں میں پنجابی، سندھی، بلوچ سب آسکتے ہیں، لیکن قیادت ہمیشہ محسودوں کے پاس ہے۔ اسی طرح گل بہادر کی تنظیم جو کئی ناموں سے شناخت رکھتی ہے، اس میں بنیادی طور پر وزیر اور داوڑ قبائل کے دہشت گرد ہیں، چونکہ پاکستان میں حقانیوں کا مرکز وزیر قبیلے کے علاقے میں تھا، لہذا گل بہادر گروپ کے حقانیوں سے زیادہ اچھے تعلقات ہیں۔ جماعۃ الاحرار میں مہمند اور صافی قبائل کے لوگ ہیں، لکی مروت گروپ میں مروت قبیلہ کا کنٹرول ہے، منگل باغ گروپ میں آفریدی، شنواری قبائل کے لوگ ہیں۔ یہ قبائل چونکہ سرحد کے دونوں جانب موجود ہیں لہذا قبائلی طور پر ٹی ٹی پی افغانستان کے صوبہ ننگرہار، پکتیا اور پکتیکا میں قبائل سے منسلک ہے، اسے ان قبائل سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری جانب صوبہ کنہڑ اور نورستان کا معاملہ یہ ہے کہ دشوار گزار راستوں پر بیچ پہاڑی گزرگاہوں کے سبب یہاں زیادہ فورس کے ساتھ فوری رسائی ممکن نہیں ہے، یہاں کے قبائل ہمیشہ سے شر پسند اور سرحد کے آر پار سمگلنگ ، دہشت گردی اور جرائم کے دیگر دھندوں میں ملوث رہے ہیں، تاریخ میں کبھی بھی یہ دو صوبے پر امن نہیں رہے، یہاں ہمیشہ سے خطے میں پائے جانے والے ہر دہشت گرد گروپ کی نمائندگی رہی ہے۔

اس وقت ٹی ٹی پی اور گل بہادر افغانستان میں کابل سمیت ہر جگہ موجود ہے۔ کابل میں شہر نو اور خیر خانہ کے

محفوظ ترین سرکاری گیسٹ ہاؤسز اور جی ڈی آئی کے سیف ہاؤس اس کے ٹھکانے ہیں۔ جی ڈی آئی میں باقاعدہ انہیں ایک پارٹنر کی حیثیت دی جاتی ہے۔ پکتیا، پکتیکا، خوست، ننگر ہار، کنہڑ، ہلمند اور قندھار سمیت تمام بارڈر کے قریبی جی ڈی آئی دفاتر ٹی ٹی پی کے سہولت کار ہیں، ان علاقوں کے سکیورٹی سیٹ اپ میں انہیں خصوصی حیثیت دی جاتی ہے۔ صوبہ، نورستان میں بٹاس کورو اور نورساتن، تنگی خار میں ٹی ٹی پی مراکز قائم ہیں۔ کنہڑ میں ٹی ٹی پی کی موجودگی سب سے زیادہ ہے، یہاں گوادش اور مماس کے علاقے میں ٹی ٹی کی مرکزی کمان یعنی نور ولی گروپ کی اکثریت ہے، جماعتہ الاحرار کا مرکزی کیمپ بھی اسی قصبے میں ہے، اسی طرح برج،، پتیگال اور صوبائی صدر مقام اسد آباد میں بھی ٹی ٹی پی کے تمام گروپس موجود ہیں۔ یہاں جو بڑے دہشت گرد کمانڈر رہائش پذیر ہیں ان میں مولوی جہاد یار محسود سربراہ عسکری شوریٰ ٹی ٹی پی مسلم یار خراسانی ناظم مالی امور، حاجی راشد سربراہ سیاسی شوریٰ، عمران اورکزئی، قاری اسماعیل آفریدی، مولوی فقیر محمد رہائش پذیر ہیں۔ کنہڑ کے علاقہ مارا وارا میں ٹی ٹی پی باجوڑ کا مرکز ہے، صوبہ پکتیا، حقانیوں کا گڑھ کہا جانیوالا صوبہ ہے، یہاں خارتنگی کے علاقے میں ٹی ٹی پی کے لوگ ہیں، یہاں بھی ٹی ٹی پی مرکزی گروپ، ٹی ٹی پی سوات، لکی مروت گروپ اور جماعتہ الاحرار کے الگ الگ کیمپ موجود ہیں، صوبہ پکتیکا میں بھی ٹی ٹی پی اور جماعتہ الاحرار کے دہشت گرد موجود ہیں، شہری آبادیوں میں بھی رہائش پذیر ہیں، ایسا ہی معاملہ خوست کا بھی ہے۔

صوبہ ننگر ہار بھی ٹی ٹی پی کی موجودگی کی وجہ سے خطرناک ہے، یہاں ٹی ٹی پی کا منگل باغ گروپ رہتا ہے، ان کے کیمپ نازیاں گاؤں، اور لال پورہ میں ہیں، لال پورہ طورخم بارڈر سے جلال آباد کے راستے میں آتا ہے۔ فروری 2026 کے آخری ایام میں افغانستان کے اندر دہشت گرد ٹھکانوں کے خلاف پاکستان کی کارروائی میں ان کے کیمپ تباہ ہو چکے ہیں، لیکن اب بھی یہ سرحدی علاقوں میں موجود ہیں، طالبان نے انہیں شہری آبادیوں میں رہائشی مکانات میں منتقل کر دیا ہے، انہیں ہدایت کی گئی ہے کہ سول آبادیوں میں اس طرح سے پھیل کر رہیں کہ دو دہشت گردوں کی رہائش ایک ساتھ مکانات میں نہ ہو، تاکہ عام افغانوں کو انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔

2023 میں ٹی ٹی پی کی ری لوکیشن کا دھوکہ دیا گیا، اس کی آڑ میں طالبان رجیم نے انہیں قندوز، اور غزنی میں بھی آباد کیا، اسی طرح کش تپہ کینال کے آس پاس شمالی افغانستان کی مقامی نان پشتون آبادیوں میں

بھی ٹی ٹی پی کو آباد کیا جا رہا ہے، تا کہ ایک جانب پاکستان کو دھوکہ دیا جا سکے کہ ہم نے دہشت گردوں کو بارڈر سے ہٹا دیا ہے تو دوسری جانب نان پشتون علاقوں کی آبادی کا توازن تبدیل کیا جا سکے، یہ ایسے ہی ہے جیسے مودی حکومت کشمیر میں آر ایس ایس کو بسا رہی ہے۔

## افغان طالبان میں ٹی ٹی پی کے سپورٹر

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ پوری طالبان کابینہ میں ٹی ٹی پی کا مخالف کوئی بھی نہیں ہے، یہ تقسیم البتہ ہو سکتی ہے کہ کون زیادہ حمائتی ہے۔ ملا ہیبت اللہ اور اس کے ساتھی پوری قوت کے ساتھ ان کے ساتھ کھڑے ہیں، ہیبت اللہ رجیم جس شدت کے ساتھ ٹی ٹی پی کا دفاع کر رہی ہے، اس کی موجودگی میں یہ سوال بے معنی ہو جاتا ہے کہ اس کا حمائتی کون ہے اور مخالف کون؟ ہیبت اللہ رجیم بطور حکومت اس کے ساتھ کھڑا ہے کیونکہ یہ ان کا سٹریٹجک اثاثہ ہے۔ جو لوگ عملی طور پر میدان میں ان کے ساتھ شامل ہیں ان کی تعداد بھی کم نہیں، سرفہرست ڈاکٹر بشیر ہے، جی ڈی آئی میں کاؤنٹر ٹیررازم کا ہیڈ رہا ہے، ان دنوں پنجشیر میں ہے۔ ننگرہار کا پولیس ڈپٹی چیف تاج الدین، ننگرہار کا ڈپٹی گورنر تیاز وباح، خوست کا پولیس چیف عبیداللہ حماد اور نورستان صوبے کا ڈپٹی گورنر عصمت اللہ نورستانی شامل ہیں، یہ لوگ ٹی ٹی پی کو ہر طرح سے مدد فراہم کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ پاکستان دشمن سوچ کے حامل ہیں۔ ان سب کو نائب وزیر داخلہ ملا ابراہیم صدر کی سرپرستی حاصل ہے۔ اگر افغان طالبان ٹی ٹی پی مخالف فیصلہ کریں گے تو ان میں سے ڈاکٹر بشیر طالبان چھوڑ دے گا، ٹی ٹی پی کا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔

## ٹی ٹی پی کی سپورٹ کیوں کی جاتی ہے؟

طالبان میں ٹی ٹی پی کی حمایت کی وجہ تو معاہدہ میر علی ہے، لیکن اس کے علاوہ دکھاوے کی خاطر طالبان کے پاس بے شمار وجوہات ہیں، جن میں زیادہ وجوہات عذر لنگ سے زیادہ کچھ نہیں۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ٹی ٹی پی کے تمام گروپس امریکہ کے خلاف جنگ میں افغان طالبان کے ساتھ مل کر لڑتے رہے ہیں، انہوں نے قبائلی سطح پر انہیں چھپنے کی جگہ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تمام ضروریات بھی پوری کی ہیں، پاکستان میں ٹی ٹی پی ان علاقوں میں میزبان تھی اور طالبان مہمان۔ اب ٹی ٹی پی اس کا فائدہ اٹھا رہی ہے، ان کی آپس میں رشتہ داریاں ہیں، کاروباری تعلقات ہیں، قبیلے ایک ہیں، اس لئے اصولی طور

پر افغان طالبان انہیں اپنے سے الگ کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ افغان طالبان بطور پالیسی ٹی ٹی پی کو روکنے کے بجائے اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ملا یعقوب، ذبیح اللہ اور بعض دیگر لوگوں سے جب بھی بات ہو، بڑی ڈھٹائی سے کھل کر کہتے ہیں ''یہ پاکستان اور ٹی ٹی پی کی لڑائی ہے ہم اس میں آنا ہی نہیں چاہتے''۔ یہ طالبان حکومت، شوریٰ اور کابینہ کا عمومی رویہ ہے۔

## ٹی ٹی پی دہشت گردی کا مقصد:

حقیقت یہ ہے کہ شروع کے سالوں میں افغان طالبان ٹی ٹی پی کو بلیک میلنگ کے لئے استعمال کر رہے تھے، ان کا مقصد تھا کہ ٹی ٹی پی کے ذریعہ سے دباؤ ڈال کر پاکستان کو مجبور کیا جائے کہ وہ افغان حکومت کو باقاعدہ تسلیم کرے اور بعض دیگر مقاصد تھے، جیسے بھارت سے تجارت کے لئے راستے کھولنا، سہولیات دینا اور ٹرانزٹ ٹریڈ کے لئے سہولیات میں اضافہ کروانا، پاکستان سے مذاکرات میں انہوں نے یہ بھی موقف رکھا کہ پاکستان ٹی ٹی پی دہشت گردوں کو عام معافی دے اور فاٹا کا سٹیٹس بحال کرے، اس کے پس منظر میں ان کے تجارتی مفادات تھے، کیونکہ فاٹا کو ریاستی ڈھانچے میں شامل کرنے اور بارڈر کو باقاعدہ سرحد کا درجہ دینے سے قبائل اور افغانوں کی سمگلنگ متاثر ہو رہی ہے۔ ٹی ٹی پی اور پاکستان کے مذاکرات جن کی ثالثی سراج حقانی نے کی، وہ شرعی قوانین کے مطالبات پر ناکام نہیں ہوئے تھے بلکہ سرحد اور فاٹا کے سٹیٹس پر ناکام ہوئے تھے۔ اس لئے دوٹوک کہا جا سکتا ہے کہ معاملہ صرف سمگلنگ کا تھا، کچھ اور نہیں۔

## قندھار کی شیطانی کانفرنس

مارچ 2025 تک یہ طالبان کی اپنے مفادات مطالبات کی جنگ تھی، لیکن اس کے بعد میں بھارتی را کے براہ راست شامل ہو جانے سے اب یہ جنگ کی حیثیت بدل گئی ہے، اور فریقین بھی ایک سے زیادہ ہو گئے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ خطے میں ہونیوالی نئی صف بندیاں: براس، را اور طالبان کے درمیان خفیہ روابط کا بدلتا منظر نامہ ثابت کر رہا ہے کہ یہ اب صرف دہشت گردی نہیں رہی بلکہ علاقائی سٹریٹجک مفادات کا کھیل بن گیا ہے، جس میں بھارت اور اسرائیل کے مفادات شامل ہو چکے ہیں، اب یہ صرف ٹی ٹی پی کی پاکستان دشمنی نہیں رہی عالمی شیطانی قوتوں کا کھیل بن گئی ہے، جس میں طالبان نے شیطانی قوتوں سے اتحاد کا راستہ چنا ہے۔ جس میں بھارت فرنٹ پر کردار ادا کر رہا ہے اور اسرائیل پس پردہ قوت کے طور موجود

ہے۔اسرائیلی تھنک ٹینک MEMRI اور دیگر کئی ذرائع سے دستیاب انفارمیشن اس پورے کھیل کو بے نقاب کر رہی ہے کہ ہیبت اللہ رجیم اپنی شخصی بادشاہت کے لئے کس طرح سے انسانیت کی دشمن عالمی کرداروں کا مہرہ بننے کو تیار ہو چکا ہے-اس سلسلہ کا پہلا اجلاس جنوری 2025 کے آخری ہفتے لندن میں پی ٹی ایم کی ایک کانفرنس کی سائڈ لائن میٹنگ کے طور پر ہوا،جس میں بی ایل اے کا سربراہ ہیر بیار مری بھارتی را، اسرائیلی موساد کے نمائندے اور ایک کرد خاتون شریک ہوئی۔ایک اجلاس فروری میں ہوا۔ BRAS اور RAW اس سے اگلے ہی ماہ 3 مارچ 2025 کو تین رکنی بھارتی راوفد قندھار پہنچا،مگر اس کا سفر براہِ راست دہلی سے نہیں تھا۔وفد پہلے دبئی گیا،وہاں سے کابل اور پھر سخت سیکیورٹی میں قندھار منتقل کیا گیا۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ کابل میں موجود بھارتی سفارتخانے کا کوئی اہلکار اس وفد کے ساتھ شامل نہیں تھا،جو اس دورے کی غیر رسمی اور خفیہ نوعیت کو ظاہر کرتا ہے۔اس وفد میں ''پرمیش آہوجا'' نام کا ایک کردار زیادہ اہمیت کا حامل تھا،جو لندن کانفرنس،فروری کی براس سے ملاقات میں بھی شریک تھا،جس مطلب یہ ہوا کہ یہ سب ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔اس تناظر میں اس کا قندھار آنا محض ایک سفارتی دورہ نہیں بلکہ ایک تسلسل کا حصہ دکھائی دیتا ہے۔قندھار پہنچنے کے بعد وفد نے سب سے پہلے بھارتی قونصل خانے کا دورہ کیا اور پھر افغان طالبان کے انٹیلی جنس حکام سے ملاقات کی۔اس ملاقات میں جنرل ڈائریکٹوریٹ آف انٹیلی جنس ( جی ڈی آئی ) کا قندھار کا سربراہ مولوی کرامت،انسداد دہشت گردی یونٹ 091 قندھار کا ڈائریکٹر ملا سفر محمد ( ملا مسافر )،سینئر انٹیلی جنس افسر مولوی روح اللہ اور یونٹ 089 کا سربراہ مولوی حکیم اللہ شریک تھے۔یہ ملاقات اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ روابط محض سفارتی سطح تک محدود نہیں بلکہ سیکیورٹی اور انٹیلی جنس کے دائرے تک پھیل چکے ہیں۔

اسی روز بھارتی وفد نے طالبان کے فوجی حکام سے بھی ملاقاتیں کیں،جن میں 205 البدر کور کے بریگیڈ کمانڈر مولوی دین دوست،ان کے نائب جبار آغا،اسپیشل فورسز کے کمانڈر حافظ نظر محمد،اور حاجی یوسف وفا کا بیٹا بھی شامل تھا،جس کی موجودگی اس لئے خاص اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے بارے میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ مختلف مسلح گروپوں کے ساتھ روابط رکھتا ہے اور انہیں اسلحہ وغیرہ کی سپلائی میں معاونت کرتا ہے، ان تمام ملاقاتوں کا نقطہ عروج وہ سہ فریقی نشست تھی جس میں راوفد،طالبان نمائندے اور براس قیادت ایک ہی میز پر موجود تھے۔براس کی طرف سے بشیر زیب،گلزار بگٹی اور ریحان کرد شریک ہوئے،جبکہ

طالبان کی نمائندگی قاری کریم اللہ اور بریگیڈ کمانڈر دین دوست نے کی۔ ذرائع کے مطابق یہی وہ مرکزی نشست تھی جس کے لیے ابتدائی ملاقاتوں کے ذریعے فضا ہموار کی گئی۔

یہ ملاقات دراصل ایران میں ہونے والی براس کانفرنس کا تسلسل تھی، جہاں مبینہ طور پر پاکستان اور ایران کے خلاف دو محاذوں پر جنگ کی حکمت عملی زیر بحث آئی تھی۔ اگرچہ ابتدا میں کچھ براس رہنماؤں نے اس تجویز پر تحفظات ظاہر کیے، مگر قندھار میں ہونے والی ملاقاتوں میں طالبان کی جانب سے تعاون کی یقین دہانی نے اس منصوبے کو تقویت دی۔ بتایا جاتا ہے کہ بھارت کی جانب سے طالبان کو پاکستان کے خلاف مکمل تعاون کی یقین دہانی کرائی گئی، جبکہ ٹی ٹی پی کے لیے مالی معاونت کی بات بھی سامنے آئی۔ اسی طرح براس کو افغانستان میں دوبارہ فعال ہونے کی اجازت دینے پر زور دیا گیا، اور اس کے بدلے میں افغانستان میں مزید سرمایہ کاری کی پیشکش کی گئی۔

براس نے قندھار کے علاقے عین و مینہ میں اپنے اشرف غنی دور کے گیسٹ ہاؤس پر کنٹرول کا مطالبہ کیا، تاہم طالبان نے اسے مسترد کر دیا۔ اس کے بعد ایک متبادل تجویز سامنے آئی جس کے تحت قندھار کے ضلع تختہ پل کے علاقے تورکوٹل میں زیر تعمیر فوجی اڈے کے لیے فنڈنگ کی پیشکش کی گئی، بشرطیکہ وہاں بی ایل اے کے دہشت گردوں کو تعینات کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس تجویز پر مشروط رضامندی ظاہر کی گئی اور کہا کہ حتمی فیصلہ ملا ہیبت اللہ اخوندزادہ کی منظوری سے مشروط ہوگا۔ بعدازاں اس مقام کا مشترکہ دورہ بھی کیا گیا۔ یہ زیر تعمیر فوجی اڈہ پاکستانی ایئر سٹرائیک میں تباہ ہو چکا ہے۔ بعد میں براس ایک اور متبادل جگہ پر مان گئی۔

یہ تمام پیش رفت خطے کے لیے کئی سنگین سوالات اور خدشات کو جنم دیتی ہیں۔ اس کے اثرات پاکستان، ایران اور چین سمیت پورے خطے پر پڑ سکتے ہیں۔ اس تمام صورتحال کا پس منظر بھی اہم ہے۔ طالبان اور بھارت کے درمیان روابط اچانک قائم نہیں ہوئے بلکہ گزشتہ چند برسوں میں بتدریج بڑھے ہیں۔ نومبر 2023 میں چاہ بہار میں نائب وزیر خارجہ عباس ستنکزئی اور بھارتی وزیر خارجہ کی ملاقات اس تعاون کی ابتدا کہی جاسکتی ہے کیونکہ اسی ملاقات میں بھارت نے طالبان کو چاہ بہار میں شراکت داری کی پیش کش کی تھی اور قائل کیا تھا کہ وہ اپنی ٹرانزٹ ٹریڈ پاکستان سے چاہ بہار پر منتقل کریں۔ ملا یوسف وفا کا کردار بھی اس تناظر میں زیر بحث آتا ہے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مختلف گروپوں کے درمیان روابط قائم کرنے میں کردار ادا کیا۔

## افغان سرزمین پر اسرائیل

قندھار میں ہونے والا یہ سہ فریقی اجلاس دراصل جنوری میں لندن میں ہونے والے اجلاس کا فالواپ تھا جس میں اسرائیل کی موساد کے لوگ بھی شریک تھے، اس اجلاس میں جو معاملات زیر بحث آئے وہ اسرائیلی پلان کو آگے بڑھانے کی کارروائی تھی یعنی طالبان کے سامنے پیش کیا جانے والا دہشت گردی کا منصوبہ دراصل موساد کا وہ پلان تھا، جس کے ذریعہ سے وہ خطے میں قدم جمانے، بلوچستان میں دہشت گردی پھیلانے اور پاکستان کو عدم استحکام کا شکار بنانے کے لئے پراکسیز کو متحرک کر رہی تھی، جبکہ بھارتی را اس تمام عمل میں فرنٹ فورس کے طور پر مصروف عمل تھی۔ اسی پلان کے اثرات بعد میں اسرائیلی حملے کے دوران ایران میں بھی دکھائی دیے۔ اس تمام پیش رفت کو سامنے رکھیں تو دو اسرائیلی این جی اوز کی مسلسل افغانستان میں موجودگی کوئی زیادہ اچنبھے کی بات نہیں، البتہ کئی سوالات کو ضرور جنم دے رہی ہے۔ یہ سوال جنوری 2026 میں اس وقت بھی زیر بحث آیا تھا، جب طالبان حکومت نے تعلیم، صحت اور کلچر کے لئے کام کرنے والی 1600 این جی اوز پر پابندی لگا دی تھی۔ سوال یہ تھا کہ ان میں ''اسرا ایڈ'' اور ''شائے فنڈ'' نامی دو اسرائیلی این جی اوز کا نام شامل کیوں نہیں؟ تاہم اس کا جواب طالبان کی جانب سے کبھی نہیں دیا گیا۔ ان دونوں این جی اوز کی ویب سائٹس تسلسل کے ساتھ ان کی افغانستان میں سرگرمیوں کی رپورٹیں اپ لوڈ کر رہی ہیں۔

## پاکستان کے خلاف دہشت گردوں کا اتحاد

مارچ 2025 میں افغان طالبان کے صوبہ خوست میں نئے پولیس چیف، ملا عبیداللہ حامد نے عہدہ سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ سرانجام دیا کہ پاکستان مخالف دہشت گرد تنظیموں ٹی ٹی پی گل بہار اور جماعۃ الاحرار کے درمیان اتحاد قائم کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ اطلاعات ہیں کہ پولیس چیف کو دہشت گردوں کے اتحاد کا یہ ٹاسک خود ملا ہیبت اللہ نے دیا تھا۔ اس کامیابی پر خوش ہو کر ملا ہیبت اللہ نے ان کے اختیارات میں بھی اضافہ کر دیا، جس کے تحت انہیں سرحدی علاقوں میں سرگرم دہشت گرد گروپوں کے معاملات میں مکمل اختیار حاصل ہو گیا ہے اور وہ کسی بھی وزارتی اجازت کے پابند نہیں رہے۔

قندھار سے جاری ہونے والے ایک خط کے مطابق تمام محکموں اور وزارتوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ

عبیداللہ حامد کے ساتھ مکمل تعاون کریں اور ان کے کام میں مداخلت نہ کریں۔ ان کا اگلا ہدف خوست سے حقانی گروپ کے اثر ورسوخ کا خاتمہ ہے۔ ذرائع کے مطابق، تقرری کے فوراً بعد عبیداللہ حامد نے دہشت گرد گروپوں کے ساتھ رابطوں کا سلسلہ شروع کیا اور ان کی قیادت سے علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں کیں، جس کے نتیجے میں تمام گروہ مذاکرات کے لیے خوست میں حافظ گل بہادر کے سابق مرکز پر جمع ہونے پر آمادہ ہوگئے۔ ان مذاکرات کی سیکیورٹی کی ذمہ داری بھی عبداللہ حامد نے خود سنبھالی۔

عبداللہ حامد کی ذاتی دلچسپی کے باعث القاعدہ برصغیر، داعش خراسان (ISIS-K) کے ایک گروہ اور الیاس کشمیری گروپ کو بھی متحرک کیا گیا اور وہ بھی اس اتحاد کا حصہ بن گئے۔ مذاکرات میں شرکت کرنے والے وفود میں ٹی ٹی پی کے سربراہ نور ولی محسود، ان کے نائب بورجان یوسفزئی اور مولوی فقیر محمد شامل تھے۔ حافظ گل بہادر گروپ کے سربراہ مولوی گل بہادر، اس کے ذیلی گروپ جبہ الانصار المہدی کے سربراہ صدیق اللہ صادق، حال ہی میں شامل ہونے والے افتخار عرف عمر گنڈاپور اور خالد حیدر خیل بھی شریک تھے۔ جماعت الاحرار کے سربراہ عمر مکرم خراسانی، مکمل شاہ عرف سربکف مجاہد اور اسد منصور بھی اس اتحاد کا حصہ تھے۔ لشکر اسلام کے وفد میں اس کے سربراہ اجنبی باغ، صلاح الدین اور قاری کاشف شامل تھے۔ القاعدہ برصغیر کے وفد میں اسامہ محمود اور ابو اخلاص مصری جبکہ داعش خراسان کے نمائندوں میں زید اللہ بدر اور موسیٰ خان شامل تھے۔ الیاس کشمیری گروپ کی نمائندگی عاصم کشمیری، ابوحمزہ اور عمر اسماعیل نے کی۔ یہ مذاکرات 8 مارچ 2025 کو شروع ہوئے اور 12 مارچ 2025 کو اختتام پذیر ہوئے، جس کے بعد تمام گروپوں کی قیادت نے ایک معاہدے پر دستخط کیے۔ جس کے تحت تمام گروپوں میں مفاہمت کروادی گئی ہے اور علاقے تقسیم کردیئے گئے ہیں۔ تاکہ باہمی اختلافات کی وجہ سے دہشت گردی متاثر نہ ہو۔ یہ طے پایا ہے کہ:

1۔۔ یہ صرف ایک اتحادی بندوبست ہے، کوئی تنظیمی اتحاد نہیں۔

2۔۔ ہر گروہ اپنے تنظیمی معاملات میں خودمختار رہے گا۔

3۔۔ تمام تنظیموں کے مقامی گروپ اپنی علاقائی سہولت کے مطابق باہمی تعاون کا طریقہ کار طے کریں گے۔ 4۔۔ علاقوں کی تقسیم کے تحت یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ دہشت گرد گروہ ایک دوسرے کے خلاف کارروائی نہیں کریں گے۔

5۔۔کسی بھی اختلاف کی صورت میں عبداللہ حامد ثالثی کریں گے اور ان کا فیصلہ سب کو ماننا ہوگا۔

اس اجلاس میں دہشت گردی کے لئے خیبر پختونخوا کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا:

1۔۔پشاور، خیبر، مہمند اور باجوڑ کے اضلاع نور ولی محسود گروپ کو دیے گئے ہیں۔گل بہادر کے اتحادی گروپ لشکر اسلام اور جماعت الاحرار ان کی مدد کریں گے۔

2۔۔دوسرے زون میں کرم، شمالی وجنوبی وزیرستان اور جنوبی اضلاع حافظ گل بہادر کے حوالے کیے گئے ہیں، جہاں نور ولی محسود گروپ، الیاس کشمیری گروپ، داعش اور القاعدہ ان کی مدد کریں گے۔

معاہدہ میر علی کے بعد یہ معاہدہ خوست اس بات کی دلیل ہے کہ ہیبت اللہ رجیم دہشت گردوں کا سر پرست اور سہولت کار ہے۔اس اتحاد میں سب سے بڑی پیش رفت یہ ہے کہ حافظ گل بہادر کا گروپ مضبوط ہو کر دہشت گردی میں مرکزی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ایک سال پہلے انہیں صرف جنوبی وزیرستان تک محدود رکھا گیا تھا جبکہ باقی صوبہ نور ولی کے کنٹرول میں تھا۔تاہم دسمبر کے آخر میں پاکستانی فضائی حملوں میں ٹی ٹی پی کو بھاری نقصان کے بعد نور ولی کی پوزیشن کمزور ہوگئی اور اب انہیں صرف چند اضلاع تک محدود کر دیا گیا ہے۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ داعش بیک وقت دوہرا کردار ادا کر رہی ہے۔ایک طرف اس کا ایک دھڑا افغان طالبان کے خلاف برسر پیکار ہے جبکہ دوسرا دھڑا طالبان کے ساتھ مل کر پاکستان کے خلاف کارروائیاں کر رہا ہے۔مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ داعش اور القاعدہ دنیا بھر میں ایک دوسرے کے دشمن ہیں، مگر یہاں القاعدہ برصغیر اور داعش دونوں نے نظریاتی اختلافات کے باوجود ٹی ٹی پی کی حمایت کا فیصلہ کیا ہے۔

## داعش ایک فرنچائز

حقیقت یہ ہے کہ افغانستان میں داعش ایک نظریاتی تنظیم کے بجائے ایک فرنچائز کی شکل اختیار کر چکی ہے، جس کے مختلف گروہ الگ الگ کارروائیاں کرتے ہیں۔اس اتحاد میں شامل داعش گروہ خود کو داعش پاکستان یا داعش باجوڑ کہتا ہے، حالانکہ مرکزی داعش کی طرف سے ایسا کوئی باضابطہ اعلان نہیں کیا گیا۔اس گروہ کا سربراہ گل بانی حاجی ہے، جو 2007 سے مولوی فقیر محمد کا نائب رہا اور 2013 میں داعش میں شامل ہو گیا۔وہ پہلے القاعدہ کے عربد ہشت گردوں کی میزبانی بھی کرتا تھا۔طالبان کے اقتدار میں آنے کے بعد وہ دوبارہ منظر عام پر آیا اور اب باجوڑ اور دیگر قبائلی علاقوں میں خاص طور پر

جے یو آئی کے رہنماؤں کے ٹارگٹ کلنگ میں ملوث ہے۔ مولوی فقیر محمد نے اسے دوبارہ ٹی ٹی پی اتحاد میں شامل کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔

## طالبان کی سرپرستی میں ٹی ٹی پی داعش اتحاد

داعش کو افغان طالبان کی دشمن تنظیم سمجھا جاتا ہے، اس کے میگزینز میں ٹی ٹی پی کے خلاف لٹریچر کی بھرمار ہے، لیکن طالبان کی جی ڈی آئی جس کا کام ہی دہشت گردی اور ہیبت اللہ کے شخصی استبداد کا استحکام ہے، وہ ایک نیا کھیل رچائے ہوئے ہے۔ پاکستان میں ٹی ٹی پی کو مار پڑتے دیکھ کر افغان طالبان دوبارہ حرکت میں آئے ہیں اور انہوں نے پاکستان کے خلاف کنہڑ میں ایک خطرناک اور غیر اعلانیہ مشترکہ فورس تشکیل دے دی ہے، جس میں داعش خراسان، تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) اور جماعت الاحرار کو یکجا کر کے ایک متحدہ حملہ آور یونٹ بنایا گیا ہے۔

اس فورس کی قیادت ڈاکٹر برہان الدین نامی دہشت گرد کر رہا ہے اور یہ خفیہ ٹھکانوں سے کام کرتی ہے، جہاں ہر دہشت گرد کو ماہانہ 500 ڈالر دیے جاتے ہیں تاکہ پاکستان کے خلاف سرحد پار حملے جاری رکھے جاسکیں۔ اس اتحاد کا مقصد واضح ہے: داعش کی خودکش حکمت عملی، ٹی ٹی پی کے مقامی نیٹ ورک اور جماعت الاحرار کی شہری دہشت گردی کی مہارت کو یکجا کر کے مربوط حملے کرنا، جبکہ افغان طالبان کو براہ راست ذمہ داری سے بچائے رکھنا۔

اس اتحاد کی سنگینی 6 فروری 2026 کو اس وقت واضح ہوئی جب اسلام آباد میں ایک مسجد پر خودکش حملہ کیا گیا۔ یہ حملہ ٹی ٹی پی اور داعش کے مشترکہ نیٹ ورک نے کیا۔ تحقیقات کے دوران پشاور میں بلال اور ناصر نامی دو بھائیوں اور ان کے بہنوئی عثمان کو گرفتار کیا گیا، جبکہ نوشہرہ سے افغان ہینڈلر رحیم اللہ پکڑا گیا۔ کراچی میں بھی مزید گرفتاریاں ہوئیں۔ داعش نے اس حملے کی ذمہ داری قبول کر کے افغان طالبان پر دباؤ کم کرنے کی کوشش کی، جبکہ زمینی حقائق نے جی ڈی آئی کی سرپرستی کو واضح کیا۔

یہ نئی مشترکہ فورس دہشت گردی کے ایک نئے مرحلے کی نمائندگی کرتی ہے، جہاں مختلف تنظیمیں ایک منظم اور مربوط حکمت عملی کے تحت کام کر رہی ہیں۔ افغانستان میں موجود تربیتی مراکز، مشترکہ انٹیلی جنس اور سرحد پار نقل و حرکت نے ان حملوں کو زیادہ مؤثر اور خطرناک بنا دیا ہے۔

داعش اور ٹی ٹی پی کے درمیان روابط ماضی میں بھی موجود رہے ہیں، خاص طور پر باجوڑ، کرم اور کنہڑ

میں۔اس اتحاد کا بنیادی مقصد افرادی قوت، وسائل اور محفوظ پناہ گاہوں کی کمی کو پورا کرنا اور دہشت گردی کی شدت میں اضافہ کرنا ہے۔ یہ صورتحال اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ دہشت گردی اب ایک منظم، مربوط اور زیادہ مہلک شکل اختیار کر چکی ہے، جس میں مختلف گروہ ایک دوسرے کی صلاحیتوں کو استعمال کر کے خطے میں عدم استحکام کو بڑھا رہے ہیں۔

## وسط ایشیاء کے لئے خطرے کی گھنٹی

حال ہی میں افغانستان کے شمالی صوبے سمنگان کے دارالحکومت ایبک میں ایک اہم اور غیر معمولی پیش رفت سامنے آئی جو ثابت کرتی ہے کہ ہیبت اللہ رجیم صرف پاکستان کا ہی دشمن نہیں بلکہ دہشت گردی اس کا ایجنڈا اور دھندہ ہے جسے یہ پورے خطے میں پھیلانے پر کمربستہ ہے۔4اور5 نومبر 2025 کو سمنگان کے شہر ایبک کے نواح میں مختلف دہشت گرد تنظیموں کے نمائندوں کا ایک انتہائی خفیہ اجلاس ہوا۔اجلاس کا ایجنڈا افغانستان کے پڑوسی ممالک میں دہشت گردانہ سرگرمیوں کے لیے باہمی تعاون تھا۔ اجلاس میں شامل ہونے والی تنظیموں میں جماعت الاحرار، ای ٹی آئی ایل/ ای ٹی آئی ایم (ایسٹ ترکستان اسلامک موومنٹ)، آئی ایم یو (اسلامک موومنٹ آف ازبکستان)، تحریک طالبان تاجکستان (TTT)، جیش العدل، اور بلوچستان لبریشن آرمی (BLA) شامل تھیں۔

اجلاس کو انتہائی خفیہ رکھا گیا۔ افغان طالبان کا کوئی سرکاری نمائندہ شریک نہیں تھا، لیکن اجلاس کے تمام انتظامات گورنر بلخ ملا یوسف وفا نے کیئے۔ اجلاس ایبک کے شمالی علاقے میں واقع ای ٹی ایل ایف کے مرکز میں ہوا، جو ای ٹی آئی ایم سے منسلک تنظیم ہے۔ اجلاس میں شریک اہم شخصیات میں جماعت الاحرار کی جانب سے حسن قادر المعروف محسن قادر، ای ٹی آئی ایل ایف/ ای ٹی آئی ایم کی طرف سے حمزہ ازبک اور یحییٰ ایغور، تاجک طالبان (TTT) سے کمانڈر عبدالرحمن بدخشانی، بی ایل اے سے حمل منشی، جیش العدل سے مولوی سلمان فارسی المعروف فاروق شدید، اور آئی ایم یو سے عبدالرزاق المرزوق محمد شامل تھے۔ کیمپ کی ذمہ داری یحییٰ ایغور کے پاس تھی، جبکہ حمزہ اور یحییٰ دونوں عبدالحق ترکستانی کے قریبی ساتھی سمجھے جاتے ہیں۔ ذرائع کے مطابق اس اجلاس کا خیال سب سے پہلے ای ٹی آئی ایم نے پیش کیا تھا۔ای ٹی ایل ایف/ ای ٹی آئی ایم کے نمائندوں نے شرکا سے کہا کہ اگرچہ ہر گروہ دشمن کو مختلف ناموں سے پکارتا ہے، مگر دشمن ایک ہے اور ان کا حتمی مقصد آزادی ہے۔ انفرادی طور پر کامیابی مشکل ہے، جبکہ باہمی تعاون

کی پالیسی اپنانے سے مشترکہ اہداف حاصل کیے جاسکتے ہیں، کیونکہ کسی گروہ کے مفادات یا مقاصد آپس میں متصادم نہیں۔ ٹی ٹی پی نے دیگر تمام معاملات میں تعاون کی آمادگی ظاہر کی، لیکن اپنے خفیہ ٹھکانوں کو دوسرے گروپوں سے شیئر کرنے پر تحفظات کا اظہار کیا۔ TTT نے مطالبہ کیا کہ ای ٹی آئی ایم تاجک حکومت کے خلاف کارروائیوں میں حصہ لے، لیکن ایغور نمائندوں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ وہ پورے خطے میں چینی مفادات کو نشانہ بنانے سے توجہ ہٹانا نہیں چاہتے۔ ای ٹی آئی ایم کے حمزہ نے کہا کہ شام میں یہ حکمت عملی کامیاب رہی کہ ہر گروہ نے اپنا الگ مقصد بھی جاری رکھا اور ایک بڑے مشترکہ دشمن کو بھی نشانہ بنایا۔ اس نے مزید کہا کہ اگر تمام گروہ اپنے اپنے اہداف کے ساتھ ساتھ چین کو بھی مسلسل نشانہ بناتے رہیں تو چین پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگا اور پاکستان سے تاجکستان تک تمام مقامی اہداف خود بخود کمزور پڑ جائیں گے۔

بی ایل اے اور جیش العدل کے درمیان یہ مفاہمت ہوئی کہ جیش العدل ایران کے اندر مکمل طور پر بی ایل اے کی مدد کرے گا، جبکہ بی ایل اے پاکستان کے اندر جیش العدل کی مدد کرے گا تاکہ بلوچستان کی آزادی کی کوششوں کو تقویت مل سکے۔ دونوں تنظیموں نے ای ٹی آئی ایم/ای ٹی آئی ایف کے ساتھ اس بات پر بھی اتفاق کیا کہ چین کو پوری شدت سے نشانہ بنایا جائے تاکہ اسے خطے سے باہر نکالا جاسکے۔

ٹی ٹی پی اور تاجک طالبان نے تعاون کی یقین دہانی تو کروائی، لیکن چینی اہداف پر براہ راست حملوں میں حصہ لینے سے گریز کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ چین کے خلاف خفیہ تعاون تو کر سکتے ہیں، لیکن کھل کر سامنے نہیں آئیں گے کیونکہ ایسا کرنے سے طالبان حکومت پر براہ راست الزام آئے گا، جس سے وہ بچنا چاہتے ہیں۔ طویل بحث ومباحثے کے بعد اجلاس کسی تحریری معاہدے کے بغیر ختم ہوا، لیکن تمام شرکا اس اصولی فیصلے پر متفق ہو گئے کہ وہ اکٹھے لڑیں گے، ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ایک میں ہونے والا یہ خفیہ اجلاس خطے میں دہشت گردوں کی نئی اور خطرناک سطح کی ہم آہنگی کی نشاندہی کرتا ہے۔ ٹی ٹی پی کے دھڑوں، ای ٹی آئی ایم/ای ٹی آئی ایف، آئی ایم یو، تاجک طالبان، جیش العدل اور بی ایل اے جیسے گروپوں کا ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا افغانستان کو دہشت گرد نیٹ ورکس کے مرکز اور محفوظ ٹھکانے کے طور پر ظاہر کرتا ہے۔

یہ اشتراک پاکستان، ایران، تاجکستان اور دیگر پڑوسی ممالک کے خلاف منظم اور مربوط حملوں کے

امکانات کو بہت بڑھاتا ہے۔ اجلاس میں سامنے آنے والی حکمت عملی مشترکہ کارروائیوں، وسائل کے تبادلے اور عملی تعاون کے نئے دور کی طرف اشارہ کرتی ہے، جس سے دہشت گرد گروہ انفرادی حملوں کے بجائے زیادہ بڑے اور ہم آہنگ حملوں کی طرف جا سکتے ہیں۔ افغانستان کی جانب سے ایسی تنظیموں کو برداشت کرنا انہیں منصوبہ بندی، نقل و حرکت اور محفوظ ٹھکانوں کی سہولت فراہم کرتا ہے، جس کے نتیجے میں پورے خطے کے لیے سنگین خطرات جنم لے رہے ہیں۔ مختصراً، ایبک کی یہ ملاقات دہشت گردی کے ایک نئے متحد مرحلے کی علامت ہے، جس میں افغانستان ایک علاقائی لانچنگ پیڈ بن چکا ہے، اور یہ صورتحال سارے خطے کے لیے فوری اور سخت انسدادِ دہشت گردی اقدامات کا تقاضا کرتی ہے۔

## ازبکستان کے لئے وارننگ

ملا ہیبت اللہ رجیم کے خونی پنجوں سے ازبکستان بھی محفوظ نہیں رہا، 15 جولائی 2025 کو ازبکستان نے الزام لگایا ہے کہ افغان طالبان اسلامی تحریکِ ازبکستان (IMU) کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کرنے کے بجائے اس کی مدد کر رہے ہیں، جس سے ازبکستان کی قومی سلامتی کے لیے خطرات بڑھ رہے ہیں۔ ایسے وقت میں جب روس نے باضابطہ طور پر طالبان حکومت کو تسلیم کر لیا ہے، ازبکستان نے ایک نیا تنازعہ اٹھا دیا ہے۔ 10 جولائی کو ازبکستان کے دارالحکومت تاشقند میں افغان سفارتی نمائندے عبدالغفار بحر کو ازبکستان کے صدارتی سلامتی مشیر عبدالسلام عزیزوف کے دفتر طلب کیا گیا، جہاں انہیں ایک ڈوزیئر دیا گیا، جس میں الزام تھا کہ افغان طالبان IMU کے خلاف کارروائی کے بجائے اس سے تعاون کر رہے ہیں، اور اس کے نتیجے میں پہلی بار 2020 کے بعد IMU کے دہشت گرد ازبکستان میں داخل ہونے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ازبک ڈوزیئر، جسے دونوں حکومتوں نے خفیہ رکھا ہے، میں کہا گیا ہے کہ مئی 2025 کے دوسرے اور تیسرے ہفتے میں IMU کے دو گروہ کشتیوں کے ذریعے دریائے آمو جو افغان ازبک سرحد عبور کر کے ازبکستان میں داخل ہوئے۔ کل 13 دہشت گردوں نے سرحد عبور کی۔ ان میں سے تین کو ازبک فورسز نے گرفتار کر لیا جبکہ باقی کی تلاش جاری ہے۔ گرفتار دہشت گردوں میں سے ایک، محمد علی خیرالدینوف، کو ازبک ضلع انگور کے افغان سرحد کے قریب واقع گاؤں دوستلیک سے پکڑا گیا۔ دوسرے دو دہشت گرد ضلع بوائے سن کے سرحدی گاؤں دبی بولو سے گرفتار ہوئے۔ ان کی شناخت فرہاد اکبرزادہ اور ایلداز نور

محمود وف کے نام سے ہوئی ہے۔

فرہاد اکبرزادہ کے بارے میں رپورٹ ہے کہ وہ پہلے افغان طالبان کے ساتھ ملا اکبرزادہ کے نام سے منسلک رہا۔ طالبان کے 2021 میں کابل پر قبضے کے بعد وہ اپنے گاؤں اچکزل، ضلع ترمیز، ازبکستان لوٹ گیا تھا۔ وہ 2023 میں دوبارہ لاپتہ ہوگیا۔ ازبک حکام نے سمجھا تھا کہ وہ داعش میں شامل ہوگیا ہے، اس لیے اس کے خلاف وارنٹ جاری کیے گئے۔ تاہم، حالیہ گرفتاری کے بعد پتہ چلا کہ وہ اس عرصے میں IMU کو دوبارہ منظم کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا اور اسے ایک گروہ کا سربراہ بنا کر ازبکستان بھیجا گیا تھا۔

ان دہشت گرد کمانڈرز کے مطابق ازبکستان میں داخل کیے گئے دونوں IMU گروپوں کا مقصد فوری طور پر دہشت گرد حملے کرنا نہیں تھا بلکہ ازبک نوجوانوں کو IMU میں شامل کرنا اور دور دراز دیہاتی علاقوں میں ایسے مراکز قائم کرنا تھا جو سکیورٹی اداروں کی نظر سے اوجھل رہیں۔ ان کا منصوبہ تھا کہ کافی تعداد میں بھرتیاں مکمل ہونے کے بعد ازبک حکومت کے خلاف جنگ کا آغاز کیا جائے۔

تحقیقات سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اس IMU کے نئے مرحلے کی قیادت کے لیے ایک تجربہ کار دہشت گرد، صدیق اللہ علیموف، کو منتخب کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھیوں میں عثمان تاشقندی، محمد صادق محمد یوسف ولیوف، خیام محمد رحمد ینوف، قاسم علی رشیدوف، احمد خان رحیموف، عمر عبداللہ یوسپووف، حسن مرزائیف اور حسین نورالدینوف جیسے پرانے دہشت گرد شامل ہیں۔ یہ تمام افراد IMU کے بانی طاہر یلدیشیف اور اس کے نائبین عباس منصور اور ایوب بشیر کے ساتھ 2005 سے 2007 کے دوران پاکستان کے وزیرستان علاقے میں آئے تھے۔ 2010 میں پاکستان کی فوجی کارروائیوں کے دوران یہ تمام افغانستان فرار ہوگئے۔

2015 تک IMU کی زیادہ تر قیادت ماردی گئی تھی اور تنظیم ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی۔ اس کے بعد اس کے اکثر دہشت گرد القاعدہ، داعش اور ETIM میں شامل ہوگئے۔ بڑی تعداد میں افراد افغان طالبان میں بھی شامل ہوئے، جن میں اوپر درج نام بھی شامل ہیں۔ طالبان کے برسراقتدار آنے کے بعد یہ عناصر طالبان سے الگ ہوگئے اور IMU کے پرچم تلے دوبارہ سرگرم ہونا شروع ہوگئے۔

ازبکستان نے مطالبہ کیا ہے کہ افغان طالبان IMU کے تربیتی کیمپ ختم کریں اور نامزد دہشت گردوں کو گرفتار کر کے ازبکستان کے حوالے کریں۔ ازبک حکومت نے افغان حکام کے ساتھ ایک فہرست شیئر کی ہے جس میں شامل ہیں: ابراہیم سیدوف، عثمان تاشقندی، صدیق رشیدوف، عبدالرزاق خالیدوف، زاہد

محمودوف، سردار جمالوف، نورالدین قاسموف، رستم کریموف، شہریار عبدولوف، طاہر سمرقندوف، کامران حبیبوف، عادل رحمانوف اور جواد شریفوف۔ ڈوزیئر کے مطابق یہ تمام افراد کمانڈر ہیں اور اندازاً سو سے زیادہ دہشت گرد افغانستان کے سرحدی علاقوں میں موجود ہیں جو ازبکستان کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔

ذرائع کے مطابق IMU کے دہشت گرد کنڈز میں تحریک طالبان پاکستان (TTP) سے بھی رابطے میں رہے۔ IMU کی 2023 میں بحالی TTP کی رہنمائی اور عملی تعاون کے باعث ممکن ہوئی۔ ابتدائی دستوں کی تربیت بھی TTP نے ہی کی، لیکن اب انہیں دریائے آمو کے قریب ازبک سرحد کے ساتھ موجود مراکز میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

2024 کے وسط تک انہیں شمالی بلخ کے علاقوں، شورتپہ، جوئی وکیل، تاش گزر، بوریاباف، اور کئی چھوٹے دیہات جیسے ڈالی اور کلدر میں منتقل کر دیا گیا۔ حکمت عملی یہ تھی کہ بڑے کمپاؤنڈ تعمیر نہ کیے جائیں بلکہ دہشت گردوں کو الگ الگ گھروں میں چھوٹے گروپوں کی صورت میں رکھا جائے تاکہ شک نہ ہو۔

## دہشت گردی ایک ہتھیار

طالبان کی یہ پالیسی کہ دہشت گرد گروپوں کو پروان چڑھایا جائے اور انہیں بطور دباؤ استعمال کیا جائے، جیسا کہ عسکری ماہرین نے پہلے ہی پیشگوئی کی تھی، طالبان کے اپنے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی ہے۔ ایک جانب پاکستان نے TTP کے حوالے سے طالبان کو دفاعی پوزیشن میں دھکیل دیا ہے۔ دوسری جانب چین نے ETIM کے معاملے پر طالبان کی معاہدوں کی خلاف ورزی کے حوالہ سے دباؤ بڑھا دیا ہے۔ اب روس کی جانب سے باضابطہ تسلیم کیے جانے کے باوجود، ازبکستان نے نہ صرف طالبان پر دہشت گردی کی سرپرستی کا الزام لگایا ہے بلکہ ٹھوس شواہد بھی پیش کیے ہیں۔ افغانستان کے ساتھ اچھے تعلقات کے باوجود، ازبکستان کی حکومت نے ازبک سرحد کے قریب علاقوں میں اسلامی موومنٹ آف ازبکستان (IMU) کے دہشت گردوں کی بڑھتی ہوئی موجودگی پر تشویش کا اظہار کیا ہے اور افغان طالبان سے اس گروہ کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا ہے۔

طالبان نے ازبکستان کو وہی جواب دیا جو وہ پاکستان کو دیتے ہیں: "یہاں کوئی دہشت گرد موجود نہیں ہیں۔ ازبکستان اس سے قبل 27 اپریل کو دہشت گردی کا معاملہ اٹھا چکا ہے جب ازبک وزیر خارجہ بختیار سعیدوف نے افغان وزیر خارجہ ملا متقی سے ٹیلی فون پر بات کی اور اپنی تشویش سے آگاہ کیا، یہ کہتے ہوئے کہ آئی ایم

یو کی سرگرمیاں اور افغان سرزمین پر ان کی موجودگی تشویشناک حد تک بڑھ رہی ہے۔ اس کے جواب میں ملا متقی نے افغانستان میں آئی ایم یو کی موجودگی سے انکار کیا اور کہا کہ افغانستان میں کوئی دہشت گرد موجود نہیں۔ بعد ازاں، یکم مئی کو ازبکستان کے خصوصی نمائندے نے مزار شریف کا دورہ کیا اور نائب گورنر مولوی نور الہادی سے ملاقات کی، جس میں انہیں ازبک سرحد کے قریب دہشت گردوں کے ٹھکانوں کے بارے میں آگاہ کیا گیا۔ اس کے باوجود افغان حکومت نے اپنا موقف برقرار رکھا کہ افغان سرزمین پر کوئی دہشت گرد موجود نہیں ہیں۔

ازبک حکومت کی تشویش درست ہے، کیونکہ آئی ایم یو کے دہشت گرد بدخشان، تخار، کندوز، بغلان، فاریاب، کنڑ اور سرِ پل جیسے صوبوں میں موجود ہیں، اور ان کی تعداد اس وقت 500 سے 800 کے درمیان ہے۔ یہ افراد مرکزی قیادت سے محروم ہیں اور تین گروپوں میں تقسیم ہیں، جبکہ کچھ افراد کسی بھی گروہ کا حصہ نہیں مگر الگ شناخت رکھتے ہیں۔

ایک گروہ کی قیادت نسیم ازبک نامی دہشت گرد کر رہا ہے جو ازبک شہری ہے مگر زیادہ تر وقت پاکستان کے وزیرستان میں گزارتا رہا۔ اس کے والد رحمان نمنگانی، آئی ایم یو کے بانی طاہر یولداشیف کے قریبی ساتھی تھے اور 2008 میں پاکستانی افواج کے ساتھ جھڑپ میں مارے گئے تھے۔ اس کے بعد نسیم نمنگانی المعروف نسیم ازبک پہلے ٹی ٹی پی سے وابستہ ہوا، 2013 میں آئی یو ایم میں شامل ہو کر شام گیا، اور 2021 میں واپس آیا۔ اس نے منتشر آئی یو ایم یو دہشت گردوں کو اکٹھا کر کے ایک گروہ بنانے کی کوشش کی۔

نسیم اس وقت کنڑ میں موجود ہے اور اس کے گروہ کے تقریباً 300 دہشت گرد مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ افراد افغان طالبان سے وابستہ ہیں اور ازبک زبان میں سوشل میڈیا پر آئی ایم یو کے لیے بھرتی مہم چلا رہے ہیں، جس کا ہدف ازبکستان ہے۔

آئی ایم یو کا ایک اور دھڑا یعقوب اردشیف نامی پرانے دہشت گرد کی قیادت میں ہے۔ یعقوب آئی یو ایم کے ابتدائی ارکان میں شامل تھا اور بعد میں القاعدہ میں شامل ہو گیا۔ وہ گزشتہ دو برس سے مزار شریف میں موجود ہے۔ اگرچہ اسے اب بھی القاعدہ کا حصہ سمجھا جاتا ہے، تاہم اس وقت وہ تقریباً دو سو سے زائد دہشت گردوں کے گروہ کی قیادت کرتے ہوئے دوبارہ آئی ایم یو کے نام سے سرگرم ہو چکا ہے۔ ازبکستان اس گروہ کو زیادہ خطرناک سمجھتا ہے۔

تیسرا دھڑا فاروق یلدرم نامی دہشت گرد کی قیادت میں کام کر رہا ہے، جس کے افراد کی تعداد 150 سے 200 کے درمیان ہے۔ فاروق یلدرم پہلے افغان طالبان کا حصہ تھا اور اب خود کو آئی ایم یو کمانڈر کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ ذریعے کے مطابق ازبکستان کی حالیہ تشویش اپریل کے دوسرے ہفتے میں اس وقت بڑھی جب ازبک افواج نے خیرتان سرحدی علاقے کے قریب ایک انٹیلی جنس آپریشن میں چار دہشت گردوں کے ایک گروہ کو گرفتار کیا۔ ان کے قبضے سے تقریباً 50 کلاشنکوف، 10 امریکی ایم 4 رائفلیں، درجن سے زائد دستی بم اور دھماکہ خیز مواد، اور تین خودکش جیکٹس برآمد ہوئیں۔ یہ گروہ یہ اسلحہ ازبکستان اسمگل کر رہا تھا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یعقوب اردشیف کے آئی ایم یو دھڑے نے ازبکستان میں ایک کارروائی کی منصوبہ بندی کی تھی اور یہ اسلحہ اسی مقصد کے لیے بھیجا گیا تھا۔ طالبان حکومت ان گروہوں کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہی ہے کیونکہ یہ گروہ پالیسی کے تحت منتشر شکل میں طالبان کے زیر سایہ، ان کی شناخت استعمال کرتے ہوئے کام کر رہے ہیں۔

رپورٹس کے مطابق ازبکستان کی وادی فرغانہ میں ایک بار پھر انتہا پسندی بڑھ رہی ہے، جس کے پیچھے وہی آئی ایم یو ہے جسے خفیہ طور پر القاعدہ اور افغان طالبان کی حمایت حاصل ہے۔ افغان حکومت کا خیال ہے کہ آئی ایم یو کا خوف پیدا کر کے وہ ازبک حکومت سے معاشی اور تزویراتی فوائد حاصل کر سکتی ہے۔ اسی لیے وہ بظاہر ان کی موجودگی سے انکار کرتی ہے مگر پسِ پردہ ان کی حمایت بھی جاری رکھتی ہے۔ یہ گروہ افغان طالبان کی اس پالیسی کا حصہ ہیں جس کے تحت مختلف دہشت گرد تنظیموں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

## تحریک طالبان تاجکستان (TTT) ایک نیا فتنہ:

پاکستان کو بلیک میل کرنے کی پالیسی کے ساتھ ساتھ افغان طالبان نے تاجکستان کے ساتھ دہشت گردی کے ذریعے بلیک میل کرنے کی پالیسی اختیار کر لی ہے، اور تحریک طالبان تاجکستان (TTT) کو تاجکستان سے ملحق صوبہ بدخشان کے سرحدی علاقوں کوف اخوابان، میمے، نوسے اور شیکے میں مراکز قائم کرنے اور کارروائیوں کی اجازت دے دی ہے۔ اس کا مقصد تاجکستان کو سبق سکھانا ہے۔ بعد ازاں دیگر افغان طالبان کے سرکاری ذرائع سے بھی اس بات کی تصدیق ہوئی ہے کہ تاجک سرحد پر دہشت گردی کی سرگرمیاں باقاعدہ طالبان حکومت کی اجازت سے شروع کی گئی ہیں، جن کی

قیادت تاجکستان کا ایک دہشت گرد مہدی ارسلان کر رہا ہے۔ مہدی ارسلان کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اس کا اصل نام محمد شریف ہے اور وہ تاجک شہری ہے۔ 2015 سے طالبان میں شامل ہے اور باقاعدہ جنگوں میں حصہ لیتا رہا ہے۔ اب طالبان نے اسے اپنی فورس سے الگ کرتے ہوئے عملی طور پر 2015 کے بعد ختم ہو جانے والی تنظیم جماعت انصار اللہ کو دوبارہ منظم کرنے کی ذمہ داری دی ہے۔ محمد شریف عرف مہدی ارسلان خود بدخشان صوبے کے صدر مقام فیض آباد میں شہر کے باہر ایئرپورٹ کے قریب رہائش پذیر ہے، لیکن اس کے دہشت گرد سرحدی علاقوں میں قائم کیے گئے مراکز میں رہائش پذیر ہیں۔ اطلاعات ہیں کہ مہدی ارسلان کے پاس دہشت گردوں کی کل تعداد ایک سو سے زیادہ نہیں ہے۔ اس صورتحال کی وجہ سے افغانستان اور تاجکستان کے درمیان بھی کشیدگی پیدا ہو چکی ہے۔ اطلاعات ہیں کہ اس تنظیم کے تین دہشت گرد 6 ستمبر کو تاجکستان میں داخل ہوتے ہوئے مارے جا چکے ہیں۔ طالبان ذرائع سے تصدیق ہوئی ہے کہ تاجکستانی طالبان کے ساتھ تمام وہ لوگ ہیں جو ماضی میں افغان طالبان کی صفوں میں باقاعدہ شریک تھے، اب انہیں الگ کر کے TTT کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔

## ٹی ٹی ٹی کے مقاصد:

ٹی ٹی ٹی کا بنیادی مقصد بھی پاکستان کی طرح تاجکستان کو بلیک میل کر کے مذاکرات کی میز پر لانا اور اپنی شرائط تسلیم کروانا ہے۔ طالبان ذمہ داران کا کہنا ہے کہ تاجکستان حکومت سرکاری طور پر طالبان دشمن گروپ NRF کو سپورٹ کر رہی ہے، انہیں دفاتر اور آمد و رفت کی سہولیات فراہم کرتی ہے، اور طالبان کی جانب سے بار بار مطالبے کے باوجود مذاکرات نہیں کر رہی۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ تاجکستان حکومت کے پاس افغانستان کے چرائے ہوئے ہیلی کاپٹر موجود ہیں، وہ واپس نہیں کیے جا رہے۔

تیسرا مقصد وہی ہے جو پاکستان کے ساتھ ہے کہ تاجکستان امریکہ سے تعاون کرتے ہوئے افغانستان کی جاسوسی میں سہولت دے رہا۔ ٹی ٹی پی کی اصل حقیقت یہ ہے کہ اس کا لیڈر مہدی ارسلان ماضی میں القاعدہ کے ساتھ رہ چکا ہے۔ وہ اور اس کے کچھ ساتھی شام بھی گئے، جہاں داعش کے ساتھ رابطوں میں آئے۔ واپس افغانستان آ کر یہ لوگ القاعدہ چھوڑ کر طالبان میں شامل ہو گئے۔ طالبان

قیادت کی گفتگو سے اندازہ یہ ہو رہا ہے کہ وسطی ایشیا کے جو دہشت گرد القاعدہ یا طالبان کا حصہ رہے ہیں، انہیں اس تنظیم کے تحت جمع کیا جائے گا۔

## ایران کے خلاف نیا مورچہ

ہیبت اللہ رجیم عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ کرنے کو تیار نہیں، البتہ دہشت گردی اور اپنے استبداد کے لئے ان کا دماغ بہت زرخیز ہے اور نئے نئے منصوبے سوچتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح نیمروز اور سمنگان کو دہشت گردی کا نیا مرکز بنا دیا گیا ہے، جہاں پاکستان کے خلاف بلوچستان میں دہشت گردی کرنے والے گروپس کی میزبانی کی جا رہی ہے تو دوسری جانب ایران کے خلاف دہشت گردوں کے اڈے بھی اسی سرزمین پر موجود ہیں۔ 2025 کے آخر میں ایران کے خلاف ایک اہم پیش رفت سامنے آئی، جو ہیبت اللہ رجیم خصوصاً طالبان کے عالمی استعماری قوتوں کے آلہ کار ہونے کو ثابت کر رہی ہے، ہوا یہ کہ کم از کم چار دہشت گرد تنظیموں نے باضابطہ طور پر اپنی تحلیل کا اعلان کرتے ہوئے ایک نئے متحدہ دہشت گرد گروہ کے قیام کا اعلان کیا ہے، جسے ''جبہۃ المبارزین مردمی'' (جے ایم ایم) کا نام دیا گیا ہے۔ اس تنظیم کا انگریزی نام ''پیپلز فرنٹ'' رکھا گیا ہے۔ جن تنظیموں نے خود کو تحلیل کر کے اس نئی تنظیم میں شمولیت اختیار کی ہے ان میں جیش العدل (JUA)، جبہ محمد رسول اللہ (JMR)، پادا بلوچ موومنٹ (PBM) اور حرکت النصرہ بلوچستان (HNB) شامل ہیں۔

اس اتحاد کا اعلان جیش العدل کے ٹویٹر ہینڈل پر کیا گیا ذرائع کے مطابق مزید تین بلوچ دہشت گرد تنظیمیں بھی اس میں شامل ہونے کو تیار ہیں، تاہم انہوں نے ابھی تک اپنی تحلیل کا باضابطہ اعلان نہیں کیا، لیکن انہیں تنظیم کے قیام میں شامل تصور کیا جا رہا ہے۔ ان تنظیموں میں انصار الفرقان (AUF)، بلوچ نیشنل آرمی (BNA) اور مزاران بلوچ (MB) شامل ہیں۔ یہ تینوں تنظیمیں بغیر تحلیل ہوئے اس اتحاد میں شامل ہونا چاہتی ہیں نئی تنظیم کے قیام سے ایک روز قبل، یعنی 9 دسمبر کو، جیش العدل کے ترجمان اجل بلوچ نے اپنے ٹوئٹر اکاؤنٹ پر جیش العدل کی تحلیل کا اعلان کیا۔

## جے ایم ایم کی قیادت

جے ایم ایم کی قیادت کا ابھی اعلان نہیں کیا گیا، صرف ترجمان کو منظر عام پر رکھا جائے گا جبکہ باقی

قیادت کو حتمی شکل دی جارہی ہے۔محمود بلوچ کا نام ترجمان کے طور پر سامنے آیا ہے،جس نے تنظیم کے نام سے فارسی اور انگریزی زبان میں ٹوئٹر اکاؤنٹس بنا کر 10 دسمبر کو نئی تنظیم کے قیام کا اعلان کیا۔اس اعلان کے ساتھ تنظیم کا نیا پرچم اور لوگو بھی جاری کیا گیا ذرائع کے مطابق یہ نئی دہشت گرد تنظیم فوجی ڈھانچے کے تحت کام کرے گی،جس کے تحت مختلف ناموں سے بٹالینز تشکیل دی جارہی ہیں جو ایران کے اندر دہشت گرد کارروائیوں کو منظم کریں گی۔ابتدائی مرحلے میں اس تنظیم کا اتحاد BRAS اور پاکستان میں سرگرم دیگر بلوچ دہشت گرد گروپوں کے ساتھ کیا جارہا ہے،جبکہ بی ایل ایف بھی اس اتحاد میں شامل ہورہی ہے۔اسی دن،یعنی 10 دسمبر کو،تنظیم کے قیام کے اعلان کے ساتھ ہی اس نئی تنظیم نے پاکستان کی سرحد کے قریب تفتان کے علاقے دیپاتان میں ایرانی پاسداران انقلاب کے امام حسین بٹالین کے گشتی دستے پر حملہ کیا،جس میں چار پاسداران ہلاک ہوئے۔

جے ایم کے ترجمان محمود بلوچ نے اپنے بیان میں کہا کہ تنظیم آزاد بلوچستان کے لیے کام کرے گی۔تمام شامل تنظیموں کی قیادت اس وقت افغانستان میں موجود ہے۔جیش العدل کے مراکز افغانستان کے صوبہ نیمروز کے صوبائی دارالحکومت زرنج کے قریب واقع ہیں۔ یہ افراد نہ صرف دہشت گردی میں ملوث ہیں بلکہ افغان شہریوں کی انسانی اسمگلنگ میں بھی شامل ہیں۔دیگر تنظیمیں بھی نیمروز،بغلان اور ہرات میں موجود ہیں،جبکہ اس اتحاد سے متعلق تمام اہم مذاکرات بھی زرنج میں ہی ہوئے۔ذرائع کے مطابق بلوچ،اہوازی عربوں اور کرد مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر ایران اور پاکستان کے خلاف استعمال کرنے کا منصوبہ دراصل اسرائیلی منصوبہ ہے۔اس سلسلے میں حتمی فیصلہ جنوری 2025 کے آخری ہفتے میں لندن میں ہونے والے ایک اجلاس میں کیا گیا،جس میں بلوچ دہشت گرد حیربیار مری اور دیگر افراد نے بھارت کی خفیہ ایجنسی را اور اسرائیلی موساد کے اہلکاروں سے ملاقات کی۔اس کے فوراً بعد فروری 2025 کے دوسرے ہفتے میں ایران کے شہر سرباز میں بی آر اے ایس کے تین روزہ اجلاس میں اس منصوبے پر تفصیلی غور کیا گیا،جس میں را کے نمائندوں اور بلوچ دہشت گرد قیادت نے شرکت کی۔تیسرا اجلاس مارچ کے پہلے ہفتے میں قندھار میں ہوا، جہاں افغان سرزمین پر بلوچ دہشت گردوں کو ٹھکانے فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

## افغانستان کے پڑوسیوں کا نیا امتحان

ہیبت اللہ اخوندزادہ کی زیر قیادت طالبان کا اصل چہرہ اب مکمل طور پر بے نقاب ہو چکا ہے۔وہ تنظیم جو کبھی امن،آزادی اور شریعت کے نفاذ کے دعوے کرتی تھی،آج اپنے ہی بنیادی موقف سے انحراف کرتی

دکھائی دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طالبان اب ایک نظریاتی تحریک نہیں رہے بلکہ ایک ایسے اقتدار پسند گروہ میں تبدیل ہو چکے ہیں، جس کی بنیاد شخصی حکمرانی، اندرونی جبر اور مفادات کے تحفظ پر کھڑی ہے۔ ملا ہیبت اللہ کی قیادت میں طالبان کا نظام بتدریج ایک شخصی استبداد کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

ہیبت اللہ نے اپنی بادشاہت کے تحفظ کے لئے دنیا بھر کی دہشت گرد تنظیموں کو نہ صرف افغانستان میں بسانا شروع کر دیا ہے، بلکہ وہ اپنے سیاسی مقاصد کے لئے ان دہشت گرد تنظیموں کو پورے میں استعمال کرنے کی منصوبہ بندی بھی کر رہے ہیں، یہ صورتحال پاکستان سمیت ہمسایہ ممالک کے لیے بھی یہ ایک سنگین خطرہ بن چکی ہے۔

سرحدی علاقوں میں دہشت گرد تنظیموں کے مراکز کی سرپرستی اور اس بات کا ثبوت ہے کہ طالبان کی پالیسیوں کا دائرہ کار اب علاقائی سلامتی کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ طالبان کا نیا چہرہ خاص طور پر اس حوالے سے زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا ہے کہ وہ بظاہر ایک ریاستی ڈھانچے کی صورت میں موجود ہیں لیکن عملی طور پر ایک غیر شفاف اور غیر جوابدہ نظام کے تحت عالمی دہشت گردی کا ایک نیا نظام قائم کرنے کی کوشش میں ہیں۔

اس سے نہ صرف دہشت گرد عناصر کو پنپنے کا موقع ملتا ہے بلکہ انہیں ایک محفوظ ماحول بھی فراہم ہوتا ہے، جس کے اثرات سرحد پار تک پہنچتے ہیں۔ یہ بھی واضح ہوتا جا رہا ہے کہ طالبان کی ترجیحات میں عوامی فلاح یا ریاستی استحکام شامل نہیں بلکہ اقتدار کا تسلسل اور اپنے حلقے کا تحفظ زیادہ اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اندرونی اختلافات بڑھ رہے ہیں اور مختلف علاقوں میں مزاحمت کی فضا بھی پیدا ہو رہی ہے۔

جب کسی نظام میں انصاف اور شمولیت کا فقدان ہو تو اس کے خلاف ردعمل فطری امر ہوتا ہے۔ ملا ہیبت اللہ کی قیادت میں طالبان نے جس راستے کا انتخاب کیا ہے، وہ نہ صرف افغانستان کے لیے نقصان دہ ہے بلکہ پورے خطے کے لیے عدم استحکام کا باعث بن سکتا ہے۔ ایک ایسی قوت جو نہ شفاف ہو، نہ جوابدہ اور نہ ہی اصولی، وہ کبھی پائیدار امن کی ضامن نہیں بن سکتی۔ طالبان کا نیا چہرہ ایک تلخ حقیقت کے طور پر سامنے آیا ہے۔ یہ وہ چہرہ ہے جس میں نہ نظریہ باقی رہا ہے اور نہ ہی وہ دعوے، جن کی بنیاد پر وہ برسوں تک اپنی جدوجہد کو جائز قرار دیتے رہے۔ اب یہ ایک ایسی حقیقت بن چکا ہے جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

---

# باب ششم

## طالبان دنیا کی نظر میں۔۔

افغانستان میں طالبان کی موجودہ رجیم کو اقتدار میں آئے تقریباً پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہے، تاہم اس دوران افغان طالبان عالمی برادری کو اعتماد میں لینے اور ایک مستحکم، شفاف اور قابلِ قبول حکومتی ڈھانچہ قائم کرنے میں اب تک ناکام دکھائی دیتے ہیں۔ اس ناکامی کی بنیادی وجوہات ان پالیسیوں اور عملی اقدامات سے جڑی ہوئی ہیں جن کے نتیجے میں افغانستان کے اندر انسانی حقوق، سیاسی آزادیوں اور سیکیورٹی کے حالات مجموعی طور پر مزید غیر یقینی ہو گئے ہیں۔ یہی داخلی صورتحال بین الاقوامی سطح پر

افغانستان کے بارے میں تشویش اور عدم اعتماد کو مسلسل بڑھا رہی ہے۔

طالبان کے حوالے سے آج پوری دنیا تشویش کی حالت میں ہے۔ صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا کا تقریباً ہر معتبر عالمی ادارہ افغانستان کو ایک سنگین خطرہ اور طالبان کو اس بحران کی بنیادی وجہ قرار دے رہا ہے۔ اقوام متحدہ، ایمنسٹی انٹرنیشنل، ہیومن رائٹس واچ، ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل، اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل، عالمی مالیاتی ادارے اور مختلف بین الاقوامی تھنک ٹینکس مسلسل خطرے کی گھنٹی بجا رہے ہیں۔ طالبان ان تمام رپورٹس اور تنقید کو ''مخالفانہ پروپیگنڈہ'' قرار دے کر مسترد کرتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر سے آنے والی رپورٹس ایک ہی تصویر پیش کر رہی ہیں۔ اگر یہ سب صرف پروپیگنڈہ ہے تو پھر روس جیسا ملک، جس نے طالبان کے ساتھ سفارتی روابط بڑھائے اور انہیں عملی طور پر قبول کرنے کی راہ اختیار کی، اس کی وزارت خارجہ افغانستان کو دہشت گردی کا مرکز کیوں قرار دے رہی ہے؟ روسی ادارے طالبان کو ''پیچیدہ کلنگ مشین'' کیوں کہہ رہے ہیں؟ چین جیسا قریبی شراکت دار افغانستان میں شدت پسند تنظیموں کی موجودگی پر مسلسل تشویش کیوں ظاہر کر رہا ہے؟ حقیقت یہی ہے کہ طالبان خود بھی جانتے ہیں کہ افغانستان کی اصل صورتحال وہ نہیں جو ان کے ترجمان دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

## اقوام متحدہ کی مسلسل نگرانی اور تشویش

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل تسلسل کے ساتھ طالبان رجیم کی نگرانی کر رہی ہے اور اپنی رپورٹس کے ذریعہ سے دنیا کو خبردار بھی کر رہی ہے۔ ان رپورٹس نے طالبان حکومت کے اس پورے ڈھانچے کو بے نقاب کیا ہے جو بظاہر استحکام دکھائی دیتا ہے مگر اندر سے خوف، جبر، نظریاتی شدت پسندی، نسلی امتیاز اور دہشت گرد گروہوں کے ساتھ تعلقات پر قائم ہے۔ رپورٹ واضح کرتی ہے کہ طالبان نے پورے افغانستان، خصوصاً بڑے شہروں پر اپنا کنٹرول مضبوط کر لیا ہے، لیکن یہ اقتدار عوامی حمایت کے بجائے سخت داخلی دباؤ اور طاقت کے ذریعے قائم رکھا گیا ہے۔ طالبان عوامی رائے یا عالمی برادری کے تحفظات کو اہمیت دینے کے بجائے یہ سمجھتے ہیں کہ افغانستان پر حکومت کرنا ان کا ''شرعی اور فطری حق'' ہے۔

ہیبت اللہ اخوندزادہ کی قیادت میں طالبان نے افغانستان کو ایک مکمل مذہبی تھیوکریٹک نظام میں تبدیل کرنا شروع کر دیا ہے۔ قندھار کو اقتدار کا مرکز بنا کر ہیبت اللہ نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں سمیٹ لیے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق انہوں نے ہر صوبے میں علماء کونسلیں قائم کرنے کا حکم دیا، شریعت کے نام پر

عوامی سزاؤں اور پھانسیوں کو دوبارہ شروع کیا اور حکومت کے تمام اہم اداروں کو اپنے وفادار افراد کے ذریعے کنٹرول میں لیا۔ طالبان کے اندر اختلافات موجود ہیں، خاص طور پر حقانی نیٹ ورک اور قندھار گروپ کے درمیان، مگر ہیبت اللہ نے ایسا سخت نظم قائم کیا ہے کہ کوئی کھل کر مخالفت نہیں کر سکتا۔ سراج الدین حقانی نسبتاً نرم پالیسیوں کے حامی سمجھے جاتے ہیں، لیکن اقتدار بچانے کے لیے وہ بھی ہیبت اللہ کی اطاعت پر مجبور ہیں۔ عباس ستانکزئی جیسے رہنماؤں نے جب خواتین کی تعلیم پر پابندیوں پر تنقید کی تو انہیں عہدے سے ہٹا دیا گیا، ان کے خلاف گرفتاری کے احکامات جاری ہوئے اور وہ جلاوطنی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

طالبان حکومت کا سب سے خطرناک پہلو تعلیم اور سماجی ڈھانچے کی نظریاتی تشکیل نو ہے۔ اقوام متحدہ کے مطابق طالبان نے پورے تعلیمی نظام کو اپنی مخصوص مذہبی تعبیر کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیا ہے۔ اسکولوں سے لے کر جامعات تک نصاب تبدیل کیا جا رہا ہے۔ آئینی قانون، جمہوریت، انسانی حقوق، خواتین کے حقوق، انتخابی نظام، اخلاقی فلسفہ اور خواتین کی عمرانیات جیسے مضامین ختم کر دیے گئے ہیں۔ دو سو سے زائد مضامین کو صرف اسی صورت میں پڑھانے کی اجازت ہوگی جب انہیں طالبان نظریات کے مطابق دوبارہ لکھا جائے۔ نصاب سے عالمی اداروں کے مواد، شہری اقدار اور جدید سیاسی تصورات کو نکال کر ان کی جگہ طالبان نظریہ، مغرب دشمنی اور ہیبت اللہ سے وفاداری کو شامل کیا جا رہا ہے۔ طالبان ایک ایسی نسل تیار کرنا چاہتے ہیں جو سوال نہ کرے بلکہ صرف اطاعت کرے۔

خواتین اور لڑکیوں کی صورتحال افغانستان کی تاریخ کے بدترین دور میں داخل ہو چکی ہے۔ یونیسف کے جینڈر رانڈیکس کے مطابق ہر دس میں سے آٹھ افغان خواتین تعلیم اور روزگار سے محروم ہیں۔ افغانستان دنیا میں صنفی تفریق کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر پہنچ چکا ہے۔ طالبان کے فیصلوں کی وجہ سے معیشت کو سالانہ ایک ارب ڈالر سے زیادہ نقصان ہو رہا ہے۔ خواتین کو سماجی زندگی، ملازمت، تعلیم اور عوامی سرگرمیوں سے تقریباً خارج کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی فوجداری عدالت نے ہیبت اللہ اخوندزادہ اور عبدالحکیم حقانی کے خلاف صنفی بنیادوں پر ظلم و ستم کے الزامات کے تحت گرفتاری کے وارنٹ جاری کیے۔

رپورٹ یہ بھی واضح کرتی ہے کہ طالبان کے دعووں کے باوجود افغانستان میں مزاحمت مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔ قومی مزاحمتی محاذ (NRF) اور افغانستان فریڈم فرنٹ (AFF) اب بھی طالبان کے خلاف حملے کر

رہے ہیں۔ اگرچہ 2025 میں ان حملوں میں نمایاں کمی آئی، مگر یہ مزاحمت اب بھی موجود ہے۔ NRF نے جنوری سے جولائی 2025 کے درمیان 73 حملوں جبکہ AFF نے 43 حملوں کی ذمہ داری قبول کی۔ تاہم اقوام متحدہ کے مطابق یہ کارروائیاں منتشر اور محدود ہیں اور طالبان حکومت کے لیے فوری خطرہ نہیں بن سکیں۔

رپورٹ کا سب سے تشویشناک حصہ افغانستان میں سرگرم دہشت گرد تنظیموں سے متعلق ہے۔ اقوام متحدہ کے مطابق افغانستان اس وقت بیس سے زائد بین الاقوامی اور علاقائی دہشت گرد گروہوں کی محفوظ پناہ گاہ بنا ہوا ہے۔ داعش خراسان، القاعدہ، تحریک طالبان پاکستان، ایسٹ ترکستان اسلامک موومنٹ، ترکستان اسلامک پارٹی اور تاجکستان کی جماعت انصار اللہ وہاں سرگرم ہیں۔ طالبان اگرچہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے داعش خراسان کو شکست دے دی، مگر سلامتی کونسل کی رپورٹ اس دعوے کو مسترد کرتی ہے۔ داعش اب بھی حملے کرنے، بھرتیاں کرنے اور بیرونی کارروائیوں کی منصوبہ بندی کی صلاحیت رکھتی ہے۔ خلیل حقانی پر خودکش حملہ اس کی واضح مثال ہے۔

داعش خراسان اب جدید ٹیکنالوجی استعمال کر رہی ہے۔ رپورٹ کے مطابق تنظیم مصنوعی ذہانت کے ذریعے بم سازی کی ہدایات تیار کر رہی ہے اور تھری ڈی پرنٹرز کے ذریعے اسلحہ کے پرزے بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ تنظیم نے تاجکستان اور ازبکستان سے سیکڑوں نوجوان بھرتی کیے، جن میں سے بعض افغانستان پہنچے جبکہ بعض کو یورپ بھیجا گیا۔ داعش نے افغانستان کے مختلف علاقوں، خاص طور پر شمالی افغانستان اور پاکستان سے ملحقہ علاقوں میں مدارس قائم کیے ہیں جہاں کم عمر بچوں کو خودکش اور نظریاتی تربیت دی جاتی ہے۔

تحریک طالبان پاکستان کے حوالے سے رپورٹ پاکستان کے خدشات کی مکمل تصدیق کرتی ہے۔ اقوام متحدہ کے مطابق ٹی ٹی پی نے اپنی کارروائیوں میں اضافہ کیا ہے اور یہ پاکستان کی سلامتی کے لیے سب سے بڑا فوری خطرہ بن چکی ہے۔ رپورٹ میں واضح کہا گیا ہے کہ طالبان یا تو ٹی ٹی پی کے خلاف کارروائی نہیں کرنا چاہتے یا ان کے پاس اس کی صلاحیت نہیں۔ تاریخی، قبائلی اور نظریاتی تعلقات نے دونوں گروہوں کو ایک دوسرے کے قریب رکھا ہوا ہے۔ نور ولی محسود کے کابل، قندھار، کنڑ، ننگرہار اور پکتیا کے دوروں کا ذکر بھی رپورٹ میں موجود ہے۔ اقوام متحدہ کے مطابق ٹی ٹی پی کے تقریباً چھ ہزار دہشت گرد

افغانستان میں موجود ہیں۔

القاعدہ کے بارے میں بھی سلامتی کونسل کی رپورٹ نہایت واضح ہے۔ طالبان بدستور القاعدہ کی میزبانی اور حمایت کر رہے ہیں۔ القاعدہ کے سینئر رہنما کابل میں موجود ہیں جبکہ سیف العدل نے افغانستان کو ''محفوظ پناہ گاہ'' قرار دے کر اپنے دہشت گردوں کو وہاں آنے کی دعوت دی۔ القاعدہ اب ڈرون ٹیکنالوجی، جدید اسلحہ اور تکنیکی مہارتوں پر توجہ دے رہی ہے۔

افغانستان کی داخلی صورتحال بھی شدید بحران کا شکار ہے۔ نوے فیصد آبادی خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہی ہے جبکہ ستر فیصد سے زیادہ لوگ انسانی امداد پر انحصار کرتے ہیں۔ بے روزگاری پچھتر فیصد تک پہنچ چکی ہے۔ رپورٹ کے مطابق 2025 کی پہلی ششماہی میں افغانستان کی جی ڈی پی میں 5.6 فیصد کمی آئی۔ بین الاقوامی ادائیگیوں کا نظام تقریباً مفلوج ہے اور غیر رسمی حوالہ نیٹ ورک معیشت چلا رہے ہیں۔ منشیات کی معیشت بدستور قائم ہے۔ اگرچہ افیون کی کاشت میں کمی آئی، مگر اب میتھ ایمفیٹامین جیسی مصنوعی منشیات تیزی سے پھیل رہی ہیں بے روزگاری نے کسانوں اور اسمگلروں کو اس نئی منشیات کی طرف دھکیل دیا ہے۔

اقوام متحدہ کی رپورٹ میں ماحولیاتی اور انسانی بحرانوں کا بھی تفصیل سے ذکر ہے۔ خشک سالی نے زرعی پیداوار تباہ کر دی ہے، زلزلوں نے محدود وسائل کو مزید متاثر کیا ہے اور کابل کو شدید آبی قلت کا خطرہ درپیش ہے۔ اقوام متحدہ نے خبردار کیا ہے کہ کابل دنیا کا پہلا جدید دارالحکومت بن سکتا ہے جو پانی کے شدید بحران کا شکار ہوگا۔ افغان مہاجرین کی زبردستی واپسی نے بحران کو مزید سنگین بنا دیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق پاکستان اور ایران سے ساڑھے چار ملین سے زیادہ افغان واپس بھیجے جا چکے ہیں۔ طالبان کی پابندیوں کے باعث بین الاقوامی اداروں کے لیے ان مہاجرین کی مدد کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ بیرون ملک مقیم افغانوں کی ترسیلات میں کمی نے لاکھوں خاندانوں کو مزید غربت میں دھکیل دیا ہے۔

نسلی امتیاز بھی طالبان حکومت کا اہم پہلو بن چکا ہے۔ رپورٹ کے مطابق ہزاروں تاجک اور ازبک دہشت گردوں کو برطرف کیا گیا، خاص طور پر ان علاقوں میں جہاں غیر پشتون آبادی زیادہ تھی۔ بدخشان، تخار، پروان اور کاپیسا جیسے صوبے اس پالیسی سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طالبان اقتدار کو ایک محدود نسلی اور نظریاتی حلقے تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق طالبان اور پاکستان کے

درمیان سرحدی کشیدگی بڑھ رہی ہے۔ سرحدی جھڑپوں اور راستوں کی بندش سے افغانستان کو روزانہ تقریباً دس لاکھ ڈالر نقصان ہو رہا ہے۔ اقوام متحدہ نے خبردار کیا ہے کہ اگر بنیادی تنازعات حل نہ ہوئے تو صورتحال براہ راست فوجی تصادم کی طرف جا سکتی ہے۔

سلامتی کونسل نے یہ بھی انکشاف کیا کہ طالبان کے 135 افراد اور پانچ اداروں پر پابندیاں برقرار ہیں، جبکہ متعدد طالبان رہنما عالمی سفری پابندیوں کے باوجود مختلف ممالک کے دورے کر رہے ہیں۔ چین، روس، قطر، پاکستان، بھارت، سعودی عرب، ترکی اور متحدہ عرب امارات سمیت کئی ممالک نے طالبان رہنماؤں کو سفری استثنیٰ دیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا طالبان سے رابطے تو رکھنا چاہتی ہے، مگر انہیں مکمل طور پر قابلِ اعتماد حکومت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اقوام متحدہ کی اس رپورٹ کا خلاصہ یہی ہے کہ طالبان نے افغانستان میں ظاہری کنٹرول تو قائم کر لیا ہے، مگر یہ استحکام مصنوعی، خوف پر مبنی اور غیر پائیدار ہے۔ افغانستان آج بھی دہشت گردی، منشیات، انسانی بحران، نسلی تقسیم، خواتین پر ظلم، معاشی تباہی اور علاقائی عدم استحکام کا مرکز بنا ہوا ہے۔ طالبان شاید ہر تنقید کو ''پروپیگنڈہ'' کہہ کر رد کرتے رہیں، مگر جب اقوام متحدہ سے لے کر روس، چین، انسانی حقوق کے اداروں اور عالمی مالیاتی تنظیموں تک سب ایک ہی تصویر پیش کر رہے ہوں تو پھر مسئلہ پروپیگنڈہ نہیں بلکہ وہ تلخ حقیقت ہے جس کا سامنا آج پورا افغانستان اور اس کے گرد موجود خطہ کر رہا ہے۔

اقوام متحدہ کے معاون مشن برائے افغانستان (UNAMA) کی 2025 کی رپورٹیں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ملک میں انسانی حقوق کی صورتحال اب بھی شدید دباؤ کا شکار ہے۔ ان رپورٹوں میں سابق حکومتی اہلکاروں، سیکیورٹی فورسز کے اراکین، صحافیوں اور سول سوسائٹی سے وابستہ افراد کے خلاف گرفتاریوں، تشدد، دھمکیوں اور بعض صورتوں میں ماورائے عدالت کارروائیوں کے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ خواتین پر تعلیمی و سماجی پابندیاں، اظہارِ رائے پر قدغن اور عدالتی نظام میں غیر شفافیت جیسے مسائل کو بھی نمایاں کیا گیا ہے جو مجموعی طور پر انسانی حقوق کی صورتحال کو مزید خراب کرتے ہیں۔

## شنگھائی تعاون کونسل کی نظر میں

شنگھائی تعاون تنظیم، جو ایک سیاسی اور سیکیورٹی بلاک ہے اور جس میں چین، روس، بھارت، پاکستان اور کئی وسط ایشیائی ممالک شامل ہیں، نے گزشتہ عرصے میں انسدادِ دہشت گردی کے تعاون پر زیادہ توجہ دی

ہے۔ RATS یعنی Regional Anti-Terrorist Structure کے نام سے اس کا ایک ادارہ اسی مقصد کے لیے بنیادی پلیٹ فارم کے طور پر کام کرتا ہے جہاں انٹیلی جنس کے تبادلے اور مشترکہ ردِعمل کی حکمتِ عملیوں پر کام کیا جاتا ہے۔ شنگھائی تعاون تنظیم سے منسلک علاقائی سلامتی کے اسی ادارے نے خبردار کیا ہے کہ افغانستان میں موجود دہشت گرد گروہ اپنی عملی صلاحیت بڑھا رہے ہیں اور پورے خطے کے لیے بڑھتا ہوا خطرہ بنتے جا رہے ہیں۔ رکن ممالک نے ان خطرات پر تشویش ظاہر کی جنہیں انہوں نے انتہا پسند اور علیحدگی پسند گروہوں کی "ارتقا پذیر اور مضبوط ہوتی ہوئی سرگرمیوں قرار دیا۔ کونسل نے اپنے بیان میں کہا کہ افغانستان اور شام میں سرگرم مسلح گروہوں نے اپنی جنگی صلاحیت میں نمایاں اضافہ کیا ہے جس سے رکن ممالک کو درپیش سیکیورٹی خطرات کی نوعیت تبدیل ہوگئی ہے۔ کونسل کی یہ وارننگ اس مسلسل علاقائی تشویش کا اظہار ہے جو طالبان کے 2021 میں دوبارہ اقتدار میں آنے کے بعد سے برقرار ہے۔ اگرچہ افغانستان میں بڑے پیمانے پر لڑائی کم ہوئی ہے لیکن مسلح گروہ جن میں داعش کے ذیلی گروہ اور دیگر دہشت گرد تنظیمیں شامل ہیں سرگرم ہیں، جس سے پڑوسی ممالک میں سرحد پار بدامنی کے خدشات بڑھ رہے ہیں۔ منطقے کے ممالک، خاص طور پر وسط ایشیائی ریاستیں، بارہا یہ تشویش ظاہر کر چکی ہیں کہ دہشت گرد گروہ افغانستان کی صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوبارہ منظم ہو سکتے ہیں، بھرتیاں کر سکتے ہیں اور اپنی سرگرمیوں کو سرحدوں سے باہر پھیلا سکتے ہیں۔ RATS کونسل کے بیان میں رکن ممالک کے درمیان دہشت گردی، انتہا پسندی اور علیحدگی پسندی کے مقابلے کے لیے زیادہ قریبی تعاون پر زور دیا گیا اور انٹیلی جنس کے تبادلے اور مشترکہ سیکیورٹی اقدامات کو مزید بڑھانے کی ضرورت پر بات کی گئی۔ RATS کے اجلاس میں وسیع تر علاقائی کشیدگیوں پر بھی بات کی گئی۔ کونسل نے ایران میں حالیہ فوجی حملوں پر تشویش ظاہر کی اور ایران کی خودمختاری اور علاقائی سالمیت کی حمایت کی۔ کونسل نے طاقت کے استعمال کو ناقابل قبول قرار دیا اور کہا کہ تنازعات کو بات چیت اور بین الاقوامی قانون اور اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق حل کیا جانا چاہیے۔ یہ وارننگ ایسے وقت میں سامنے آئی ہے جب خطہ شدید جیو پولیٹیکل غیر یقینی صورتحال سے گزر رہا ہے۔ مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا میں جاری بحرانوں نے عدم استحکام کے خدشات کو مزید بڑھا دیا ہے۔ افغانستان میں دہشت گرد سرگرمیوں میں دوبارہ اضافہ پورے خطے پر اثر ڈال سکتا ہے خاص طور پر ان ممالک پر جو پہلے ہی سیکیورٹی اور معاشی پریشانیوں سے نمٹ رہے ہیں۔

دوسری جانب شنگھائی تعاون تنظیم کے ریجنل اینٹی ٹیررسٹ اسٹرکچر 2025 کی رپورٹیں افغانستان کو خطے میں ایک بڑھتے ہوئے سیکیورٹی خطرے کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ ان رپورٹوں کے مطابق افغانستان میں سرگرم بعض انتہا پسند اور مسلح گروہ اپنی تنظیمی صلاحیت اور نیٹ ورکس کو مضبوط بنا رہے ہیں، سرحد پار نقل وحرکت اور آن لائن بھرتی کے ذریعے خطے کے دیگر ممالک کے لیے بھی خطرات پیدا کر رہے ہیں۔ یہ صورتحال نہ صرف افغانستان بلکہ پورے وسطی وجنوبی ایشیا کے سیکیورٹی توازن پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

## کہتی ہے خلق خدا

افغانستان میں انسانی حقوق اور سیکیورٹی کی صورتحال سے متعلق مختلف عالمی رپورٹیں ایک ایسے تشویشناک منظرنامے کی نشاندہی کرتی ہیں جسے خطے کے لیے ایک مسلسل مسئلہ قرار دیا جا رہا ہے۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران سامنے آنے والے شواہد اور میڈیا رپورٹیں کے مطابق طالبان کے دور میں وسیع پیمانے پر گرفتاریاں، ماورائے عدالت ہلاکتیں اور سابق فوجیوں سمیت مختلف افراد کی جبری گمشدگی کے واقعات رپورٹ ہوتے رہے ہیں۔ اگرچہ ان الزامات کے باوجود طالبان بارہا میڈیا، انسانی حقوق کی تنظیموں اور فیلڈ تحقیقات کو مسترد کرتے ہوئے انہیں بے بنیاد قرار دیتے ہیں، تاہم مختلف آزاد ذرائع اس صورتحال کو ایک سنگین انسانی حقوق کے بحران کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

## سرنڈر کرنے والے سابق فوجیوں کا قتل عام

حال ہی میں طالبان کے انٹیلی جنس سے منسلک ایک خفیہ رکن کی ایک ویڈیو ریکارڈنگ منظر عام پر آئی ہے جس میں ایک طالب علم کے قتل کا محض ذکر ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس کارروائی کے طریقہ کار، کپڑوں کی تبدیلی اور حملہ آور کو دی جانے والی رقم کی تفصیلات تک بیان کی گئی ہیں۔ ویڈیو میں ایک شخص ایک دوسرے فرد کو قتل کے منصوبے کی تفصیل سمجھاتے ہوئے یہ یقین دہانی کرا رہا ہے کہ تمام سامان اور مالی معاونت فراہم کی جائے گی۔ یہ شخص ایک ہی کارروائی تک محدود نہیں تھا بلکہ سابق فوجیوں اور عام شہریوں کے خلاف متعدد مبینہ ٹارگٹ حملوں میں بھی ملوث رہا ہے۔ مزید تحقیقات سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ وہ مختلف ناموں سے متعدد سوشل میڈیا اکاؤنٹس بھی چلا رہا تھا۔ اس شخص کی شناخت امان اللہ ولد آغا جان کے طور پر کی گئی ہے جو غوث وادی کے دیہہ کٹھوری کا رہائشی ہے اور اس وقت درہ پلتہ کے باغ امان گاؤں میں رہائش پذیر

بتایا گیا ہے۔ ان سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ وہ طالبان کی کرائم انویسٹی گیشن یونٹ میں ضلع محمود راقی (صوبہ کاپیسا) کے دوسرے زون میں ملازم بھی تھا۔ ایسی اطلاعات بھی موجود ہیں کہ وہ کاپیسا کے طالبان گورنر کے انٹیلی جنس حلقوں کے ساتھ بھی غیر رسمی طور پر وابستہ رہا ہے۔ اسے سابق رابطہ کار مولوی عبدالوہاب نے طالبان کے صوبائی گورنر قاری بریال سے متعارف کرایا، جس کے بارے میں مبینہ طور پر القاعدہ سے روابط کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ امان اللہ نے فتح المدارس میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن تعلیم مکمل کیے بغیر چھوڑ دی۔

اقوام متحدہ کے افغانستان معاون مشن (UNAMA) کی دو رپورٹس کے مطابق 2024 کے پہلے اور دوسرے سہ ماہی میں طالبان نے 98 ایسے واقعات ریکارڈ کیے جن میں گرفتاریاں اور حراستیں شامل تھیں، اور 20 واقعات سابق حکومتی اہلکاروں یا سیکیورٹی اہلکاروں پر تشدد اور بدسلوکی کے تھے۔ سابق حکومت کی سیکیورٹی فورسز کے 9 ارکان کو قتل کیا گیا۔ UNAMA کو یہ بھی اطلاعات موصول ہوئیں کہ پاکستان سے واپس بھیجے گئے افراد کو بھی تشدد اور بدسلوکی کا سامنا کرنا پڑا۔ طالبان حکام نے جسمانی سزائیں دیں جن میں کم از کم 147 مردوں، 28 خواتین اور 4 لڑکوں کو سرعام کوڑے مارے گئے۔

یہی انٹیلی جنس اہلکار حال ہی میں سابق فوجی عبدالظاہر انتظار کو گرفتار کر چکا ہے اور مزید کئی سابق فوجیوں کی گرفتاریوں میں بھی ملوث رہا ہے، جبکہ اب وہ صحافیوں کی تلاش میں ہے تاکہ انہیں طالبان کے حوالے کیا جا سکے۔ اس سے قبل سابق حکومت کے دور میں تخار کے کمانڈر جنرل اکرام الدین سریع کو 24 دسمبر 2025 کی شام شمالی تہران کے امام حسین علاقے میں فائرنگ کر کے قتل کیا گیا تھا، اور اس کے ساتھ ایک اور سابق فوجی اہلکار محمد امین الماس کو بھی مار دیا گیا۔ اس واقعے پر شدید ردعمل سامنے آیا اور مختلف سیاسی اور عسکری حلقوں نے اسے طالبان کے سرحد پار ٹارگٹ کلنگ یونٹ سے تاہم سرکاری سطح پر مزید تفصیلات فراہم نہیں کی گئیں۔

ایسی قابل اعتماد رپورٹس موجود ہیں کہ طالبان سیکیورٹی اہلکاروں نے پنجشیر، کندھار، کابل، نیمروز، غزنی، خوست، جوزجان، فاریاب، تخار، سرپل اور ہرات صوبوں میں عام شہریوں کو من مانی طور پر قتل کیا۔ ان کارروائیوں کو بعض اوقات قومی مزاحمتی محاذ (NRF) کی سرگرمی والے علاقوں کی آبادی کے خلاف اجتماعی سزا یا سابقہ حکومت کے فوجیوں اور اہلکاروں سے انتقام کے طور پر بیان کیا گیا، جو طالبان کے عمومی

معافی کے اعلان کی خلاف ورزی ہے۔

UNAMA نے ایسے واقعات بھی ریکارڈ کیے جن میں سابق حکومتی اہلکاروں کو NRF سے وابستگی کے الزام میں گرفتار یا حراست میں لیا گیا۔ کئی معاملات میں متاثرہ افراد یا ان کے اہل خانہ نے بتایا کہ یہ الزامات جھوٹے تھے اور ان کی گرفتاری کی اصل وجہ ان کا اگست 2021 سے پہلے کی حکومت سے تعلق تھا۔

6 فروری کو میڈیا نے رپورٹ کیا کہ طالبان سیکیورٹی اہلکاروں نے شمالی صوبہ کندھار میں ایک سابق ANDSF فوجی کو قتل کر دیا اور اس کی لاش کئی گھنٹوں تک عوامی طور پر نمائش کے لیے رکھی گئی۔ طالبان نے اس سابق فوجی پر داعش-خراسان کی رکنیت کا الزام لگایا، جبکہ گاؤں والوں کو بتایا کہ وہ ایک اغوا کار تھا۔

سیاسی اور سول سوسائٹی کے کارکنوں نے دعویٰ کیا کہ طالبان اکثر سابق ANDSF فوجیوں اور سابق حکومت کے ملازمین سے بدلہ لینے کے لیے ان پر داعش-خراسان سے تعلق کا جھوٹا الزام لگا دیتے ہیں۔

## طالبان کی عام معافی ایک دھوکہ

سابق حکومت میں کام کرنے والے اہلکاروں کے لئے عام معافی کا اعلان کرنے کے بعد ملک بھر میں ان کی ٹارگٹ کلنگ کا سلسلہ طالبان کی بدترین عہد شکنی ہے۔ یہ نا صرف جدید دور کے جنگی قوانین کی خلاف ورزی ہے بلکہ اللہ رب العزت اور آقا محمد ﷺ کے احکامات کی نفی بلکہ توہین ہے۔ اللہ رب العزت نے قرآن حکیم میں دوٹوک فرمایا کہ ''وعدے پورے کرو۔'' صلح حدیبیہ کے موقع پر ایک شرط یہ تھی کہ اگر کوئی مکہ کا شہری اسلام قبول کر کے مدینہ آئے گا تو مسلمان اسے واپس لوٹانے کے پابند ہوں گے، جبکہ اگر کوئی مسلمان اسلام چھوڑ کر مکہ جائے گا تو مکہ والے اسے واپس کرنے کے پابند نہیں ہوں گے۔ ابھی معاہدہ لکھا جا رہا تھا، دستخط نہیں ہوئے تھے کہ قریش کے نمائندے سہیل بن عمرو کا بیٹے ابو جندلؓ بن سہیل بن عمرو زنجیروں میں جکڑے ہوئے مکہ سے نکل کر مسلمانوں کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ وہ اسلام قبول کر چکے تھے اور قریش انہیں قید اور تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں باندھے ہونے کے سبب زخمی تھے، خون بہہ رہا تھا، وہ آ کر آپ ﷺ کے قدموں میں گر پڑے کہ '' آقا ﷺ مجھے چھوڑ کر نہ جائیں۔ آقا محمد ﷺ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا ابو جندل میں معاہدہ کر چکا ہوں۔ صحابہؓ نے عرض کی آقا ﷺ ابھی دستخط تو نہیں ہوئے، آپ ﷺ نے فرمایا'' وعدہ ہو گیا۔'' یہ ہے، اسلام، یہ ہے شریعت اور اللہ کے رسول ﷺ کا حکم اور اس کے مقابلے میں طالبان کا طرز عمل

یہ ہے کہ لوگوں کو عام معافی کا اعلان کر کے روکا، سرنڈر کروایا، اب غریب لوگوں کا قتل عام کر رہے ہیں اور مالداروں کا مال لوٹ رہے ہیں۔ 10 مئی 2026 کو شمالی افغانستان میں خطاب کرتے ہوئے ملا برادر نے بڑے فخر سے کہا ''ملا ہیبت اللہ نے عام معافی کا اعلان کر کے بڑی حکمت عملی کا مظاہرہ کیا تھا،'' شرم کا مقام ہونا چاہئے کہ یہ لوگ وعدے کو دھوکے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں، اسے اپنی کامیابی قرار دیتے ہیں۔ اس حوالے سے افغانستان فریڈم فرنٹ کی سالانہ رپورٹ چشم کشا ہے ،جس کے مطابق 2025 کے دوران طالبان نے ملک بھر میں سابق فوجیوں کی منظم گرفتاریوں، تشدد اور قتل کے واقعات میں اضافہ کیا، جس میں کم از کم 123 سابق فوجی مختلف صوبوں میں مارے گئے جبکہ 131 افراد کو گرفتاری کے بعد جیلوں میں تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ نتائج اقوام متحدہ کے معاون مشن برائے افغانستان (یوناما) کی رپورٹس سے بھی مطابقت رکھتے ہیں جن میں سابق اہلکاروں کے خلاف انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں، ماورائے عدالت ہلاکتوں، بلا جواز گرفتاریوں اور تشدد کے واقعات کی تصدیق کی گئی ہے۔ یوناما کے مطابق کئی گرفتار افراد بعد ازاں لاپتہ ہو گئے یا ان کی لاشیں ملیں، جبکہ خاندانوں کو ان کی حالت کے بارے میں کوئی معلومات فراہم نہیں کی گئیں۔

اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندے رچرڈ بینیٹ نے بھی بارہا نشاندہی کی ہے کہ طالبان اپنے اعلان کردہ عام معافی کے وعدوں پر عمل نہیں کر رہے اور ماورائے عدالت قتل، جبری گمشدگیوں اور منظم دھمکیوں کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے، جو ملک میں خوف اور ڈر کے ماحول کو مزید گہرا کر رہا ہے۔ اسی طرح ہیومن رائٹس واچ نے بھی تصدیق کی ہے کہ طالبان نے سابق حکومتی اہلکاروں کے ریکارڈ کی بنیاد پر ان کی نشاندہی کر کے گھروں پر چھاپے مارے، گرفتاریوں اور بعض صورتوں میں قتل کے واقعات کیے، جن میں قندھار میں سابق این ڈی ایس اہلکار باز محمد کی گرفتاری اور بعد ازاں ان کی لاش ملنے کا واقعہ بھی شامل ہے۔ یہ تمام رپورٹس اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ طالبان کی تردید کے باوجود افغانستان میں انسانی حقوق کی صورتحال، خصوصاً زندگی، آزادی اور ذاتی تحفظ کے بنیادی حقوق، منظم اور وسیع پیمانے پر دباؤ اور خلاف ورزیوں کا شکار ہیں، جو خطے کے لیے ایک مسلسل اور سنجیدہ مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔

## اقوام متحدہ کی 2025 کی چشم کشا رپورٹ

2024 میں افغانستان کی صورتحال مزید خراب ہو گئی کیونکہ طالبان حکام نے انسانی حقوق کے خلاف اپنی

کریک ڈاؤن مہم تیز کر دی، خاص طور پر خواتین اور لڑکیوں کے خلاف۔ افغانستان واحد ملک رہا جہاں لڑکیوں اور خواتین کو ثانوی اور یونیورسٹی تعلیم سے منع کیا گیا، جبکہ انہیں روزگار، نقل وحرکت، اجتماع اور اظہار رائے کی آزادی میں بھی شدید رکاوٹوں کا سامنا رہا۔ طالبان نے صحافیوں اور ناقدین کو بھی حراست میں لیا اور میڈیا پر سخت پابندیاں عائد کیں۔ افغانستان کے معاشی بحران کے باعث 2 کروڑ 30 لاکھ افراد انسانی امداد کے محتاج رہے؛ خواتین اور لڑکیاں غیر متناسب طور پر متاثر ہوئیں۔

رپورٹ کے مطابق طالبان کے احکامات نے خواتین اور لڑکیوں کے تعلیم، روزگار، نقل وحرکت اور اظہار رائے کے حقوق کی خلاف ورزی کی۔ طالبان نے صنفی بنیاد پر تشدد کا شکار خواتین اور لڑکیوں کے تحفظ کے نظام کو بھی ختم کر دیا، ان کے صحت کی سہولیات تک رسائی میں امتیازی رکاوٹیں پیدا کیں، اور انہیں کھیلوں میں حصہ لینے اور پارکوں میں جانے سے بھی روک دیا۔ سخت حجاب اور محرم (مرد سرپرست) کے قوانین نے خواتین کو کام کے لیے یا طبی علاج کے لیے سفر کرنے سے روک دیا ہے۔

اگست 2025 میں طالبان نے ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کے نام سے ایک نیا قانون اعلان کیا، جس کے تحت خواتین کو بغیر مرد سرپرست کے سفر کرنے یا پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرنے سے منع کیا گیا۔ اس قانون کے تحت خواتین اور لڑکیوں کے لیے عوامی مقامات پر چہرہ ڈھانپنا لازمی قرار دیا گیا اور انہیں عوام میں گانے یا گھر سے باہر آواز بلند کرنے سے بھی روک دیا گیا۔

طالبان نے ان خواتین اور لڑکیوں کو بھی حراست میں لیا جو مقررہ لباس کے ضابطوں پر عمل نہیں کرتیں۔ اقوام متحدہ کے ماہرین نے رپورٹ کیا کہ بعض زیر حراست افراد کو کئی دن تک غیر رابطہ حالت میں رکھا گیا اور انہیں ''جسمانی تشدد، دھمکیوں اور ہراسانی'' کا سامنا کرنا پڑا۔ افغانستان میں انسانی حقوق کی صورتحال کے لیے اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندے رچرڈ بینیٹ نے اسے ''خواتین اور لڑکیوں کے خلاف ادارہ جاتی امتیاز، علیحدگی، انسانی وقار کی بے توقیری اور اخراج کا نظام'' قرار دیا ہے۔ ستمبر میں طالبان نے انہیں افغانستان آنے سے بھی روک دیا۔

## طالبان حکومت میں انسانی المیہ کی چاپ

افغانستان کی نصف سے زیادہ آبادی یعنی 2 کروڑ 37 لاکھ افراد کو 2024 میں فوری انسانی امداد کی ضرورت تھی، جن میں 1 کروڑ 24 لاکھ افراد غذائی عدم تحفظ کا شکار تھے اور 29 لاکھ افراد انتہائی درجے کی

بھوک کا سامنا کر رہے تھے۔ نومبر تک اقوام متحدہ کے انسانی ضروریات اور ردعمل کے منصوبے کو مطلوبہ فنڈز کا صرف 31 فیصد حاصل ہوا تھا، جس کے باعث انسانی امدادی پروگرام وسائل کی کمی کے باعث بند ہو گئے۔ غیر ملکی امداد کے خاتمے نے افغانستان کے صحت کے نظام کو شدید نقصان پہنچایا اور غذائی قلت اور ناکافی طبی سہولیات سے پیدا ہونے والی بیماریوں کے اثرات کو بڑھا دیا۔ خواتین اور لڑکیاں صحت کے بحران سے غیر متناسب طور پر متاثر ہوئیں۔ طالبان کی جانب سے خواتین کے روزگار پر پابندی اور گھر سے باہر نقل و حرکت پر پابندی نے امداد کی فراہمی اور حصول میں مزید امتیازی رکاوٹیں پیدا کر دیں۔ لڑکیوں اور خواتین کی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم پر پابندی کے باعث خواتین صحت کے کارکنوں کی شدید کمی بھی پیدا ہو گئی۔ معذور افراد اس بحران سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والوں میں شامل ہیں۔ امدادی فنڈز کی کمی کے باعث معذور افراد کے لیے دستیاب محدود خدمات، جیسے جسمانی بحالی اور ذہنی صحت کی مدد، 2021 میں طالبان کے قبضے کے بعد تقریباً ختم ہو گئی ہیں۔

## میڈیا اور سول سوسائٹی پر حملے

آزادی اظہار اور صحافت سے طالبان کی دشمنی پرانی ہے، جب سے اقتدار سنبھلا ہے، صحافیوں کے خلاف کارروائیوں کا سلسلہ جاری ہے، عین اس وقت جب یہ ابھی اقتدار سنبھال رہے تھے، ان کے ایک حامی پاکستانی صحافی اقبال مینگل جوش جذبات میں ذبیح اللہ مجاہد سے تحریر اجازت نامہ لے کر قندھار پہنچے لیکن اس کے باوجود انہیں گرفتاری بھگتنا پڑی، کئی روز کے بعد رہائی ممکن ہو سکی۔ ابھی کل کی بات ہے، مئی 2026 میں دو صحافیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ پوری دنیا چیخ رہی ہے۔ مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی، 12 مئی 2026 کو اقوام متحدہ کے ادارے یونامہ اور ایمنسٹی انٹرنیشنل نے صحافیوں جکی گرفتاریوں پر احتجاج کیا ہے، اور کہا ہے کہ ''یہ حراستیں افغانستان میں صحافیوں کے خلاف دھمکی اور انتقامی کارروائیوں کے ایک وسیع پیٹرن کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ نئی اِن ایگزائل نامی ایک افغان میڈیا ایڈووکیسی تنظیم نے بھی اقوام متحدہ اور یورپی یونین سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ طالبان حکام پر دباؤ ڈالیں تاکہ حراست میں لیے گئے صحافیوں کو رہا کیا جائے۔ میڈیا حقوق کی تنظیموں کے مطابق، فی الحال طالبان کی تحویل میں کم از کم سات صحافیوں کو رکھا ہوا ہے۔ 2021 میں اقتدار میں واپس آنے کے بعد سے طالبان نے آزادانہ صحافت پر وسیع پیمانے پر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں، جن میں رپورٹنگ پر سخت کنٹرول، من مانی حراستیں اور سنسر شپ

کے اقدامات میں توسیع شامل ہے۔ رپورٹرز وداؤٹ بارڈرز نامی ایک عالمی تنظیم کی طرف سے شائع کردہ تازہ ترین ورلڈ پریس فریڈم انڈیکس میں 180 ممالک میں سے 175 ویں نمبر پر جگہ حاصل کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ طالبان نے اظہارِ رائے اور میڈیا کی آزادی محدود کردی اور صحافیوں و ناقدین کو خود سرانہ طور پر حراست میں لیا اور تشدد کا نشانہ بنایا۔ ستمبر 2025 میں انہوں نے سیاسی پروگراموں کی لائیو نشریات، گروپ پر تنقید اور انٹرویوز کو پہلے سے منظور شدہ افراد تک محدود کردیا۔

2024 میں طالبان نے میڈیا کارکنوں کی گرفتاریاں جاری رکھیں، جنہیں عام طور پر کئی دن تک حراست میں رکھا گیا۔ 4 مئی کو پروان میں ایک صحافی کو افغان ڈائسپورا میڈیا کو معلومات دینے کے الزام میں گرفتار کیا گیا اور تین دن بعد رہا کیا گیا۔ 17 فروری کو خامہ پریس کے ایڈیٹر انچیف منصور نکمل کو کابل میں حجاب سے متعلق رپورٹ پر گرفتار کیا گیا اور اگلے دن رہا کردیا گیا۔ 10 فروری کو پژواک نیوز کے صحافی سیف اللہ کریمی کو ریستوران اور ہوٹل مالکان کے ٹیکس اضافے کے خلاف احتجاج سے متعلق انٹرویو کی کوشش پر گرفتار کیا گیا اور دو دن بعد رہا کیا گیا۔ 18 جنوری کو گردشِ اطلاع نیوز سینٹر کے جواد رسولی اور عبدالحق حمیدی کو گرفتار کر کے رہا کیا گیا، جبکہ 17 جنوری کو احسان اکبری کو کابل میں گرفتار کیا گیا اور 25 جنوری کو رہا کیا گیا۔ بیشتر کیسز میں طالبان نے گرفتاری کی وجوہات یا مقدمے کی معلومات فراہم نہیں کیں۔ زیرِ حراست افراد کو وکیل تک رسائی بھی نہیں دی گئی اور اکثر کو اہل خانہ سے ملاقات کی اجازت بھی نہیں ملی۔ 26 ستمبر کو معروف سیاسی تجزیہ کار جاوید کوہستانی کو طالبان کی جنرل ڈائریکٹوریٹ آف انٹیلی جنس (جی ڈی آئی) نے کابل میں گرفتار کیا اور 15 اکتوبر کو رہا کیا۔

## صحافیوں پر جسمانی حملے، قید اور دباؤ

متعدد رپورٹس کے مطابق طالبان نے صحافیوں کو تشدد، ہراسانی اور دھمکیوں کا نشانہ بنایا۔ 20 جون کو صحافیوں کے تحفظ کی کمیٹی (CPJ) نے رپورٹ کیا کہ طالبان نے صوبہ پروان میں ایک مقامی صحافی کو حراست میں لینے کے ایک ہفتے بعد شدید تشدد کا نشانہ بنایا۔ طالبان انٹیلی جنس اہلکاروں نے اسے 13 جون کو بگرام ضلع، پروان میں اس وقت گرفتار کیا جب وہ کابل سے واپس آ رہا تھا۔ اسے دو دن بعد رہا کیا گیا۔ CPJ کی رپورٹ کے مطابق طالبان نے اس صحافی سے دو دن تک پوچھ گچھ کی کیونکہ اس نے طالبان کی تعلیمی پالیسیوں پر تنقیدی رپورٹ لکھی تھی اور فیس بک پر ایک پوسٹ کی تھی جس میں طالبان کے

کپیسا کے اسکولوں کو فوجی اڈوں کے طور پر استعمال کرنے کا ذکر تھا۔

صحافیوں کو گرفتاری اور تشدد کی دھمکیوں نے کئی میڈیا اداروں کو بند ہونے اور صحافیوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا۔ 13 اگست کو افغان جرنلسٹس سینٹر (AFJC) نے ملک میں پریس کی آزادی پر ایک رپورٹ جاری کی۔ رپورٹ کے مطابق اگست 2023 سے اگست 2024 کے دوران 181 واقعات درج کیے گئے جن میں پریس کی آزادی کی خلاف ورزیاں شامل تھیں، جو پچھلے سال کے مقابلے میں معمولی اضافہ تھا۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ ان میں 133 دھمکیاں، چار میڈیا اداروں کی عارضی بندش، چار کی مستقل بندش، متعدد میڈیا لائسنسز کی معطلی، اور 48 صحافیوں و میڈیا کارکنوں کی گرفتاری شامل ہے، جن میں سے دو ابھی تک زیر حراست ہیں۔

## حکومت، فوج، انٹیلی جنس یا مسلح گروپوں کی جانب سے سنسر شپ

طالبان نے 2022 کے ایک حکم نامے کو نافذ کیا جس کے مطابق ''ثبوت کے بغیر حکومتی اہلکاروں کی بدنامی اور تنقید'' اور ''جھوٹی خبروں اور افواہوں کا پھیلاؤ'' اسلام میں ممنوع ہے، اور جو لوگ حکومتی اہلکاروں پر ''بہتان'' لگاتے ہیں وہ غیر دانستہ طور پر دشمن کے ساتھ تعاون کر رہے ہوتے ہیں اور انہیں ''سزا'' دی جائے گی۔

21 ستمبر کو وزارت اطلاعات و ثقافت نے کابل میں کئی میڈیا اداروں کے مینیجرز کے ساتھ ایک اجلاس کے دوران پریس کو ریگولیٹ کرنے کے لیے نئی پابندیاں متعارف کروائیں۔ آٹھ نکاتی ضابطہ کار کے علاوہ، وزارت نے 68 پہلے سے منظور شدہ افراد کی ایک فہرست بھی فراہم کی، جن میں دو خواتین شامل تھیں، جن کے ساتھ میڈیا ادارے انٹرویوز کر سکتے تھے۔ اگر کوئی نیوز پروگرام اس فہرست سے باہر کسی مہمان کا انٹرویو کرنا چاہتا تو اسے اس شخص کا نام اور تفصیلات وزارت کو منظوری کے لیے جمع کروانا لازم تھا۔ ذرائع کے مطابق وزارت نے ان نئے ضوابط کی تحریری نقول اپنے پاس نہیں چھوڑیں اور اجلاس میں موجود افراد سے درخواست کی کہ ان تبدیلیوں کو عام نہ کیا جائے۔

میڈیا کو واضح طور پر طالبان حکام، پالیسیوں، فیصلوں یا ضوابط پر تنقید یا سوال اٹھانے سے منع کیا گیا تھا۔ ان رہنما اصولوں کی خلاف ورزی کی صورت میں پروگرام کے سربراہ، اشاعت کے مینیجر، میزبان، ایڈیٹر اور سیاسی ماہر (مہمان) سب کو انفرادی طور پر ذمہ دار ٹھہرایا جاتا تھا۔

16 اپریل کو میڈیا رپورٹس کے مطابق طالبان نے نور اور باریہ ٹیلی ویژن اسٹیشنز کو "قومی اور اسلامی اصولوں اور اقدار کی عدم تعمیل" پر بند کر دیا۔ طالبان کا دعویٰ تھا کہ ان چینلز کو "قومی مفادات کا احترام نہ کرنے" پر بار بار وارننگ دی گئی تھی۔ یہ دونوں چینلز سابقہ جمہوری حکومت کے ممنوعہ سیاسی جماعتوں سے وابستہ تھے۔

طالبان کی "میڈیا خلاف ورزیوں کی جانچ کمیٹی" کے ایک رکن نے (X سابقہ ٹوئٹر) پر خبردار کیا کہ جو بھی میڈیا طالبان کے مقرر کردہ اصولوں کی پابندی نہیں کرے گا، اسے بھی اسی طرح کے نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سال کے اختتام تک دونوں ٹیلی ویژن اسٹیشنز بند ہی رہے۔

## عالمی میڈیا کی تشویش

عالمی جریدے یوریشیا ریویو مئی 2026 میں اپنی رپورٹ میں اہم انکشافات کئے اور افغانستان میں دہشت گردوں کی موجودگی کے حوالے سے پاکستان کے الزامات کی بالواسطہ تائید کی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ''افغانستان ایک بار پھر عالمی سیاست، دہشت گردی اور انسانی بحران کے مرکز کے طور پر ابھر رہا ہے۔ طالبان کی اگست 2021 میں اقتدار میں واپسی کے بعد دنیا کو جو ''امن'' اور ''استحکام'' کا وعدہ دیا گیا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ وہ دعوے کمزور ہوتے چلے گئے۔ آج صورتحال یہ ہے کہ بین الاقوامی ادارے، سلامتی کے ماہرین اور علاقائی طاقتیں مسلسل خبردار کر رہی ہیں کہ طالبان کے زیرِ کنٹرول افغانستان ایک بار پھر شدت پسند تنظیموں کے لیے محفوظ پناہ گاہ بنتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افغانستان اب صرف ایک داخلی بحران نہیں رہا بلکہ پورے خطے کے امن اور سلامتی کے لیے ایک بڑا چیلنج بن چکا ہے۔ یوریشیا ریویو کے مطابق دوحہ معاہدے کے دوران طالبان نے دنیا کو یقین دلایا تھا کہ افغانستان کی سرزمین کسی بھی دہشت گرد تنظیم کے استعمال میں نہیں آئے گی، مگر زمینی حقائق اس دعوے کی نفی کرتے ہیں۔ جولائی 2025 اور فروری 2026 میں اقوام متحدہ کی تجزیاتی معاونت اور پابندیوں کی نگرانی کرنے والی ٹیم کی رپورٹس میں واضح طور پر کہا گیا کہ طالبان کے زیرِ انتظام افغانستان اب بھی تحریک طالبان پاکستان، القاعدہ اور داعش خراسان جیسی تنظیموں کے لیے" آسان اور محفوظ ماحول" فراہم کر رہا ہے۔ اقوام متحدہ نے طالبان کے اس دعوے کو نا قابلِ اعتبار قرار دیا کہ افغانستان کی سرزمین کسی دہشت گرد گروہ کے زیرِ استعمال نہیں۔ مضمون کے مطابق اس صورتحال کا سب سے زیادہ نقصان پاکستان نے اٹھایا

ہے۔ٹی ٹی پی پاکستانی فوجی آپریشنز کے بعد دوبارہ افغانستان کے سرحدی علاقوں میں منظم ہو چکی ہے۔ رپورٹ کے مطابق ٹی ٹی پی کے 6 ہزار سے ساڑھے 6 ہزار دہشت گرد کنڑ، ننگرہار، خوست، پکتیکا اور پکتیا میں موجود ہیں۔ یہ گروہ مسلسل پاکستان کے اندر حملے کر رہا ہے۔

2026 کے گلوبل ٹیررازم انڈیکس کے مطابق پاکستان میں 2025 کے دوران دہشت گردی کے واقعات میں 1139 افراد شہید ہوئے، جو 2013 کے بعد سب سے زیادہ تعداد ہے۔ رپورٹ کے مطابق صرف ٹی ٹی پی نے 595 حملوں کی ذمہ داری قبول کی، جن میں 637 افراد شہید ہوئے، یعنی پاکستان میں دہشت گردی سے ہونے والی کل ہلاکتوں کا 56 فیصد صرف ٹی ٹی پی کے حملوں کا نتیجہ تھا۔ان حملوں کا ہدف صرف سیکیورٹی فورسز نہیں بلکہ ریاستی ادارے اور عام شہری بھی تھے۔اسی وجہ سے 2024 اور 2025 پاکستان کے لیے گزشتہ ایک دہائی کے خونریز ترین برسوں میں شمار کیے جا رہے ہیں۔ رپورٹ میں پاکستان کے ردعمل کا بھی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔تجزیے کے مطابق طالبان کی مسلسل تردید اور بڑھتے ہوئے خطرات کے بعد پاکستان نے فروری 2026 میں افغانستان کے اندر ٹی ٹی پی کے ٹھکانوں پر درست فضائی حملے کیے۔ پاکستانی حکام اقوام متحدہ سمیت مختلف عالمی فورمز پر بارہا یہ مؤقف اختیار کر چکے ہیں کہ افغانستان دوبارہ دہشت گرد تنظیموں کی محفوظ پناہ گاہ بن چکا ہے۔ رپورٹ صرف دہشت گردی تک محدود نہیں بلکہ طالبان کی داخلی حکمرانی اور انسانی حقوق کی صورتحال پر بھی سخت تنقید کرتی ہے۔کہا گیا ہے کہ طالبان نے اقتدار میں آنے کے بعد دنیا کا سب سے سخت صنفی امتیاز پر مبنی نظام قائم کیا ہے۔ مارچ 2022 میں لڑکیوں کی ثانوی تعلیم پر عائد پابندی اب پانچویں سال میں داخل ہو چکی ہے جبکہ دسمبر 2022 سے خواتین کو جامعات میں داخلے سے بھی محروم کر دیا گیا۔

یونیسف اور یو این ویمن کے 2025 کے اعداد و شمار کے مطابق افغانستان میں بائیس لاکھ سے زائد لڑکیاں ثانوی تعلیم سے محروم ہیں، جبکہ اندازہ ہے کہ 2030 تک یہ تعداد چالیس لاکھ سے تجاوز کر سکتی ہے۔ رپورٹ کے مطابق خواتین کو سماجی زندگی سے منظم انداز میں نکالنے کے نتیجے میں غربت، جبری شادیوں اور معاشرتی مایوسی میں خطرناک اضافہ ہو رہا ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ غیر پشتون نسلی گروہ، صحافی اور سابق افغان حکومت کے اہلکار اب بھی خوف، دباؤ اور انتقامی کارروائیوں کا سامنا کر رہے ہیں۔اس صورتحال نے نہ صرف انتہا پسندی کو بڑھایا ہے بلکہ ہجرت کی نئی لہروں کو بھی جنم دیا ہے۔

پاکستان، جہاں 2026 کے آغاز تک تقریباً 9 لاکھ 32 ہزار رجسٹرڈ افغان مہاجرین موجود تھے، اس عدم استحکام کے براہِ راست اثرات برداشت کر رہا ہے۔

رپورٹ کے مطابق طالبان سیاسی اور معاشی استحکام قائم کرنے میں بھی ناکام رہے ہیں۔ افغانستان اب بھی بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ ریاستی حیثیت حاصل نہیں کر سکا۔ عالمی پابندیاں معیشت کو مزید تباہ کر رہی ہیں۔ دسمبر 2025 میں آسٹریلیا نے طالبان کے چار سینئر رہنماؤں پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں، جبر اور ناقص حکمرانی کے الزامات کے تحت پابندیاں عائد کیں۔ اس سے پہلے بھی متعدد ممالک اور ادارے طالبان کے خلاف پابندیوں کا دائرہ بڑھا چکے ہیں۔

داعش کے حوالے سے بھی یہ رپورٹ ہماری تائید کرتی ہے کہ طالبان صرف اسی وقت داعش خراسان کے خلاف کارروائی کرتے ہیں جب وہ براہِ راست طالبان کی اپنی طاقت کے لیے خطرہ بنے، جبکہ ٹی ٹی پی اور القاعدہ کے حوالے سے وہ عملی طور پر نرمی اور برداشت کی پالیسی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طالبان آج بھی ایک ذمہ دار ریاستی رویے کے بجائے نظریاتی وفاداریوں کو ترجیح دے رہے ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ اگر طالبان دہشت گرد گروہوں کی محفوظ پناہ گاہیں ختم نہیں کرتے، خواتین کے حقوق بحال نہیں کرتے اور ایک جامع سیاسی نظام کی طرف پیش رفت نہیں کرتے تو افغانستان ایک ذمہ دار ہمسایہ ریاست کے بجائے بدستور علاقائی عدم استحکام، انتہا پسندی اور انسانی بحران کا مرکز بنا رہے گا۔

## ایمنسٹی انٹرنیشنل کی گواہی

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ افغانستان میں مختلف انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ اس کا من مانی، غیر مستقل اور مبہم طرزِ عمل، جس میں اخلاقی بنیادوں پر لوگوں کی نگرانی کا ایک ادارہ جاتی نظام شامل ہے اور جو خواتین اور لڑکیوں کو غیر متناسب طور پر متاثر کرتا ہے، ملک میں انسانی حقوق کے زوال کا باعث بنا ہے۔ دنیا بھر کی تنظیمیں اس سب پر اپنی تشویش کا اظہار کر رہی ہیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے حال ہی میں اقوامِ متحدہ کی اس اپیل سے اتفاق کیا ہے کہ افغان رجیم اس بات کو یقینی بنائے کہ اظہارِ رائے کی آزادی، فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی، صحت اور روزگار کا حق اور دیگر بنیادی انسانی حقوق اور آزادیوں کی ضمانت دی جائے جیسا کہ ان بین الاقوامی انسانی حقوق کے معاہدوں میں درج ہے جن کا افغانستان ایک فریق ریاست ہے۔ طالبان کی جانب سے انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں اور بین

الاقوامی قانون کے تحت جرائم پر موجودہ استثنا کا خاتمہ ضروری ہے۔''

## طالبان کے خلاف عالمی احتسابی نظام کا مطالبہ

''ایمنسٹی نے اقوامِ متحدہ سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ افغانستان میں بین الاقوامی قانون کے تحت جرائم اور دیگر سنگین خلاف ورزیوں کی تحقیقات کے لیے ایک خصوصی، آزاد اور بین الاقوامی احتسابی نظام قائم کرے، اور مستقبل میں احتساب اور مقدمات کے لیے شواہد کو جمع اور محفوظ کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ افغانستان میں انسانی حقوق کی صورتحال پر اقوامِ متحدہ کے خصوصی نمائندے کے مینڈیٹ کو مکمل طور پر توسیع اور وسائل فراہم کیے جائیں۔ نیز اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ صنفی انصاف کو ترجیح دی جائے اور خواتین انسانی حقوق کے محافظین اور سول سوسائٹی کے نمائندوں کی شمولیت طالبان کے ساتھ تمام مذاکرات میں مرکزی حیثیت رکھے۔ ایسا نہ کرنا متاثرین، سچائی، انصاف اور ازالے کے حقوق سے منہ موڑنے کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ خود اقوام متحدہ بار بار قرار دے چکی ہے کہ امر بالمعروف کی سرگرمیوں اور بڑھتے ہوئے کردار نے افغانستان میں رہنے والے لوگوں کی نجی اور عوامی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں پر منفی اثرات ڈالے ہیں، خاص طور پر خواتین پر امتیازی اور غیر متناسب اثرات کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ قوانین کے نفاذ میں غیر یقینی صورتحال نے آبادی کے بعض حصوں میں خوف اور دھمکی کے ماحول کو بڑھایا ہے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے دستاویزی طور پر ثابت کیا ہے کہ طالبان کی جانب سے خواتین اور لڑکیوں کے بنیادی حقوق پر سخت پابندیاں اور ساتھ ہی غیر قانونی گرفتاریوں، جبری گمشدگیوں، تشدد اور دیگر ناروا سلوک کا وسیع استعمال، صنفی بنیاد پر ظلم کو انسانیت کے خلاف جرم کے زمرے میں لا سکتا ہے۔ کہا گیا کہ ایک جانب طالبان مسلسل یہ ظاہر کرتے آئے ہیں کہ وہ اپنے ان اراکین کو جوابدہ ٹھہرانے میں ناکام یا غیر خواہشمند ہیں جن پر بین الاقوامی قانون کے تحت جرائم یا سنگین انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے شبہ ہو رہے تھے۔

## طالبان رجیم کو عالمی عدالت میں گھسیٹنے کی کوشش

طالبان کا المیہ کسی ایک پوائنٹ تک محدود نہیں رہا، زندگی کے جس شعبے کی بھی بات کرو پہلے سے زیادہ سنگین صورتحال سامنے آتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کے کئی ممالک اب صرف لفظوں کے ہیر پھیر اور رپورٹس

تک محدود نہیں رہے بلکہ وہ طالبان رجیم کے خلاف عالمی عدالت میں جانے کی تیاری بھی کر رہے ہیں۔ جو یقیناً طالبان کی خود کو تسلیم کروائیے جانے کی خواہش کے لئے ایک بڑا دھچکا ثابت ہو سکتا ہے۔ 25 ستمبر 2025 کو جرمنی، آسٹریلیا، کینیڈا اور نیدرلینڈز نے اعلان کیا کہ وہ افغانستان کے خلاف بین الاقوامی عدالتِ انصاف میں قانونی کارروائی شروع کر رہے ہیں، جس میں الزام لگایا گیا کہ طالبان کی منظم صنفی امتیاز اور تشدد خواتین کے خلاف امتیاز کے خاتمے کے کنونشن کی خلاف ورزی ہے، جسے افغانستان نے 2003 میں منظور کیا تھا۔

یہ اس معاہدے کے تحت پہلا بین الاقوامی عدالت میں دائر ہونے والا کیس ہوگا۔ ہماری رپورٹس کے مطابق اس کیس کی تیاری مکمل کی جا چکی ہے اور جلد ہی اسے دائر کئے جانے کی خبر بھی آسکتی ہے۔ اسی طرح اکتوبر 2025 میں اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل نے بھی ایک قرارداد منظور کی جس میں ماضی اور جاری خلاف ورزیوں کے احتساب کے لیے بین الاقوامی کوششوں کو مضبوط بنانے کی ضرورت پر زور دیا گیا، بشمول شواہد کے جمع کرنے اور محفوظ رکھنے کے ذریعے، تاہم اس مقصد کے لیے کوئی نیا خصوصی میکنزم قائم نہیں کیا گیا۔

## طالبان کی تعلیم اور حقوق نسواں کے حوالہ سے عالمی رپورٹس

افغانستان اس وقت صرف ایک سیاسی یا معاشی بحران کا شکار نہیں بلکہ ایک گہرے سماجی، انسانی اور صنفی المیے سے گزر رہا ہے۔ طالبان کی اگست 2021 میں واپسی کے بعد دنیا بھر کے انسانی حقوق کے ادارے مسلسل خبردار کر رہے ہیں کہ افغانستان میں خواتین اور لڑکیوں کی حالت تیزی سے بدترین ہوتی جا رہی ہے۔ اقوام متحدہ، یو این ویمن، یو این ڈی پی، یونیسف، ہیومن رائٹس واچ، ایمنسٹی انٹرنیشنل اور امریکی محکمہ خارجہ کی رپورٹس اب ایک ہی حقیقت بیان کر رہی ہیں کہ افغانستان میں صنفی عدم مساوات اب صرف سماجی مسئلہ نہیں رہی بلکہ ایک منظم اور ادارہ جاتی نظام میں تبدیل ہو چکی ہے۔ افغانستان جینڈر انڈیکس کی تازہ رپورٹ اسی خوفناک حقیقت کو اعداد و شمار کے ذریعے دنیا کے سامنے رکھتی ہے۔ یہ انڈیکس افغانستان میں خواتین کی بااختیاری، آزادی، سماجی شرکت اور صنفی مساوات کی صورتحال کو ''سسٹین ایبل ڈویلپمنٹ گولز'' یعنی ایس ڈی جیز کے عالمی معیار کے مطابق جانچتا ہے۔ اس انڈیکس کو یو این ویمن اور یو این ڈی پی نے افغانستان کے حالات کے مطابق ترتیب دیا۔ اس میں دو بڑے پیمانے شامل کیے گئے،

ویمنز ایمپاورمنٹ انڈیکس یعنی ڈبلیو ای آئی اور گلوبل جینڈر پیریٹی انڈیکس یعنی جی جی پی آئی۔

رپورٹ کے مطابق افغانستان میں خواتین کی زندگی کے پانچ بنیادی پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا۔ ان میں زندگی اور صحت، تعلیم اور مہارت، روزگار اور مالی شمولیت، فیصلہ سازی میں شرکت اور تشدد سے آزادی شامل ہیں۔ ان شعبوں میں مجموعی طور پر گیارہ اشاریے استعمال کیے گئے، جن میں سے آٹھ براہِ راست ایس ڈی جی اشاریے تھے۔ نتائج نہایت خوفناک تھے۔ 2024 میں افغانستان کا ویمنز ایمپاورمنٹ انڈیکس صرف 173.0 رہا، جبکہ گلوبل جینڈر پیریٹی انڈیکس 237.0 ریکارڈ کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ افغان خواتین اپنے بنیادی حقوق اور آزادیوں کو استعمال کرنے کی صرف 3.17 فیصد صلاحیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح افغان خواتین مردوں کے مقابلے میں صرف 7.23 فیصد مواقع اور کامیابیاں حاصل کر پا رہی ہیں، یعنی افغانستان میں صنفی فرق 3.76 فیصد تک پہنچ چکا ہے۔

یہ صورتحال اس لیے بھی زیادہ تشویشناک ہے کیونکہ اگست 2021 سے پہلے بھی افغانستان صنفی مساوات کے عالمی اشاریوں میں انتہائی نچلی سطح پر موجود تھا، مگر طالبان کی واپسی کے بعد یہ بحران مزید سنگین ہو گیا۔ لڑکیوں کو چھٹی جماعت کے بعد تعلیم سے محروم کر دیا گیا، خواتین کو جامعات سے نکال دیا گیا اور انہیں آہستہ آہستہ معاشی اور سماجی زندگی سے مکمل طور پر الگ کیا جا رہا ہے۔ یہ تحقیق فروری اور مارچ 2024 کے درمیان افغانستان کے آٹھ صوبوں میں کی گئی، جس میں 2155 افراد سے گھر گھر جا کر معلومات حاصل کی گئیں۔ ان میں 1066 خواتین اور 1089 مرد شامل تھے۔ رپورٹ کے مطابق مارچ 2024 کے بعد طالبان نے مزید ایسے احکامات نافذ کیے جنہوں نے خواتین کی زندگی پر پابندیوں کو اور زیادہ سخت کر دیا۔ ان میں اگست 2024 میں نافذ ہونے والا ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' قانون اور دسمبر 2024 میں خواتین کے میڈیکل اداروں میں داخلے پر پابندی شامل ہے۔ یہ قانون صرف لباس یا نقل و حرکت تک محدود نہیں بلکہ اس نے خواتین کی آواز، عوامی موجودگی، سماجی شرکت اور بنیادی آزادیوں تک کو محدود کر دیا۔ خواتین کے لیے این جی اوز، سرکاری اداروں اور صحت کے بعض شعبوں میں کام کے مواقع بھی شدید حد تک محدود کیے گئے۔ یوں افغانستان میں عورت آہستہ آہستہ ایک ایسے وجود میں تبدیل کی جا رہی ہے جسے نہ تعلیم کی اجازت ہے، نہ ملازمت کی، نہ آزادانہ نقل و حرکت کی اور نہ ہی سماجی شرکت کی۔

اقوام متحدہ کی رپورٹ واضح کرتی ہے کہ اگر یہی صورتحال برقرار رہی تو افغانستان 2030 کے عالمی ترقیاتی

اہداف سے مکمل طور پر باہر ہو جائے گا۔ دنیا جہاں خواتین کی شمولیت، مساوات اور ترقی کو قومی استحکام کی بنیاد سمجھ رہی ہے، وہاں افغانستان مسلسل الٹی سمت میں جا رہا ہے۔ اسی تناظر میں یو ایس ڈیپارٹمنٹ آف اسٹیٹ کی 2024 کی ہیومن رائٹس رپورٹ بھی نہایت سنگین تصویر پیش کرتی ہے۔ رپورٹ کے مطابق سال بھر خواتین کے حقوق کی صورتحال میں مسلسل بگاڑ آیا۔ طالبان کے جاری کردہ احکامات نے خواتین اور لڑکیوں کی تعلیم، ملازمت اور نقل و حرکت کو مزید محدود کیا اور عملاً انہیں عوامی زندگی سے باہر کر دیا۔ رپورٹ کے مطابق 21 اگست کو نافذ کیے گئے نام نہاد ''اخلاقی قانون'' نے پہلے سے موجود پابندیوں کو قانونی حیثیت دے دی۔ اس قانون کے تحت طالبان نے اسلام کی اپنی مخصوص تشریح نافذ کرتے ہوئے نہ صرف خواتین بلکہ پورے معاشرے کی ذاتی زندگیوں پر سخت کنٹرول قائم کر دیا۔ مذہبی آزادی بھی شدید متاثر ہوئی۔ اسلام کی دوسری تشریحات اور مختلف مذہبی روایات کو عملاً غیر قانونی بنا دیا گیا جبکہ غیر مسلم مذاہب کی مذہبی سرگرمیوں پر بھی پابندیاں بڑھا دی گئیں۔ رپورٹ کہتی ہے کہ اگرچہ طالبان نے بظاہر یہ دعویٰ کیا کہ وہ 2021 سے پہلے کے قوانین کو ختم نہیں کر رہے، لیکن حقیقت میں انہوں نے ایسے متعدد احکامات جاری کیے جو افغانستان کے موجودہ آئینی اور بین الاقوامی قانونی وعدوں سے متصادم ہیں۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی فہرست نہایت طویل اور خوفناک ہے۔ رپورٹ میں غیر قانونی اور من مانی قتل، جبری گمشدگیاں، تشدد، غیر انسانی سلوک، مسلح تنازعات میں سنگین زیادتیاں، بچوں کی جبری بھرتی، اظہار رائے پر پابندیاں، صحافیوں کو دھمکیاں، میڈیا سنسر شپ، مذہبی آزادی پر قدغنیں، انسانی اسمگلنگ، جبری مشقت اور بچوں سے مشقت جیسے جرائم کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق طالبان اور داعش خراسان دونوں نے بچوں کو مسلح گروہوں میں بھرتی کیا۔ مختلف مسلح گروہوں نے غیر ملکیوں، طبی عملے، امدادی اداروں کے کارکنوں اور عام شہریوں کو دھمکیاں دیں، اغوا کیا اور حملے کیے۔ طالبان کے بعض ارکان پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ انہوں نے اگست 2021 سے پہلے کی افغان حکومت سے وابستہ افراد کو قتل کیا۔

صحافت اور اظہار رائے کی آزادی تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ صحافیوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے، میڈیا اداروں پر سنسر شپ مسلط ہے اور اختلافِ رائے رکھنے والوں کو خاموش کرایا جا رہا ہے۔ قانون کی حکمرانی کمزور ہو چکی ہے جبکہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں ملوث افراد کو عملاً استثنا حاصل ہے۔

افغانستان کی یہ صورتحال صرف ایک ملک کا داخلی مسئلہ نہیں رہی بلکہ یہ پورے خطے اور عالمی انسانی ضمیر کے لیے ایک بڑا سوال بن چکی ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام معتبر ادارے اس بات پر متفق ہیں کہ افغانستان میں خواتین کے حقوق، انسانی آزادیوں اور بنیادی شہری حقوق کا بحران مسلسل گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ طالبان اسے مغربی پروپیگنڈہ قرار دیتے ہیں، مگر جب اقوام متحدہ، یو این ویمن، یو این ڈی پی، یونیسف، امریکی محکمہ خارجہ اور عالمی انسانی حقوق کے ادارے سب ایک ہی تصویر پیش کریں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پوری دنیا غلط ہو سکتی ہے؟

حقیقت یہی ہے کہ افغانستان آج ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں عورت کو گھر کی چار دیواری میں قید کر کے، تعلیم کو محدود کر کے، اختلافِ رائے کو دبا کر اور خوف کو حکمرانی کا ذریعہ بنا کر نہ ریاست کو مستحکم کیا جا سکتا ہے اور نہ معاشرے کو۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہ قومیں ترقی نہیں کرتیں جو اپنی نصف آبادی کو محروم، خاموش اور بے اختیار بنا دیتی ہیں۔

اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندے، اور انسانی حقوق کے گروپوں کی رپورٹس کے مطابق طالبان کی جانب سے جبری نس بندی کے کوئی رپورٹ شدہ واقعات سامنے نہیں آئے۔ خواتین کو صحت کی سہولیات حاصل کرنے میں تقریباً ناقابلِ عبور رکاوٹوں کا سامنا تھا، جس کی وجہ طالبان کی جانب سے کام، سفر اور مرد و عورت کے باہمی تعامل پر عائد پابندیاں تھیں۔ مرد ڈاکٹروں کو عام طور پر خواتین مریضوں کا علاج کرنے کی اجازت نہیں تھی، سوائے ان ہنگامی حالات کے جہاں مریض کی جان کو خطرہ ہو، کیونکہ طالبان نے مردوں اور عورتوں کے درمیان رابطے پر سخت پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ تمام حالات میں طالبان نے یہ شرط رکھی کہ مرد ڈاکٹر صرف اسی صورت میں خواتین مریضوں کا علاج کر سکتے ہیں جب ان کے ساتھ ایک ''محرم'' (مرد سرپرست یا ساتھ رہنے والا محافظ) موجود ہو۔ خواتین کو خواتین ڈاکٹروں سے ملنے کی اجازت تھی، لیکن ایسے ڈاکٹروں کی دستیابی مشکل تھی۔ طالبان نے ان خواتین کو جو پہلے سے صحت کے شعبے میں کام کر رہی تھیں، کام جاری رکھنے کی اجازت دی، تاہم رپورٹ کے مطابق بہت سی خواتین طالبان کی پابندیوں کے باعث کام کرنے سے خوفزدہ تھیں۔ خواتین صحت کے ماہرین کی تعداد میں مسلسل کمی نے خواتین کے لیے ناقص نتائج کے خطرے کو مزید بڑھا دیا۔ اگست 2021 سے پہلے منظور ہونے والا ایک قانون، جسے طالبان نے بھی برقرار رکھا، یہ شرط عائد کرتا تھا کہ خواتین کو مانع حمل استعمال کرنے کے لیے

اپنے شوہر کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ جنگی جرائم، انسانیت کے خلاف جرائم، اور ایسے شواہد جو نسل کشی یا تنازع سے متعلق زیادتیوں کی طرف اشارہ کر سکتے۔

جون میں جاری کی گئی ایک رپورٹ میں اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندے ریچرڈ بینیٹ (SR Bennett) نے پایا کہ طالبان کا ادارہ جاتی جبر کا نظام، جو خواتین اور لڑکیوں کے ساتھ ان کے برتاؤ کے ذریعے قائم اور نافذ کیا گیا ہے، وسیع اور منظم ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری شہری آبادی پر ایک منظم حملے کے مترادف ہے، جو انسانیت کے خلاف جرائم زمرے میں آ سکتا ہے۔

## مزدوروں کے حقوق

اگست 2021 سے پہلے منظور ہونے والے ایک قانون کے تحت کارکنوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ آزاد یونینز بنا سکیں یا ان میں شامل ہو سکیں، قانونی ہڑتالیں کر سکیں، اور اجتماعی طور پر اپنے حقوق کے لیے مذاکرات کر سکیں۔ طالبان نے اس قانون کو باضابطہ طور پر منسوخ کرنے کا دعویٰ نہیں کیا، لیکن ان کے اقدامات مزدور قوانین اور ضوابط سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) نے نوٹ کیا کہ غیر رسمی اور زرعی شعبوں میں، جہاں زیادہ تر مزدور کام کرتے ہیں، یونینز تقریباً موجود ہی نہیں تھیں۔

28 اور 30 مئی کو دوحہ میں ہونے والی ملاقاتوں میں وزارتِ محنت و سماجی امور کے نمائندوں نے کہا کہ وزارت ملک کے بیرونِ ملک کام کرنے والے مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے کام کر رہی ہے۔ نمائندوں نے بتایا کہ وہ سابقہ حکومت کے دور میں شروع کیے گئے ان مذاکرات کو جاری رکھے ہوئے ہیں جن کا مقصد ایران، قطر، سعودی عرب، ترکی، بحرین، متحدہ عرب امارات اور دیگر ممالک کے ساتھ لیبر معاہدوں کے ذریعے ملک کے بیرونِ ملک ملازمین کی قانونی نقل و حرکت کو آسان بنانا ہے۔

وزارت نے دعویٰ کیا کہ وہ 1200 خواتین کو ملازمت فراہم کرتی ہے، جن میں وزارت کے تربیتی مراکز اور یتیم خانوں میں کام کرنے والی خواتین شامل ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس نے سابقہ وزارتِ امورِ خواتین کے سول سروس عملے کو بھی شامل کیا ہے، جسے طالبان نے 2021 میں بند کر کے اس کی جگہ ''نیکی کے فروغ اور برائی کی روک تھام کی وزارت'' قائم کی تھی۔

3 جون کو طالبان نے نام نہاد امیر ہیبت اللہ اخوندزادہ کے ایک حکم نامے کے ذریعے سرکاری خواتین ملازمین کی ماہانہ تنخواہ کی حد 5000 افغانی (تقریباً 70 ڈالر) مقرر کر دی، جو پہلے 12000 سے 15000

افغانی (تقریباً 168 سے 210 ڈالر) کے درمیان تھی جو زیادہ تر سرکاری ملازمین کو دی جاتی تھی۔
اس فیصلے کے بعد مختلف جگہوں پر احتجاج اور ہڑتالیں ہوئیں، اور طالبان نے سخت وارننگ دی کہ مظاہرین کو ''سنگین نتائج'' کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ابتدائی الجھن کے بعد کہ یہ حکم کن افراد پر لاگو ہوتا ہے، طالبان نے 7 جولائی کو وزارت خزانہ کے نام سے ایک خط جاری کیا جس میں واضح کیا گیا کہ یہ تنخواہ کی حد صرف ان خواتین سرکاری ملازمین پر لاگو ہوگی جنہیں گھر سے کام کرنے کی اجازت دی گئی ہے، نہ کہ ان پر جو دفتر میں جا کر کام کرتی ہیں۔

## پیشہ ورانہ تحفظ اور صحت

اگست 2021 سے پہلے کے قوانین کے مطابق ملک میں پیشہ ورانہ تحفظ اور صحت (OSH) سے متعلق کوئی باضابطہ ضوابط یا معیار موجود نہیں تھے۔ مزدور اپنی ملازمت کھونے کے خطرے کے بغیر صحت کے لیے خطرناک حالات سے خود کو الگ نہیں کر سکتے تھے۔ اجرت، اوقاتِ کار، اور پیشہ ورانہ تحفظ وصحت کے قوانین کا نفاذ طالبان نے نہ تو رسمی (formal) شعبے میں اور نہ ہی غیر رسمی (informal) شعبے میں کم از کم اجرت، اوور ٹائم، اور پیشہ ورانہ تحفظ وصحت (OSH) سے متعلق قوانین کے مطابق مؤثر اقدامات کیے۔ بین الاقوامی لیبر تنظیم کے مطابق غیر رسمی شعبہ ملکی معیشت کا 86 فیصد سے زیادہ حصہ تشکیل دیتا ہے۔

## جبری گمشدگیاں اور اغوا

طالبان جبری گمشدگیوں کے ذمہ دار تھے۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کونسل (HRC) کے 55 ویں اجلاس سے پہلے جاری کردہ اپنی رپورٹ میں خصوصی نمائندے رچرڈ بینیٹ نے بتایا کہ انہیں جبری گمشدگیوں اور دیگر انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے متاثرین سے براہ راست بیانات موصول ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ طالبان کی جانب سے حقوق کی خلاف ورزیوں پر مبنی احکامات کے نفاذ کے مختلف طریقوں میں جبری گمشدگی بھی شامل ہے۔ انہوں نے کہا کہ ''انسانی حقوق کے محافظوں، قانونی پیشہ ور افراد اور مظاہرین، جن میں سے بہت سے خواتین تھیں، کی جبری گمشدگیوں کے کیسز دستاویزی طور پر موجود ہیں۔'' افغانستان میں اقوام متحدہ کے کوآرڈینیٹر کے دفتر کی 3 جولائی کی رپورٹ میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کو بتایا گیا کہ غیر منسوب جبری گمشدگیوں کی رپورٹس موصول ہوئی ہیں، مزید کہا گیا کہ طالبان

ان واقعات کو روکنے کے لیے منظم اقدامات نہیں کر رہے۔

29 اگست کو جاری ہونے والی ایک رپورٹ میں انسانی حقوق کی تنظیم ہیومن رائٹس واچ نے کہا کہ طالبان "اپنے مخالفین پر کنٹرول قائم کرنے اور خوف پھیلانے کے لیے جبری گمشدگیوں کا استعمال کرتے ہیں۔ 16 اپریل کو میڈیا رپورٹس کے مطابق صوبہ پکتیکا کے دارالحکومت میں ایک شخص کی لاش ملی۔ رپورٹ کے مطابق اس کی لاش پر تشدد کے نشانات تھے اور یہ لاش اس کے لاپتہ ہونے کے ایک دن بعد طالبان کے ایک فوجی اڈے کے پیچھے ملی۔

## بغیر فردِ جرم کے طویل حراست

2004 کے آئین کے تحت من مانی گرفتاری اور حراست پر پابندی عائد تھی، اور ہر فرد کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی گرفتاری یا حراست کی قانونی حیثیت کو عدالت میں چیلنج کر سکے۔ تاہم طالبان نے عموماً ان تقاضوں پر عمل نہیں کیا۔ رپورٹس کے مطابق طالبان اکثر شہریوں کو بغیر کسی واضح قانونی بنیاد کے من مانی طور پر گرفتار اور حراست میں لیتے رہے، اور بنیادی یا طریقہ کار کے قانونی تحفظات کو نظر انداز کیا گیا۔ مقامی طالبان "پولیس" مبینہ طور پر افراد کو کسی واضح قانون سے تعلق کے بغیر، صوابدیدی طور پر حراست میں لے لیتی تھی۔

یکم جنوری سے 30 جون کے درمیان UNAMA نے من مانی گرفتاری اور حراست کے 98 واقعات دستاویزی کیے۔ 3 ستمبر کو اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے ہائی کمشنر کے دفتر (OHCHR) نے رپورٹ کیا کہ میڈیا کارکنوں اور سول سوسائٹی کے کارکنوں، خصوصاً لڑکیوں کی تعلیم اور خواتین کے حقوق کے لیے مہم چلانے والوں کو اب بھی من مانی حراست کا سامنا ہے۔ OHCHR نے یہ بھی بتایا کہ بیرونِ ملک موجود افغان میڈیا اداروں کے کارکنوں کو بھی نشانہ بنایا جا رہا ہے اور انہیں حراست میں لیا جا رہا ہے۔

UNAMA کی ستمبر 2023 کی ایک رپورٹ میں زیرِ حراست افراد کے ساتھ سلوک پر کہا گیا کہ قیدیوں کو وکیلوں، خاندانوں، ڈاکٹروں اور ججوں تک رسائی کے حق سے منظم طور پر محروم رکھا گیا۔ اسی طرح من مانی اور طویل مدتی حراستیں عام تھیں، جو اکثر بغیر کسی فردِ جرم یا عدالتی کارروائی کے ختم ہو جائیں۔

## تشدد اور ظالمانہ، غیر انسانی یا توہین آمیز سلوک یا سزا

اگرچہ 2004 کے آئین میں ایسے اقدامات پر پابندی عائد تھی، لیکن طالبان اور داعش-خراسان

(ISIS-K) کی جانب سے شدید جسمانی تشدد کے متعدد واقعات رپورٹ ہوئے۔ اگست 2021 میں دوبارہ کنٹرول حاصل کرنے کے بعد طالبان کا 2004 کے آئین کے بارے میں موقف غیر واضح رہا۔ انہوں نے نہ تو اسے مکمل طور پر تسلیم کیا اور نہ ہی واضح طور پر مسترد کیا۔

UNAMA نے رپورٹ کیا کہ طالبان کی طرف سے دی جانے والی سزاؤں میں مار پیٹ، کوڑے لگانا، اور سزائے موت شامل تھیں۔ 26 مارچ کو طالبان کے ترجمان ذبیح اللہ مجاہد نے کہا کہ سنگساری (stoning) شریعت کا حصہ ہے اور ''اگر دوبارہ سنگساری کی شرائط پیدا ہوئیں تو ہم بلاشبہ شریعت کے احکامات نافذ کریں گے۔''

1 جنوری سے 30 جون کے درمیان UNAMA نے کم از کم 20 ایسے واقعات دستاویزی کیے جن میں طالبان نے شہریوں کے خلاف جسمانی تشدد اور ناروا سلوک استعمال کیا۔ 1 اپریل سے 30 جون کے درمیان UNAMA نے کم از کم 179 ایسے واقعات رپورٹ کیے جن میں طالبان کے مقرر کردہ "ججوں" نے جسمانی سزائیں دینے کے احکامات جاری کیے۔

انسانی حقوق کے کارکنوں نے 31 اگست تک مجموعی طور پر 364 واقعات (316 مرد اور 48 خواتین) دستاویز کیے جن میں طالبان کی جانب سے جسمانی سزائیں دی گئیں، جو کہ 2023 کے پورے سال کے 217 کیسز (185 مرد؛ 32 خواتین) سے پہلے ہی زیادہ تھے۔

4 جون کو صوبہ سرپل کے شہر میں طالبان کے ارکان نے 63 افراد (48 مرد اور 15 خواتین) کو عوامی طور پر کوڑے مارے۔ ان پر مختلف جرائم کے الزامات تھے جن میں مسلح ڈکیتی، زنا، گھر سے بھاگنا، توہین اور ہم جنس پرستی شامل تھے۔ ہر شخص کو 15 سے 39 کوڑوں تک مارا گیا۔

طالبان پولیس اور فوجی اہلکاروں کے درمیان استثنا (impunity) ایک بڑا مسئلہ رہا۔ طالبان نے بدعنوانیوں یا قتل کے لیے کوئی باقاعدہ احتسابی نظام قائم نہیں کیا۔ کسی بھی آزاد تنظیم کو ملک میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی تحقیقات کی اجازت نہیں دی گئی۔

## مہاجرین کا تحفظ

اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے مہاجرین (UNHCR)، انٹرنیشنل آرگنائزیشن فار مائیگریشن (IOM)، اور دیگر انسانی ہمدردی کی تنظیموں نے مہاجرین اور واپس آنے والے مہاجرین سمیت دیگر متعلقہ افراد کو

تحفظ اور امداد فراہم کی۔ طالبان نے بعض سرحدی مقامات پر واپس آنے والوں کو اپنی محدود مدد فراہم کی۔ خاص طور پر پاکستان سے واپس آنے والوں کو نقد رقم اور سم کارڈز کی فراہمی کی صورت میں بی لیکن انہوں نے UNHCR اور IOM کی ان وسیع کوششوں میں رکاوٹ ڈالی جن کا مقصد اندرونی طور پر بے گھر افراد کی تعداد کے درست اعداد و شمار مرتب کرنا اور کمزور واپس آنے والی آبادی تک رسائی حاصل کرنا تھا۔ طالبان نے سرحدی مقامات پر نام نہاد "امر بالمعروف و نہی عن المنکر وزارت" کے اہلکار تعینات کیے تاکہ ستمبر میں جاری کردہ "اخلاقی ہدایات" کے مطابق واپس آنے والوں پر اخلاقی اور رویے سے متعلق پابندیاں نافذ کی جاسکیں۔

## نقل و حرکت پر کنٹرول کی کوششیں

طالبان نے ملک سے باہر موجود شہریوں کے خلاف انتقامی کارروائی کے لیے نقل و حرکت پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ 30 جولائی کو طالبان نے اعلان کیا کہ وہ ان ممالک میں سابقہ جمہوری دور کی حکومت کے زیر انتظام سفارتی مشنز کو تسلیم نہیں کرتے، جن میں آسٹریلیا، آسٹریا، بیلجیم، کینیڈا، فرانس، جرمنی (خصوصاً برلن اور بون)، یونان، اٹلی، ناروے، پولینڈ، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، اور برطانیہ (UK) شامل ہیں۔ طالبان نے کہا کہ وہ ان مشنز کی طرف سے 30 جولائی کے بعد جاری کیے گئے پاسپورٹس، پاسپورٹ ایکسٹینشن اسٹیکرز، ویزوں اور دیگر دستاویزات کو تسلیم نہیں کریں گے۔ طالبان نے ان مشنز میں اپنے اہلکار نہیں بھیجے تاکہ شہریوں کو بنیادی خدمات فراہم کی جاسکیں۔ اس کے نتیجے میں ناروے اور برطانیہ میں ملک کے سفارت خانے بعد میں بند ہو گئے۔

## اجرت، اوقاتِ کار، اور پیشہ ورانہ تحفظ و صحت کے قوانین کا نفاذ

طالبان نے نہ تو رسمی شعبے میں اور نہ ہی غیر رسمی شعبے میں کم از کم اجرت، اوور ٹائم، اور پیشہ ورانہ تحفظ و صحت سے متعلق قوانین کے مطابق مؤثر اقدامات کیے۔ بین الاقوامی لیبر تنظیم کے مطابق غیر رسمی شعبہ ملکی معیشت کا 86 فیصد سے زیادہ حصہ تشکیل دیتا ہے۔

## کم عمر بچوں کی فوجی بھرتی

2022 کے طالبان حکم نامے میں طالبان ارکان کی جانب سے بچوں کی بھرتی پر پابندی عائد کی گئی تھی، اور

طالبان نے دعوٰی کیا کہ وہ 18 سال سے کم عمر بچوں کو اپنی کسی بھی فورس میں شامل نہیں کرتے۔ اقوامِ متحدہ کی "بچوں اور مسلح تنازعات" رپورٹ، جو جنوری سے دسمبر 2023 کے عرصے کا احاطہ کرتی ہے، میں کہا گیا کہ ملک میں بچوں کے تحفظ کے لیے فریقین کے ساتھ رابطے میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے، تاہم افغانستان کو انما لک میں شامل کیا گیا جہاں انسانی امداد تک رسائی روکنے کے سب سے زیادہ واقعات رپورٹ ہوئے۔ 2023 میں اقوامِ متحدہ نے طالبان کی جانب سے 342 لڑکوں کی بھرتی دستاویزی کی، جن میں سے 150 کو لڑائی میں اور 192 کو معاون کرداروں میں استعمال کیا گیا۔

15 جون کو متعدد میڈیا رپورٹس کے مطابق شمال مشرقی صوبہ بدخشان میں طالبان سیکیورٹی فورسز نے تقریباً 30 بچوں (عمر 10 سے 18 سال) کو بھرتی کیا اور انہیں ایک خصوصی فوجی مرکز میں تربیت دی۔ رپورٹ کے مطابق نام نہاد ضلعی گورنر نے بچوں کے خاندانوں کو خبردار کیا کہ وہ بھرتی یا تربیت کے عمل میں مداخلت نہ کریں اور شکایت نہ کریں۔ بدخشان کے مقامی ذرائع نے تصدیق کی کہ یہ تربیتی پروگرام مئی کے وسط میں شروع ہوا تھا، یعنی پہلی بار رپورٹ ہونے سے تقریباً ایک ماہ پہلے۔

## افغانستان خطے کے لئے خطرہ

اسی طرح افغانستان کی موجودہ صورتحال کے تناظر میں ایک اور رپورٹ منظرِ عام پر آئی ہے۔ روس کے وزیرِ خارجہ سرگئی لاوروف نے خبردار کیا ہے کہ یوریشیا میں بڑھتے ہوئے خطرات، جن میں افغانستان سے متعلق چیلنجز اور مشرقِ وسطیٰ میں جاری بحران شامل ہیں، وسطی ایشیا اور قفقاز بھر میں سیکیورٹی خطرات میں اضافے کا سبب بن رہے ہیں۔ روس کی قیادت میں قائم سیکیورٹی اتحاد اجتماعی سلامتی معاہدہ تنظیم کی پارلیمانی اسمبلی کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے لاوروف نے کہا کہ افغانستان کے گردونواح میں ہونے والی پیش رفت، خلیج فارس میں کشیدگی کے ساتھ مل کر، وسیع تر خطے کو متاثر کر رہی ہے، جس میں بحیرہ کیسپین کا خطہ بھی شامل ہے۔ روسی وزارتِ خارجہ کی جانب سے جاری کردہ بیان کے مطابق لاوروف نے کہا، ''یوریشیا میں خطرات بڑھ رہے ہیں اور ان سے نمٹنے کے لیے مزید کوششوں کی ضرورت ہے۔ جنگ اور تشدد کے ذریعے بالادستی حاصل کرنے کے خواہاں ممالک نئے خطرات پیدا کر رہے ہیں۔'' انہوں نے کہا کہ افغانستان میں دہشت گردی اور منشیات کی اسمگلنگ کے خلاف کوششیں جاری ہیں، اور ان دونوں کو ماسکو کے لیے مستقل تشویش قرار دیا۔

## دہشت گردی پر روس کی تنقید

روسی حکام متعدد بار افغانستان میں عسکریت پسند گروہوں کی موجودگی پر تشویش کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس سے قبل کے اندازوں میں روسی وزارتِ خارجہ نے کہا تھا کہ مختلف انتہا پسند تنظیموں سے وابستہ 20000 سے 23000 کے درمیان دہشت گرد ملک میں سرگرم ہیں۔ ان اعداد و شمار میں تقریباً 3000 دہشت گرد داعش خراسان سے وابستہ بتائے گئے ہیں، جبکہ 5000 سے 7000 کے درمیان ارکان تحریکِ طالبان پاکستان کے ہیں۔ وزارت کے اندازوں کے مطابق چھوٹی تعداد دیگر گروہوں جیسے القاعدہ، ایسٹ ترکستان اسلامک موومنٹ، اسلامک موومنٹ آف ازبکستان اور جماعت انصار اللہ سے منسوب کی گئی ہے۔ طالبان نے افغانستان کی سیکیورٹی صورتحال سے متعلق خدشات کو بے بنیاد قرار دیا ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے خبردار کیا ہے کہ داعش خراسان کی جانب سے لاحق خطرہ اب بھی نمایاں ہے۔ لاوروف نے کہا کہ روس، جو اس سال اجتماعی سلامتی معاہدہ تنظیم کی گردشی صدارت سنبھالے ہوئے ہے، اپنے اتحادی ممالک کے ساتھ ہم آہنگی میں اضافہ کرے گا تاکہ ان کے بقول بڑھتے ہوئے عالمی سیکیورٹی چیلنجز سے نمٹا جا سکے۔ انہوں نے کہا، ''ہم اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر اجتماعی سلامتی کو مضبوط بنانے کی کوششوں میں اضافہ کریں گے۔'' ان کے بیانات ماسکو کی اس وسیع تر تشویش کی عکاسی کرتے ہیں کہ اس کی جنوبی سرحدوں کے ساتھ عدم استحکام پڑوسی خطوں میں سرایت کر سکتا ہے، خاص طور پر وسطی ایشیا میں، جسے روس اسٹریٹیجک طور پر اہم سمجھتا ہے۔ روس نے 2021 میں طالبان کے اقتدار میں واپس آنے کے بعد سے ان کے ساتھ رابطے برقرار رکھے ہیں اور وہ واحد ملک ہے جس نے افغانستان میں ان کی حکمرانی کو تسلیم کیا ہے۔

## طالبان کا اصل چہرہ

افغان طالبان کے پہلے دورِ حکومت کو اگر غیر جذباتی انداز میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان سے وابستہ امیدیں کبھی بھی بہت زیادہ انقلابی یا غیر معمولی نوعیت کی نہیں تھیں۔ ان کی پہلی حکومت بھی نہ جدید قومی ریاست کے کسی وسیع وژن کی حامل تھی، نہ معاشی ترقی، سیاسی شمولیت یا فکری کشادگی کے کسی ہمہ گیر منصوبے پر قائم تھی۔ تاہم اس کے باوجود ان کے پہلے دور میں چند ایسی خصوصیات ضرور موجود تھیں جنہوں نے افغان معاشرے کے ایک حصے اور خطے کے بعض حلقوں میں ان کے لیے ایک محدود سطح کی

قبولیت پیدا کی۔ان میں سب سے نمایاں وصف یہ تھا کہ کم ازکم نظم، دیانت داری، سادہ طرزِ زندگی اور کسی نہ کسی شکل میں شریعت، شورائیت اور قبائلی جرگہ سسٹم کو تسلیم کرتے تھے۔امن کے داعی تھے،خصوصا دہشت گردی کے حامی نہیں تھے اور پڑوسیوں خصوصا پاکستان کے خلاف کوئی بغض نہیں رکھتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جب طالبان دوبارہ اقتدار میں آئے تو ہمیں یہ امید تھی کہ اگرچہ یہ حکومت جدید جمہوری ریاست نہیں ہوگی، لیکن کم ازکم ایک منظم اور نسبتاً اصولی نظام ضرور قائم کرسکے گی، جس کے تحت افغان سرزمین دہشت گردوں اک مرکز نہیں بنے گی۔گزشتہ 5 برس میں ملا ہیبت اللہ رجیم یہ ثابت کرنے میں کامیاب رہا ہے کہ ان میں وہ خوبیاں تلاش نہ کی جائیں، جو پہلے والوں میں تھیں، یعنی نام انہی کا ہے، لیکن اوصاف اپنے اپنے۔آج افغانستان میں جو نظام قائم ہے، وہ کسی ریاست، حکومت یا اجتماعی نظم سے زیادہ ایک شخصی تسلط کی صورت اختیار کرچکا ہے۔یہ ایک ایسا ڈھانچہ ہے جس میں تمام اختیارات، تمام فیصلے اور تمام سیاسی و مذہبی تعبیرات ایک ہی فرد کے گرد گھومتی ہیں، اور وہ فرد ہیبت اللہ اخوندزادہ خود ہے۔یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ موجودہ طالبان نظام کا اسلوب کسی ریاستی ادارے کے بجائے ایک فلمی ڈان کے نیٹ ورک سے مشابہ ہے۔ایک ایسا ڈان جو پردے کے پیچھے بیٹھ کر پورے نظام کو کنٹرول کرتا ہے، جس کے حکم کے بغیر نہ کوئی قانون معنی رکھتا ہے، نہ کوئی ادارہ، نہ کوئی وزیر اور نہ کوئی عدالتی یا انتظامی ڈھانچہ۔

افغانستان میں عملاً کوئی آئینی نظم موجود نہیں، پہلے بھی نہیں تھا، نہ عوامی نمائندگی کا کوئی مؤثر ادارہ ہے، نہ آزاد عدلیہ، نہ بااختیار کابینہ اور نہ ایسا سیاسی عمل جس میں افغان قومیتوں اور طبقات کی شمولیت ہوسکے۔ پورا نظام صرف ایک فرد کی مرضی، خوف اور مطلق العنان اقتدار کے تابع ہے۔حقیقت یہ ہے کہ موجودہ نظام نہ صرف افغانستان کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ مکمل طور پر طالبان کی بھی نمائندگی نہیں کرتا۔طالبان ایک متنوع تحریک تھی جس میں مختلف قبائل، علاقوں، نظریات اور مزاجوں کے لوگ شامل تھے۔اس تحریک کے اندر ایسے عناصر بھی موجود تھے جو شورائیت، اجتماعی فیصلوں اور داخلی توازن کے قائل تھے۔لیکن ہیبت اللہ کے اقتدار نے پوری تحریک کو ایک شخصی آمریت میں تبدیل کردیا۔آج طالبان کے اہم کمانڈر، سیاسی شخصیات اور وزرا بھی محض نمائشی کردار بن کر رہ گئے ہیں۔اصل اختیار قندھار کے محدود دائرے میں مرکوز ہے، بلکہ نورزئی قبیلہ مزید وضاحت کریں تو پردے کے پیچھے بیٹھے ہیبت اللہ کی شخصیت ہی سب کچھ ہے۔طالبان بطور تنظیم بھی کہیں موجود نہیں ہیں۔

سب سے پہلی بات کہ ہیبت اللہ کا اقتدار ہی باطل اور غصب پر قائم ہے۔ کسی قومی معاہدے، عوامی مینڈیٹ، اسلامی شورائیت کے اصول یہاں تک کہ پشتون روائت جرگے پر بھی نہیں، بلکہ خوف، نسلی بالادستی اور مذہبی تقدس کا مصنوعی اور خودساختہ تصور اس کی بنیاد ہے۔ اس نے شریعت کو عدل اور اجتماعی بھلائی کے بجائے ذاتی اقتدار کے تحفظ کا ذریعہ بنادیا ہے۔ اپنے ہر عمل کو ''شرعی فیصلہ'' قرار دے کر اختلاف کی ہر آواز کو دبایا جاتا ہے، اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ خود سے اختلاف کو اللہ اور رسول ﷺ سے اختلاف کے مترادف رار دینے کی جرات بھی کرڈالی، حالانکہ شریعت کبھی بھی ایک فرد کی مطلق العنان خواہشات کا نام نہیں رہی۔ اسلام میں حکمرانی کی بنیاد مشاورت، انصاف، امانت اور جواب دہی پر رکھی گئی تھی، لیکن موجودہ افغان نظام میں شریعت کا نام لے کر ان تمام اصولوں کو پامال کیا جارہا ہے۔ اس کی واضح مثال جنوری میں جاری کیا جانے والا فوجداری ضابطہ ہے، جس کی ایک ایک شق شریعت اور قرآن وسنت سے بغاوت ہے۔ ریاستی طاقت کو مزید سخت اور غیر جواب دہ بنایا گیا۔ اس پورے عمل میں نہ قومی مشاورت شامل تھی، نہ علمی اجتہاد اور نہ ہی مختلف مکاتبِ فکر کی رائے۔ گویا شریعت کو ایک زندہ اور متوازن قانونی روایت کے بجائے ایک فرد کی طاقت کو دوام دینے کے آلے میں تبدیل کردیا گیا ہے۔

ہیبت اللہ کی سوچ کا ایک اور خطرناک پہلو اس کی قبائلی نسل پرستی ہے۔ افغانستان ایک کثیر النسلی ملک ہے جہاں پشتونوں کے علاوہ تاجک، ازبک، ہزارہ، ترکمان اور دیگر قومیتیں بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ ایک نمائندہ حکومت کا تقاضا تھا کہ ان تمام طبقات کو سیاسی وانتظامی عمل میں شامل کیا جاتا، مگر موجودہ نظام میں اقتدار ایک محدود قبائلی حلقے کے گرد مرکوز ہوچکا ہے۔ غیر پشتون آبادی خود کو نہ صرف اقتدار سے محروم محسوس کرتی ہے بلکہ یہ تاثر بھی مضبوط ہورہا ہے کہ ان کے ساتھ ایک محکوم آبادی جیسا سلوک کیا جارہا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ نسلی بالادستی بھی اصولی نہیں بلکہ صرف اقتدار کے مفاد سے جڑی ہوئی ہے۔ جب ذاتی اقتدار کو خطرہ محسوس ہوتو ہیبت اللہ اپنے ہی پشتون ساتھیوں اور طالبان شخصیات کو بھی کچلنے سے گریز نہیں کرتا۔ اس کے لیے نہ قبائلی وفاداری اہم ہے، نہ تنظیمی قربانیاں اور نہ نظریاتی خدمات۔ اصل معیار صرف ایک ہے ''غیر مشروط اطاعت۔'' اس کا ہر خطاب اور ہر گفتگو اطاعت کے مطالبے سے شروع ہوتی ہے اور اطاعت نہ کرنے والوں کو نشان عبرت بنادینے کی دھمکی پر ختم۔

جو شخص اس اطاعت سے انحراف کرے، وہ خواہ طالبان کی اعلیٰ قیادت ہی کا حصہ کیوں نہ ہو، اسے خاموش

یا غیر مؤثر بنا دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج افغانستان میں ایک حقیقی حکومت کے بجائے خوف پر مبنی شخصی تسلط قائم ہو چکا ہے۔ ریاستی ادارے بے معنی ہو چکے ہیں، اجتماعی قیادت ختم ہو چکی ہے اور پورا نظام ایک ایسے فرد کے تابع ہے جو خود کو قانون، شریعت اور روایت سب سے بالاتر سمجھتا ہے۔ یہ طرزِ حکمرانی نہ اسلامی ہے، نہ قومی، نہ قبائلی روایت کے مطابق اور نہ ہی جدید ریاستی اصولوں سے مطابقت رکھتی ہے۔ یہ دراصل استعماری ذہنیت کی ایک نئی شکل ہے جہاں ایک فرد پورے معاشرے کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھ کر چلا رہا ہے، بلکہ اصل سانحہ یہ ہے کہ اقتدار کی اسی اندھی ہوس میں ہیبت اللہ اخوندزادہ نے نہ صرف افغانستان کے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا ہے بلکہ پورے خطے، عالمی امن اور خود طالبان تحریک کی بقا تک کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔

منظر یہ ہے کہ ایک جانب ہیبت اللہ کی شخصی آمریت اور استبداد ہے، جس میں طالبان شوریٰ، کابینہ اور تمام قیادت منہا کر دی گئی ہے، صرف وہ لوگ ساتھ ہیں، جن کا واحد مقصد لوٹ مار، کرپشن اور غصب ہے، انہیں اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں کہ ریاست کیسے چلانی ہے، عوام کو کم از کم روٹی کیسے فراہم کرنی ہے، دوسری جانب قوت نافذہ کے طور پر یہ خلا القاعدہ نے پورا کیا، جو ایک عرصے سے ایسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں تھی جہاں اسے نہ صرف عسکری تحفظ حاصل ہو بلکہ ریاستی سرپرستی، وسائل اور شناخت تک رسائی بھی میسر آ سکے۔ ہیبت اللہ کی شخصی آمریت کے شوق نے القاعدہ کو یہی موقع فراہم کیا۔ اب صورتحال یہ ہے کہ صرف القاعدہ نہیں ہے، اس کی چھتری تلے پورا دہشت گردی کا ایک نظام ہے، جس میں ٹی ٹی پی سے لے کر ای ٹی آئی ایم تک ہر رنگ، نسل اور مقصد والے دہشت گرد شامل ہیں۔

یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ آج افغانستان میں جو نظام قائم ہے، وہ محض طالبان حکومت نہیں بلکہ ایک خطرناک ہائبرڈ رجیم ہے۔ جس میں ایک طرف ہیبت اللہ کی مطلق العنان حکمرانی ہے، دوسری طرف القاعدہ جیسا عالمی دہشت گرد نیٹ ورک ہے جو پہلی مرتبہ کسی ریاستی ڈھانچے کے وسائل، شناخت اور اداروں تک اس حد تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس تعلق کی بنیاد کسی نظریاتی اخوت پر نہیں بلکہ مفادات کے اشتراک پر ہے۔ ہیبت اللہ کو ایک ایسی قوت درکار تھی جو اس کے شخصی اقتدار کو دوام دے سکے، جبکہ القاعدہ کو ایک ایسی ریاستی چھتری درکار تھی جس کے سائے میں وہ عالمی سطح پر اپنی تنظیمی قوت کو دوبارہ منظم کر سکے۔ یوں دونوں نے ایک دوسرے کو سہارا دیا، مگر اس اتحاد کی قیمت پورا افغانستان ادا کر رہا ہے۔

ہیبت اللہ اخوندزادہ نے اقتدار کے نشے میں یہ سمجھ لیا کہ عالمی قوانین، سفارتی روایات اور بین الاقوامی خدشات کو نظر انداز کر کے بھی حکومت چلائی جاسکتی ہے۔ اسی غلط فہمی نے القاعدہ کو افغان ریاستی ڈھانچے میں غیر معمولی رسائی دی۔ آج مختلف اطلاعات اور عالمی رپورٹس میں بارہا یہ خدشات سامنے آچکے ہیں کہ غیر ملکید ہشت گردوں اور دہشت گرد عناصر کو افغان شناختی دستاویزات فراہم کی جارہی ہیں۔ انہیں افغان پاسپورٹ دیے جارہے ہیں، قانونی شناخت فراہم کی جارہی ہے، اور بعض اطلاعات کے مطابق مخصوص عناصر کو سفارتی سہولیات تک رسائی دی گئی ہے تاکہ وہ افغان نمائندوں یا سفارتی اہلکاروں کے روپ میں نقل وحرکت کرسکیں۔ حد تو یہ کہ دنیا بھر کے دہشت گردوں کو افغان شہریت دینے کے لئے باقاعدہ ایک ادارہ تک قائم کیا جاچکا ہے۔ یہ صرف افغانستان یا خطے کے لیے نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے ایک غیر معمولی خطرہ ہے۔ دہشت گرد تنظیمیں عموماً خفیہ نیٹ ورکس، زیرزمین ڈھانچوں یا غیر ریاستی پناہ گاہوں پر انحصار کرتی رہی ہیں، لیکن افغانستان میں پہلی مرتبہ ایک ایسا ماڈل ابھرتا دکھائی دے رہا ہے جہاں ایک عالمی دہشت گرد نیٹ ورک ریاستی شناخت، قانونی دستاویزات، سفارتی کور اور حکومتی وسائل کو استعمال کرنے کی پوزیشن میں آچکا ہے، یہ روایتی دہشت گردی سے کہیں زیادہ خطرناک ہے کیونکہ یہاں دہشت گردی اور ریاستی ڈھانچہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

المیہ یہ ہے کہ ہیبت اللہ اس پورے عمل کو اپنے اقتدار کے استحکام کے زاویے سے دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک جب تک القاعدہ اور اس سے وابستہ شدت پسند نیٹ ورکس اس کی حمایت کرتے رہیں گے، اس کا اقتدار محفوظ رہے گا۔ لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایسی قوتیں کبھی کسی ریاست یا تحریک کی حقیقی وفادار نہیں ہوتیں۔ القاعدہ کا اپنا ایک عالمی ایجنڈا ہے، اور وہ ہر اس جگہ کو استعمال کرتی ہے جہاں اسے پناہ، وسائل اور آزادی میسر آئے۔ آج اگر وہ ہیبت اللہ کے ساتھ کھڑی ہے تو اس کی وجہ کوئی اصولی وابستگی نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ افغان نظام نے اسے وہ مواقع فراہم کردیے ہیں جو شاید اس سے پہلے اسے کبھی حاصل نہیں ہوئے۔ یہ صورتحال خود طالبان تحریک کے لیے بھی تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔ ہیبت اللہ کی حکمرانی کا سب سے خطرناک پہلو یہی ہے کہ اس میں ریاستی دانش، سیاسی بصیرت اور قومی ذمہ داری کا فقدان دکھائی دیتا ہے۔ سکیورٹی کے نام پر قلعہ بندیاں اور ایک بعد دوسرے پہرے میں رہنے والا ہیبت اللہ عوام تو کیا، طالبان سے کٹا ہوا ہے، ایسے میں کہاں کی عوامی زندگی اور کہاں کی سادگی؟

افغانستان میں قائم موجودہ ہیبت اللہ رجیم کو اگر کسی ایک جملے میں بیان کرنا ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسی شخصی آمریت ہے جس کی پہلی بنیاد مطلق العنان اقتدار اور دوسری بنیاد منظم کرپشن ہے۔ یہ کرپشن محض چند اہلکاروں کی مالی بے ضابطگی یا انفرادی رشوت ستانی کا مسئلہ نہیں بلکہ پورے حکومتی ڈھانچے کی شناخت بن چکی ہے۔ جس طرح ہر شخصی حکومت اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے وفادار طبقات پیدا کرتی ہے، اسی طرح ہیبت اللہ اخوندزادہ نے بھی اقتدار کے تحفظ کے لیے ایک ایسا نظام قائم کیا ہے جہاں وفاداری کے بدلے لوٹ مار، وسائل پر قبضے اور غیر محدود اختیارات کی کھلی اجازت دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج افغانستان میں کرپشن کسی حادثاتی خرابی کے طور پر نہیں بلکہ خود حکومتی ڈھانچے کے لازمی جزو کے طور پر موجود ہے۔

طالبان نے اپنے سیاسی سفر میں ہمیشہ خود کو سابق افغان حکومتوں کے مقابلے میں ایک ''پاکیزہ'' اور ''دیانت دار'' متبادل کے طور پر پیش کیا تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ سابق حکمران طبقہ مغربی امداد لوٹنے، قومی وسائل پر قبضہ کرنے اور شاہانہ طرزِ زندگی اختیار کرنے میں مصروف تھا جبکہ طالبان ایک سادہ اور شرعی نظام قائم کریں گے۔ یہی دعویٰ ان کی سیاسی ساکھ کا اہم حصہ تھا۔ لیکن آج جب طالبان اقتدار میں ہیں تو صورتحال یہ ہے کہ کرپشن نہ صرف موجود ہے بلکہ پہلے سے زیادہ غیر شفاف، زیادہ منظم اور زیادہ محفوظ شکل اختیار کر چکی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے کرپشن ایک نیم جمہوری اور متفرق ڈھانچے کے اندر موجود تھی، جبکہ آج وہ شخصی تسلط کے تحت ایک منظم حکومتی پالیسی کی شکل اختیار کر گئی ہے۔

افغانستان کے مختلف اداروں، سرحدی مراکز، مالی محکموں، معدنی وسائل، تجارتی راستوں اور حساس انتظامی عہدوں پر ایسے افراد کو بٹھایا گیا ہے جن کی سب سے بڑی صلاحیت غیر مشروط وفاداری ہے۔ ان افراد کو عملاً یہ پیغام دیا گیا ہے کہ جب تک وہ مرکزِ اقتدار سے وفادار رہیں گے، ان کی مالی بے ضابطگیوں، اختیارات کے ناجائز استعمال اور غیر قانونی سرگرمیوں پر سوال نہیں اٹھایا جائے گا۔

وزیر معدنیات کی کرپشن پر سزا سے گریز، وزیر صحت کو کھلی چھٹی، وزیر تعلیم کی لوٹ مار کو نظر انداز کر دینا اور وزیر خارجہ کی وارداتوں کی سرپرستی کرنا، وزیر قانون کو چیف جسٹس کو کھلی چھٹی کہ اپنی ہر کرپشن کو قانون بنا دو، یہ سب کیا ہے؟ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہیبت اللہ رجیم جس سے دیانتداری اور کرپشن کے خلاف جنگ کی توقع تھی، وہ خود گھٹنے گھٹنے کرپشن کی دلدل میں پھنس چکی ہے۔ اس سے بڑی شرم کی بات کیا ہوگی کہ عالمی ادارے

کہہ رہے ہیں کہ صحت اور خوراک کے لئے دی جانے والی عالمی امداد تک میں کرپشن کی جارہی ہے۔ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کے مطابق 2025 میں طالبان حکومت نے کرپشن میں ترقی کی ہے اور سرفرست آ گیا ہے۔

یہی ہر استبدادی حکومت کا بنیادی ماڈل ہوتا ہے۔آمریت صرف خوف سے نہیں چلتی، بلکہ مفادات کے نیٹ ورک سے چلتی ہے۔ ہیبت اللہ رجیم نے بھی یہی ماڈل اختیار کیا ہے۔اس نے اپنے اردگرد ایسے مفاداتی حلقے تشکیل دیے ہیں جن کی سیاسی اور مالی بقا اس شخصی نظام سے جڑی ہوئی ہے۔ان حلقوں کو ریاستی وسائل تک غیر معمولی رسائی دی گئی ہے۔سرحدی تجارت، کسٹمز، معدنیات، سرکاری عہدے، امدادی وسائل اور کاروباری مواقع مخصوص افراد اور گروہوں کے درمیان تقسیم کیے جارہے ہیں۔ یہ سب کچھ کسی قومی پالیسی کے تحت نہیں بلکہ وفاداری کے انعام کے طور پر ہورہا ہے۔موجودہ رجیم کی کرپشن کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ مکمل طور پر غیر جواب دہ ہے۔ نہ کوئی آزاد پارلیمان موجود ہے، نہ آزاد عدلیہ، نہ احتسابی ادارے اور نہ ایسا میڈیا جو ان معاملات پر مؤثر سوال اٹھا سکے۔یہی وجہ ہے کہ کرپشن کو نہ صرف برداشت کیا جارہا ہے بلکہ عملاً سرپرستی حاصل ہے۔

افغانستان میں آج اقتدار کے قریب موجود افراد کے مالی اثاثوں، کاروباری اثر ورسوخ اور وسائل تک رسائی میں واضح اضافہ دیکھا جاسکتا ہے، جبکہ عام افغان شہری بدترین معاشی بحران کا شکار ہے۔ یہ تضاد خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ریاستی وسائل ایک محدود طاقتور طبقے کے ہاتھوں میں مرتکز ہو چکے ہیں۔اس رجیم کی کرپشن کی ایک اور شکل ریاستی عہدوں کی من پسند تقسیم ہے۔ افغانستان میں اہم مناصب اب قومی نمائندگی یا ادارہ جاتی اہلیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ذاتی تعلقات، قبائلی وابستگیوں اور اندرونی وفاداریوں کی بنیاد پر دیے جارہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے اہم ادارے پیشہ ورانہ صلاحیت کے بجائے گروہی مفادات کے مراکز بنتے جارہے ہیں۔اس نظام میں دیانت دار یا آزاد سوچ رکھنے والے افراد کے لیے جگہ مسلسل محدود ہوتی جارہی ہے کیونکہ شخصی آمریت ہمیشہ ایسے لوگوں سے خوفزدہ رہتی ہے جو اندھی اطاعت پر یقین نہ رکھتے ہوں۔خود ہیبت اللہ نے صرف اقتدار پر قبے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ وہ خود اور ان کے ساتھی قندھار میں پراپرٹی کا سب سے بڑا قبضہ مافیا ہیں۔عینو مینہ کا پوش ایریا، اس قبضہ گیری کی بدترین داستان سناتا ہے۔ یوں کرپشن محض انتظامی کمزوری نہیں بلکہ اقتدار کا بنیادی ستون بن چکی ہے۔ یہ صورتحال صرف نچلی سطح تک محدود نہیں بلکہ خود بالائی قیادت کے طرزِ حکمرانی سے جڑی ہوئی ہے۔ موجودہ ہیبت اللہ رجیم

کی شناخت صرف سخت گیری یا مطلق العنانیت نہیں بلکہ کرپشن کی سرپرستی بھی ہے۔

تیسری اور اہم توقع امن وامان کا قیام اور پڑوسی ممالک سے تعلقات کی تھی، جو پہلی دو توقعات کی طرح ہی رسوا ہو کر رہ گئی۔ یہی تین بنیادیں تھیں جن پر طالبان کے بارے میں ایک محدود مثبت تاثر قائم تھا، لیکن آج یہی تینوں دعوے مکمل طور پر الٹ ہو چکے ہیں۔ آج افغانستان میں نہ سادہ اور عوامی حکومت موجود ہے، نہ کرپشن سے پاک نظام، اور نہ ہی امن واستحکام۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ طالبان رجیم ان تینوں میدانوں میں اشرف غنی حکومت سے بھی زیادہ بحران، تضاد اور تباہی کی علامت بن چکی ہے۔

سب سے خطرناک صورتحال امن کے معاملے میں سامنے آئی ہے، جہاں افغانستان ایک مرتبہ پھر عالمی دہشت گرد نیٹ ورکس، علاقائی شدت پسند گروہوں اور سرحد پار دہشت گردی کا مرکز بن چکا ہے، بلکہ پہلے سے بڑھ گیا ہے، ماضی میں القاعدہ طالبان کی پابند تھی، آج طالبان القاعدہ کے پابند ہیں، ماضی میں ملاعمر پڑوسی ملک میں دہشت گردی کی تجویز دینے والے کمانڈر کو نشان عبرت بنا دیتے تھے، آج دہشت گردی کی مخالفت کرنے والے کو عبرت کا نشان بنا دیا جاتا ہے۔ طالبان کی پہلی حکومت کے حامی اکثر یہ مؤقف اختیار کرتے تھے کہ اگرچہ وہ سخت گیر تھے، مگر انہوں نے افغانستان میں خانہ جنگی کا خاتمہ کیا اور کم از کم داخلی سطح پر ایک نظم قائم کیا۔ یہی وجہ تھی کہ طالبان کی واپسی پر بعض حلقوں کو امید تھی کہ افغانستان ایک بار پھر بدامنی سے نکل سکے گا۔ لیکن آج حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

افغانستان اس وقت نہ صرف داخلی عدم استحکام کا شکار ہے بلکہ عالمی دہشت گرد تنظیموں کے لیے محفوظ پناہ گاہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ مختلف بین الاقوامی رپورٹس، اقوامِ متحدہ کے جائزوں اور علاقائی سکیورٹی مباحث میں بارہا اس بات کی نشاندہی کی جا چکی ہے کہ افغانستان میں اس وقت درجنوں عالمی دہشت گرد تنظیمیں سرگرم ہیں۔ القاعدہ، تحریک طالبان پاکستان، ازبک، تاجک، ایغور اور دیگر شدت پسند گروہوں سمیت کم از کم 23 عالمی دہشت گرد نیٹ ورکس افغانستان کی سرزمین پر مختلف سطحوں پر موجود اور متحرک بتائے جاتے ہیں۔ یہ صورتحال اس دعوے کو مکمل طور پر جھوٹا ثابت کرتی ہے کہ طالبان کی حکومت افغانستان کو پرامن اسلامی ریاست میں تبدیل کر رہی ہے، نہ یہ اسلامی حکومت ہے اور نہ ہی پرامن۔

سب سے زیادہ تشویش ناک پہلو القاعدہ کا دوبارہ مضبوط ہونا ہے۔ طالبان بارہا دنیا کو یہ یقین دہانی کراتے رہے کہ وہ افغانستان کی سرزمین کسی عالمی دہشت گرد نیٹ ورک کے لیے استعمال نہیں ہونے دیں

گے، لیکن زمینی حقائق اس کے برعکس تصویر پیش کرتے ہیں۔ القاعدہ نہ صرف افغانستان میں موجود ہے بلکہ مختلف اطلاعات کے مطابق اس نے طالبان رجیم کے بعض حلقوں کے ساتھ قریبی روابط استوار کر رکھے ہیں۔ وہ افغان حکومت کی پالیسیوں پر خود طالبان قیادت سے بھی زیادہ اثر انداز ہو رہی ہے، القاعدہ کے اہم رہنماؤں کی افغانستان میں موجودگی، ان کے محفوظ نیٹ ورکس اور ان کی نقل و حرکت سے متعلق متعدد انکشافات ہو چکے ہیں۔

اس سب کے باوجود طالبان مسلسل یہی دعویٰ کرتے رہے کہ افغانستان میں کوئی دہشت گرد تنظیم سرگرم نہیں۔ یہی صورتحال تحریک طالبان پاکستان، یعنی ٹی ٹی پی، کے معاملے میں بھی سامنے آتی ہے۔ پاکستان بارہا ثبوتوں کے انبار لگا چکا ہے کہ ٹی ٹی پی کی قیادت اور دہشت گرد افغانستان میں محفوظ پناہ گاہیں رکھتے ہیں اور افغان سرزمین اور حکومتی ڈھانچہ اپنے تمام وسائل کے ساتھ پاکستان کے خلاف دہشت گردی کے لیے مسلسلا ستعمال ہو رہا ہے۔ طالبان حکومت نے مسلسل اس الزام کی تردید کی، مگر زمینی حقائق ان دعوؤں کے برعکس ہیں۔

ٹی ٹی پی کے دہشت گرد نہ صرف افغانستان کے مختلف علاقوں میں موجود ہیں بلکہ ان کی تنظیمی سرگرمیاں، تربیتی مراکز اور نقل و حرکت بھی کئی بار رپورٹ ہو چکی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ افغان طالبان اور ٹی ٹی پی کے درمیان صرف نظریاتی قربت ہی نہیں بلکہ شخصی اور تنظیمی تعلقات بھی موجود ہیں۔ دونوں تنظیموں کی جڑیں ایک ہی ماحول سے نکلتی ہیں، دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ عسکری تعاون کیا، اور دونوں کے اہم رہنماؤں کے درمیان پرانے روابط موجود رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان نے بارہا ٹی ٹی پی کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا تو طالبان حکومت یا تو خاموش رہی یا مبہم بیانات دیتی رہی۔ طالبان کے کئی اہم عہدیداروں کے ٹی ٹی پی سے قریبی تعلقات کے حوالے سے بھی مختلف سطحوں پر بات ہوتی رہی ہے۔ طالبان کے اندر موجود مخصوص دھڑے ٹی ٹی پی کو صرف ایک ''پاکستانی مسئلہ'' نہیں بلکہ ایک نظریاتی اتحادی کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ٹی ٹی پی کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کے بجائے اکثر اوقات مذاکرات، نرم رویے یا انکار کی پالیسی اختیار کی گئی۔ یہ طرزِ عمل اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ طالبان حکومت دہشت گردی کے مسئلے پر دوہرا معیار اپنائے ہوئے ہے۔

طالبان رجیم کا سب سے بڑا مسئلہ صرف دہشت گرد گروہوں کی موجودگی نہیں بلکہ مسلسل جھوٹ اور انکار کی

سیاست ہے۔ وہ بار بار دنیا اور خطے کو یقین دہانیاں کراتے ہیں کہ افغانستان کی سرزمین کسی کے خلاف استعمال نہیں ہوگی، مگر دوسری طرف دہشت گرد تنظیمیں کھلے عام موجود ہیں۔ یہی تضاد موجودہ رجیم کی بنیادی شناخت بن چکا ہے۔ اگر واقعی ٹی ٹی پی افغانستان میں موجود نہیں، تو پھر اس کے رہنما، اس کے دہشت گرد اور اس کے نیٹ ورکس بار بار افغان علاقوں سے کیوں منسلک پائے جاتے ہیں؟ اگر القاعدہ کا افغانستان سے کوئی تعلق نہیں، تو پھر اس کے عناصر اور سہولت کار وہاں کیوں سرگرم دکھائی دیتے ہیں؟ یہ صورتحال صرف پاکستان کے لیے خطرہ نہیں بلکہ پورے خطے کے لیے تباہ کن ہے۔ وسطی ایشیا کے ممالک، چین، ایران اور دیگر ہمسایہ ریاستیں بھی اس خدشے کا اظہار کرتی رہی ہیں کہ افغانستان دوبارہ شدت پسند گروہوں کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ افغانستان کی سرزمین سے مختلف ممالک کے خلاف شدت پسند عناصر کی موجودگی علاقائی عدم استحکام کو مزید بڑھا رہی ہے۔

طالبان کی موجودہ حکومت کے بارے میں سب سے بڑا تضاد یہی ہے کہ وہ خود کو ایک "قومی حکومت" کے طور پر پیش کرتی ہے مگر اس کی پالیسیوں کے نتائج پورے خطے میں عدم استحکام کی صورت میں سامنے آ رہے ہیں۔ ایک ایسی حکومت جو اپنی سرزمین پر موجود دہشت گرد گروہوں کے بارے میں مسلسل انکار کرے، ان کے خلاف مؤثر کارروائی نہ کرے، اور ان سے نظریاتی یا عملی قربت رکھے، وہ کیسے ایک ذمہ دار ریاست کہلا سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ طالبان سے وابستہ تین بنیادی توقعات سادہ حکومت، کرپشن سے پاک نظام اور امن تینوں بری طرح ناکام ہو چکی ہیں۔ سادہ حکومت کی جگہ شخصی آمریت اور مفاداتی حلقوں نے لے لی ہے۔ کرپشن کے خلاف دعوے خود کرپٹ سرپرستی کے نظام میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ اور امن کی جگہ افغانستان دوبارہ عالمی دہشت گرد نیٹ ورکس، سرحد پار دہشت گردی اور علاقائی عدم استحکام کے مرکز میں بدلتا جا رہا ہے۔

آج طالبان حکومت نہ صرف اپنے وعدوں سے منحرف ہو چکی ہے بلکہ اس نے افغانستان کو ایک ایسے خطرناک راستے پر ڈال دیا ہے جہاں ریاستی ڈھانچہ، شدت پسند نیٹ ورکس اور علاقائی کشیدگی ایک دوسرے سے جڑتے جا رہے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس نے طالبان کی تمام ابتدائی امیدوں اور دعوؤں کو عملی طور پر بے معنی بنا دیا ہے۔ اگر افغانستان دہشت گردی کا مرکز نہیں، تو پھر پاکستان میں ہونے والے بے شمار حملوں کے تانے بانے بار بار افغان سرزمین سے کیوں جڑتے ہیں؟ اگر طالبان واقعی دہشت گردی کے خلاف

ہیں، تو پھر ٹی ٹی پی کے خلاف مؤثر کارروائی کیوں نہیں کی جاتی؟ حقیقت یہ ہے کہ افغان طالبان اور ٹی ٹی پی کے درمیان تعلقات محض وقتی یا سطحی نوعیت کے نہیں بلکہ ان کی جڑیں مشترکہ نظریاتی، عسکری اور تاریخی پس منظر میں موجود ہیں۔

افغان طالبان کے کئی اہم عہدیداروں کے ٹی ٹی پی سے قریبی تعلقات کے ثبوت موجود ہیں، جنہیں جھٹلایا نہیں جا سکتا، طالبان کے اندر موجود طاقتور عناصر ٹی ٹی پی کو ایک ''برادر جہادی تحریک'' کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یہی نظریاتی قربت اس بات کی بڑی وجہ ہے کہ ٹی ٹی پی کے دہشت گرد افغانستان کے مختلف علاقوں میں نہ صرف موجود ہیں بلکہ انہیں نقل و حرکت، تنظیم نو اور رابطہ کاری کی سہولت بھی حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں دہشت گرد حملوں میں مسلسل اضافہ دیکھا گیا۔

طالبان حکومت کی سب سے بڑی ناکامی یہی ہے کہ اس نے افغانستان کو ایک بار پھر جہاد کے مقدس نام کو دہشت گردی کے لئے استعمال کرنے والے نیٹ ورکس کے لیے نرم ریاست میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ وہی ماڈل ہے جس نے ماضی میں افغانستان کو عالمی تنہائی، جنگ اور تباہی کی طرف دھکیلا تھا۔ مگر موجودہ طالبان قیادت اس تاریخی حقیقت سے سبق سیکھنے کے بجائے ایک مرتبہ پھر انہی نیٹ ورکس کے ساتھ پیچیدہ تعلقات برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ٹی ٹی پی کے حوالے سے طالبان کا طرزِ عمل محض سفارتی تضاد نہیں بلکہ ایک بڑی سلامتی کی پالیسی کا بحران ہے۔

اس پوری بحث، تجزیے اور شواہد کا سب سے بڑا نتیجہ یہی ہے کہ آج کے طالبان وہ طالبان نہیں رہے جو کبھی اپنے آپ کو ایک نظریاتی، مذہبی اور اصلاحی تحریک کے طور پر پیش کرتے تھے۔ وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ اقتدار میں آنے کے بعد اس تحریک نے نہ صرف اپنی بنیادی شناخت کھو دی بلکہ اپنی وہ تمام اخلاقی، دینی اور سیاسی بنیادیں بھی ترک کر دیں جنہیں کبھی اپنی مقبولیت کا ذریعہ بنایا جاتا تھا۔ آج طالبان ایک ایسی قوت میں تبدیل ہو چکے ہیں جو نہ شریعت کی حقیقی نمائندہ ہے، نہ افغان عوام کی، نہ پشتون روایات کی، اور نہ ہی کسی ذمہ دار ریاستی نظم کی۔

طالبان نے خود کو ہمیشہ ''فساد کے خاتمے'' اور ''اسلامی نظام'' کے نعرے کے ساتھ پیش کیا، مگر اقتدار ملنے کے بعد وہ خود پورے خطے کے لیے عدم استحکام، خوف، دہشت گردی، دھوکہ دہی اور بحران کا مرکز بنتے چلے گئے۔ انہوں نے افغانستان کو امن دینے کے بجائے اسے عالمی دہشت گرد نیٹ ورکس، شخصی آمریت،

نسلی تعصب، کرپشن اور خون ریزی کے ایک ایسے جال میں دھکیل دیا، بڑا المیہ یہ ہے کہ طالبان صرف دوسروں کے لیے خطرہ نہیں بنے بلکہ وہ اپنی ہی بنیادوں کو کھا گئے۔ انہوں نے شورائیت کو ختم کر دیا، شریعت کو شخصی اقتدار کے آلے میں بدل دیا، دیانت داری کو مفاداتی وفاداری میں تبدیل کر دیا، اور جہاد کے بیانیے کو اقتدار کی ہوس کے تابع کر دیا۔ آج ان کے نظام میں اصول نہیں بلکہ اندھی اطاعت ہے، انصاف نہیں بلکہ خوف ہے، دیانت نہیں بلکہ لوٹ مار ہے، اور دین نہیں بلکہ طاقت کی سیاست ہے۔

آج کے طالبان کے نظام میں اختلافِ رائے جرم ہے، سوال اٹھانا بغاوت ہے، اور ہر وہ شخص مشکوک ہے جو شخصی اطاعت کے دائرے سے باہر سوچنے کی کوشش کرے۔ یہی ہر استبدادی نظام کی آخری شکل ہوتی ہے: جہاں تحریکیں نظریات سے خالی ہو کر صرف اقتدار کے تحفظ کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ طالبان نے اپنے طرزِ عمل سے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ وہ ناقابلِ اصلاح ہو چکے ہیں۔ ایک طرف شریعت کا دعویٰ کیا اور دوسری طرف شخصی تسلط کو قانون بنا دیا۔ ایک طرف قومی خودمختاری کی بات کی اور دوسری طرف بھارتی را کو آقا مان لیا اور زلمے خلیل زاد کی غلامی قبول کر لی۔

سچ یہ ہے کہ آج طالبان کا اصل چہرہ مکمل طور پر بے نقاب ہو چکا ہے۔ یہ اب کوئی سادہ مذہبی تحریک نہیں بلکہ ایک ایسا طاقتور جتھہ بن چکا ہے جس کی بنیاد خوف، طاقت، مفاد، کرپشن، جھوٹ اور تشدد پر کھڑی ہے۔ ان کی سیاست کا مرکز عوام نہیں بلکہ اقتدار ہے، ان کی ترجیح شریعت نہیں بلکہ کنٹرول ہے، اور ان کی اصل فکر افغانستان نہیں بلکہ اپنی حکمرانی کا دوام ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ طالبان نے افغانستان کو صرف داخلی بحران میں مبتلا نہیں کیا بلکہ پورے خطے کو عدم استحکام کے خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔

سرحدی کشیدگی، دہشت گردی، عالمی شدت پسند نیٹ ورکس کی موجودگی، علاقائی بداعتمادی اور انسانی بحران سب اسی طرزِ حکمرانی کے نتائج ہیں۔ افغانستان، جو ایک مستحکم اور متوازن ریاست بن سکتا تھا، آج ایک ایسی بند گلی میں کھڑا ہے جہاں ایک شخص کی ہوسِ اقتدار نے پورے معاشرے کو یرغمال بنا رکھا ہے۔

شاید طالبان کی سب سے بڑی شکست یہی ہے کہ انہوں نے خود اپنی اخلاقی بنیادیں تباہ کر دیں، اپنے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ اسی لیے آج طالبان کو صرف ایک سیاسی یا عسکری مسئلے کے طور پر نہیں بلکہ ایک ایسے بحران کے طور پر سمجھنا ضروری ہے جو مذہب، طاقت، دہشت گردی، شخصی آمریت اور علاقائی عدم استحکام کے امتزاج سے پیدا ہوا۔ جب تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا جائے گا، افغانستان اور خطہ مسلسل عدم تحفظ،

کشیدگی اور بحران کی کیفیت میں رہے گا۔ تاریخ کا سبق ہمیشہ یہی رہا ہے کہ جو تحریکیں اقتدار کو اصولوں پر فوقیت دیتی ہیں، وہ آخر کار اپنے ہی نعروں کی نفی بن جاتی ہیں۔ طالبان بھی اب اسی انجام کی علامت بنتے جا رہے ہیں۔ وہ تحریک جو کبھی خود کو "اصلاح" کا استعارہ کہتی تھی، آج خود فساد، جبر، کرپشن، دھوکہ دہی اور دہشت گردی کے نئے چہرے کے طور پر سامنے آ چکی ہے۔ یہی ان کا اصل چہرہ ہے، اور شاید یہی اس پورے المیے کی سب سے تلخ حقیقت بھی۔

---

# دوچار برس کی بات نہیں !



3 ستمبر 1994 ۔ کابل کے صدارتی محل (ارگ) میں اس وقت کے صدر برہان الدین ربانی کے ہمراہ




3 ستمبر 2023 ۔ قول اردو مرکزی یعنی آرمی ہیڈ کوارٹرز کابل